ڈاکٹر وحید قریشی کی علمی و تحقیقی خدمات

مقالہ نگار

روبینہ ناز

یہ مقالہ

پی ایچ۔ ڈی (اُردو)

کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے لیے پیش کیا گیا

فیکلٹی آف ایڈوانس انٹگریٹڈ سٹڈیز اینڈ ریسرچ

(اُردو زبان و ادب)

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

مئی ۲۰۰۷ء

ڈاکٹر وحید قریشی کی علمی و تحقیقی خدمات

روبینہ ناز

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز کی پی ایچ ڈی (اُردو) کی ڈگری کے حصول
کے لئے یہ مقالہ پیش کیا جاتا ہے۔ (اے آئی ایس اینڈ آر۔ اُردو)

منظور کیا گیا

ڈاکٹر شندرہ منور
(ڈین فیکلٹی آف ایڈوانس انٹگریٹڈ سٹڈیز اینڈ ریسرچ)

بریگیڈیئر (ر) ڈاکٹر عزیز احمد خان
(ریکٹر)

اقرار نامہ

میں، روبینہ ناز حلفیہ بیان کرتی ہوں کہ اس مقالے میں پیش کیا گیا کام میرا ذاتی ہے اور نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز اسلام آباد کے پی ایچ ڈی سکالر کی حیثیت سے ڈاکٹر گوہر نوشاہی کی نگرانی میں کیا گیا ہے۔ میں نے یہ کام کسی اور یونیورسٹی یا ادارے میں ڈگری کے حصول کے لئے پیش نہیں کیا ہے اور نہ آئندہ کروں گی۔

روبینہ ناز

مقالہ نگار

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

مئی، ۲۰۰۷ء

فہرست ابواب

عنوان		صفحہ نمبر
مقالہ اور دفاعِ مقالہ کی منظوری کا فارم		ii
فہرست ابواب		iv
مقالے کا دائرہ کار		vi
Abstract		vii
مقالے کا مقصد		viii
اظہارِ تشکر		ix
باب اوّل:	اُردو تحقیق کی روایت اور دبستانِ لاہور	1
باب دوم:	ڈاکٹر وحید قریشی اور اُن کا خاندان	17
باب سوم:	ڈاکٹر وحید قریشی بحیثیت محقق	29

باب چہارم:	ڈاکٹر وحید قریشی بحیثیت غالب شناس	96
باب پنجم:	ڈاکٹر وحید قریشی بحیثیت نقاد	126
باب ششم:	ڈاکٹر وحید قریشی اور نظریہ پاکستان	190
باب ہفتم:	ڈاکٹر وحید قریشی بحیثیت اقبال شناس	229
باب ہشتم:	ڈاکٹر وحید قریشی بحیثیت شاعر	266
باب نہم:	مجموعی جائزہ	336
	ڈاکٹر وحید قریشی کے ساتھ ایک نشست	347
	تجاویز اور سفارشات	354
کتابیات:		356

مقالے کا دائرہ کار

یہ مقالہ آٹھ ابواب پر مشتمل ہے جن میں ڈاکٹر وحید قریشی کی مختلف علمی و ادبی حیثیات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان کا تحقیقی وعلمی مرتبہ متعین کرنے میں ان کی اپنی تصنیفات اور تحقیقات کو شامل کیا گیا ہے۔ اس مقالے کا آغاز دبستانِ لاہور کی علمی روایات سے ہوتا ہے اور ڈاکٹر صاحب کے احوال و آثار کو قلمبند کرتے ہوئے ان کے علمی اور خاندانی پسِ منظر پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان کی تنقید، شاعری، تحقیق، پاکستانی تہذیب و معاشرت کے متعلق افکار، غالب شناسی، اقبال شناسی اور نفسیاتی اسلوبِ تحقیق و تنقید کو بطورِ خاص موضوع بنایا گیا ہے۔ ان کی تحقیقی انفرادیت اور اسلوب کی عظمت کو اجاگر کرتے ہوئے ان کے فن کے مختلف گوشوں پر بحث کی گئی ہے۔

ABSTRACT

Topic: **The Literary and Research Contribution of Dr. Waheed Qureshi.**

The specific aim of this Ph.D thesis is to offer a "school-eye-view" of authentic assessment to the "Literary and Research Contribution of Dr. Waheed Qureshi", as well as assessment strategies that together support high levels of accomplishment on challenging tasks to the Urdu and Persian literature. The cumulative body of this research that is capable of informing interventions. This thesis more then 80 books besides research papers were reviewed, which includes poetry, prose, critical writing, Pakistani socio-cultural beliefs and values, Ghalib, Iqbaliyat, psychological aspects of research and criticism. Theses explore and include a review of the literature on ethnicity and present a critical analysis of literary and research work. Factors affecting the rate and quality of research and interventions are also discussed. Literary and Research work on Urdu Literature has long been concerned with strengthening, but the extent of Dr. Waheed Qureshi research is capable of informing and guiding practice. The thesis divided into eight chapters and concludes with a presentation of the procedure by which research can be linked to the work of the practitioner. Bibliographies are included at the end of each Chapter.

مقالے کا مقصد

ڈاکٹر وحید قریشی اُردو تحقیق کا ایک اہم ترین نام ہیں۔ برصغیر پاک و ہند میں ہر سطح پر ان کی خدمات کا اعتراف کیا گیا ہے۔ ان کے علم و فضل اور محققانہ صلاحیتوں کا شہرہ دُنیا کے ہر اس ملک میں پہنچا ہوا ہے جہاں مشرقی علوم پر تحقیق و تدریس جاری ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی کے تحقیقی و تنقیدی کام کی وسعت اُردو کے ہر بلند پایہ محقق کے برابر ہے۔ اکیسویں صدی کا ادبی منظر نامہ ڈاکٹر وحید قریشی کی تحقیقی خدمات کے ذکر کے بغیر نامکمل ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی عمر اس وقت ۸۰ سال کے لگ بھگ ہے۔ وہ اپنی ذات میں خود تحقیق کا ایک دبستان ہیں۔ جس کے اثرات پوری دُنیائے اُردو میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ ڈاکٹر وحید قریشی کی تحقیقی وتنقیدی خدمات پر ابھی کوئی شایانِ شان کام وجود میں نہیں آیا۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ تحقیق کی اِس زندہ اور روشن مثال پر پی ایچ ڈی کی سطح پر تحقیق کی جائے۔ میرا مقالہ اِس سلسلے میں پہلا ٹھوس اور ہمہ جہت کام ہو گا۔ اِس مقالہ کی تحریر اور تکمیل سے NUML میں تحقیقی سرگرمیوں کو وقار حاصل ہو گا۔

میرے اِس مقالے کا مقصد اُردو تحقیق کا دائرہ عمل وسیع کرنا اور ڈاکٹر وحید قریشی کے علمی کارناموں کو تاریخ ادب میں جگہ دینے کی ایک کوشش کرنا ہے۔ اِس مقالے کا ایک اہم مقصد آئندہ تحقیق اور تاریخِ ادب پر کام کرنے والوں کے لئے راہیں ہموار کرنا ہے۔ اِس مقالے کی افادیت کا اندازہ یوں لگایا جاسکتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی تمام تصانیف و تالیفات کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ اِس سے قبل ان کی جن علمی حیثیات کو موضوع بنایا گیا وہ محدود اور ناکافی تھیں۔

اظہارِ تشکر

عظیم شخصیات کی علمی خدمات کے سمندر کو کوزے میں بند کرنے کے لئے حوصلہ اور جگر کاوی شرط ہے لیکن ڈاکٹر وحید قریشی کی عظمتوں کے درخشاں آسمان کا احاطہ کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ ناسازئ طبع کے باوجود ڈاکٹر صاحب کی علمی رہنمائی اور تعاون ان کی وسعت قلبی کا غماز ہے۔ ان کے اہلِ خانہ نے بھی مجھے اپنائیت اور پیار دیا۔ ڈاکٹر صاحب کے کتب خانے کی مدد شاملِ حال نہ ہوتی تو شاید اس عظیم علمی و تحقیقی منصوبے کو عملی شکل دینا میرے لئے ممکن نہ ہوتا۔

ڈاکٹر گوہر نوشاہی جو میرے نگران مقالہ ہیں۔ ان کی بے حد احسان مند ہوں کہ انہوں نے ڈاکٹر وحید قریشی اور اپنے تعلق کی روایت کو بدرجۂ غایت نبھاتے ہوئے میری فکرِ تاریک کو روشن چراغ عنایت فرمائے۔ انہوں نے تحقیق کے اصولوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ہر ہر سطر پر میری رہنمائی کی۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی اُردو اور فارسی زبانوں پر عبور رکھتے ہیں۔ تحقیق میں تدوینِ متن ان کا اصل میدان ہے۔ ان کا علم تاریخ اور مطالعہ ادب بھی وسیع ہے۔ ان کی تحقیق میں جو عرق ریزی ہے اسی کی روشنی میں انہوں نے نہایت مشفقانہ اور عالمانہ انداز میں میرے مقالے کی تکمیل میں میری رہنمائی کی ہے۔

میرے اساتذہ ڈاکٹر رشید امجد، ڈاکٹر آفتاب احمد اور ڈاکٹر نوازش علی نے میری رہنمائی کی۔ ان سب کی میں بے حد شکر گزار ہوں۔ دیگر اداروں میں میں مقتدرہ قومی زبان، نیشنل لائبریری، اکادمی ادبیات اسلام آباد کے منتظمین کی بھی سپاس گزار ہوں جنہوں نے مجھے اپنے کتب خانوں سے مستفید ہونے اور مقالے کی ترتیب، تحقیق میں میری معاونت فرمائی۔ علاوہ ازیں میں بطور خاص ڈاکٹر فتح محمد ملک، ڈاکٹر نثار قریشی مرحوم، ڈاکٹر احسان اکبر، جناب افتخار عارف کی ممنون ہوں، جن کی معاونت، رہنمائی اور حوصلہ افزائی کی بدولت اس مقالے کی تکمیل میرے لئے ممکن ہو سکی۔

باب اوّل

اُردو تحقیق کی روایت اور دبستانِ لاہور

تحقیق کیا ہے؟

تحقیق صداقت کی تلاش کا عمل ہے اِنسان کے اندر فطری طور پر جستجو کا مادہ ہے۔ یہی اشتیاق اسے نامعلوم منزلوں کی جانب رواں دواں رکھتا ہے اور وہ معلوم حقائق کی توسیع میں مصروف رہتا ہے۔ لیکن اس چھان بین میں کھرے کھوٹے کی پہچان اسی وقت ممکن ہے جب نگاہِ دروں بیں ہمراہ ہو۔ یہ دریافت اور بازیافت کا عمل تو ہے ہی اس کے ساتھ ساتھ انکشاف کا سائنسی اندازِ نظر بھی ہے۔ گویا تحقیق ادبی سطح پر آ کر ایک مخصوص مزاج کا روپ دھار لیتا ہے۔

بنیادی طور پر تحقیق عربی زبان کا لفظ ہے جس سے مراد حق کو ثابت کرنا ہیں۔ یہاں حق سے مراد سچائی ہے۔ تحقیق مختلف واقعات کو ان کی اصل شکل میں دیکھنے اور پیش کرنے کے رویئے کو ظاہر کرتی ہے۔ یہ تفتیش بھی ہے جو کذب و سچائی میں فرق کر کے ابہام دور کر دیتی ہے۔ پوشیدہ اسرار کا کھوج لگا کر انہیں سیدھے سادے انداز میں پیش رتی ہے اور الجھنوں کو سلجھاتی ہے۔ تحقیق بنیادی حقائق کا تعین کرتے ہوئے ایسے نتائج کا استخراج کرتی ہے جو بامعنی ہوتے ہیں اور جن کی مدد سے ایک خاص نتیجے تک پہنچا جاسکتا ہے۔ تحقیق میں کسی مبالغہ آرائی کی گنجائش نہیں۔ وہ یہ مقرر سائنسی انداز کو ہمراہ رکھتے ہوئے معلوم حقائق کی مدد سے نئے مؤقف قائم کرتی ہے۔

ڈاکٹر گیان چند اپنی کتاب "تحقیق کا فن" کے صفحہ نمبر ۱۲ پر ڈاکٹر تلک چند کی رائے پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "تحقیق علم کا وہ شعبہ ہے جس میں منظم لائحہ عمل کے تحت سائنسی اسلوب میں نامعلوم و ناموجود حقائق کی کھوج اور معلوم و موجود حقائق کی نئی تشریح اس طرح کرتے ہیں کہ علم کے علاقے کی توسیع ہوتی ہے۔"

گویا باضابطہ طریقے سے ایک پوشیدہ حقیقت کو ظاہر کرنے کا نام تحقیق ہے۔ جس کا مقصود حق کا اثبات ہے۔

تحقیق عربی زبان کا لفظ ہے جس کے لغوی معنی اصلیت معلوم کرنا، درستی، تفتیش، سچائی کے تعین اور تصدیق کے ہیں۔ آکسفورڈ ڈکشنری میں بار بار تلاش کو تحقیق کہا گیا ہے۔ اس طرح تحقیق کے دو مفاہیم بنتے ہیں۔ نا معلوم حقائق کی تلاش اور معلوم حقائق کی توسیع یا تصحیح۔ تحقیق ایک ایسی کوشش کا نام ہے جو علم کی پہلے تلاش، پھر تصدیق اور پھر تشہیر کرتی ہے۔ تحقیق کا مطلب نہ صرف گہرا مشاہدہ ہے بلکہ اس مشاہدے کی جزئیات کو معلوم کرنا بھی ہے تحقیق صداقت کی تلاش کا عمل ہے۔ اس عمل کا تقاضا یہ ہے کہ محقق میں تنقیدی شعور اور فکری عمق پایا جائے۔ حقائق کے تعین اور ان سے نتائج کے استخراج کے لیے محققانہ مزاج کی ضرورت ہے۔ فن تحقیق بنیادی ماخذات کی دریافت اور ان کی تصحیح و تدوین کے بغیر نامکمل ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان اپنے مضمون ''تحقیق کے بنیادی لوازم'' میں لکھتے ہیں:

> ''ادبی تحقیق میں وہی افراد زیادہ تر کامیاب رہے ہیں۔ جنھیں زیر تحقیق عہد کی تاریخ کے اہم اور مستند اور بنیادی ماخذ تک رسائی حاصل تھی۔۔۔اُردو زبان و ادب کی تحقیق کے لیے تاریخ کا مطالعہ ضروری ہوا اور چونکہ اس کے بنیادی ماخذ بہت کچھ فارسی میں ہیں تو فارسی کا جاننا بھی لازم آیا۔ اسی طرح انگریزی مصادر تک رسائی کے اپنے فوائد ہیں۔''[۱]

تحقیق کے کئی مقاصد ہوتے ہیں مثلاً نظریے کی نشوونما اور ارتقاء، حقائق کی جمع آوری اور عملی تحقیق وغیرہ۔ تحقیق کی مختلف اقسام ہیں۔ مثلاً تاریخی، بیانیہ، تجرباتی اور موضوعاتی و ادبی تحقیق۔ ان میں قدرِ مشترک تلاش سے حاصل شدہ حقائق کی چھان بین کرتے ہوئے انہیں درست قبول کرنا یا تردید کرتے ہوئے غلط قرار دینا ہے۔

اُردو ادب میں تحقیق کی روایات بہت قدیم نہ سہی، ان روایات میں وسعت اور سنجیدگی ضرور موجود ہے۔ پہلی جنگ عظیم کے اختتام کے بعد جب ترکِ موالات اور خلافت کی تحریکیں اُٹھ رہی تھیں، اُردو ادب میں تنقید کے مقابلے میں تحقیق کا رجحان ترقی کر گیا۔ لیکن اگر اس سے بھی پہلے اُردو ادب کے تحقیقی سرمائے پر نظر ڈالی جائے تو اندازا ہوتا ہے کہ اُردو ادب میں تحقیقی روایت کا آغاز تذکروں سے ہو چکا تھا۔

خانِ آرزو کی تحقیق کا میدان لغات تھا۔ انہوں نے لسانی تحقیق کی روایت قائم کی۔ تذکرہ نگاری کے دور کا آغاز کچھ یوں ہوا کہ ابتدا میں اُردو شعرأ کے تذکرے فارسی زبان میں لکھے گئے۔ پہلا تذکرہ میر تقی میر کا نکات الشعرأ تھا۔ فارسی روایت کی اُردو میں منتقلی ہوئی اور اس کے بعد پہلا مفصل اردو تذکرہ خوش معرکۂ زیبا از سعادت خان تھا۔ لکھنؤ سے متعلق یہ تذکرہ ۱۸۴۶ء میں تصنیف ہوا۔ اس کے علاوہ اہم اُردو تذکروں میں ''گلستانِ سخن'' از قادر بخش صابر ۱۸۵۵ء، سخن شعرأ از نساخ ۶۴-۱۸۶۳ء، انتخاب یادگار امیر مینائی ۱۸۷۳ء اور آب حیات از محمد حسین آزاد ۱۸۸۰ء قابلِ ذکر ہیں یہ سب مصنفین محقق بھی تھے۔ معلومات جمع کرنے میں اکثر کے ہاں تحقیقی رجحان موجود تھا۔ مثلاً قریبی دوستوں کے بارے میں ان کی ولادت اور وفات کی تاریخ اور سنین اخذ کرنے میں انہوں نے جس کاوش سے کام لیا ہے۔ وہ ان کے محققانہ مزاج کا آئینہ دار ہے۔ یہ تذکرے جدید تحقیق کی بنیاد ہیں۔ دنیا کی دیگر زبانوں کی طرح اُردو زبان و ادب کا آغاز بھی چار مراحل طے کر کے ہوتا ہے۔ مثلاً لسانی تشکیل کا عمل، تخلیق کا مرحلہ، تنقیدی مزاج اور رویوں کی تشکیل اور پھر تحقیق گویا گذشتہ روایات کے مقام و مرتبے کا جائزہ لینا۔ تحقیق میں زبان، شعر و ادب، تنقید کے جملہ احوال و کوائف کی کھوج اور باز یافت کا عمل شامل ہے۔ زمانی اعتبار سے اُردو تحقیق بہت قدیم دور سے تعلق نہیں رکھتی۔ اُردو میں تحقیق کا سراغ تذکرہ نویسی سے ملتا ہے۔ جو بنیادی طور پر غیر تحقیقی رویہ کہلایا جا سکتا ہے اور اس کا مقصد شعراور ادب کے مکمل نام اور نمونۂ کلام کو جمع کرنا تھا۔ لیکن اس عمل نے اُردو ادب میں تحقیق کی بنیاد رکھ دی۔ مثال کے طور پر ۱۷۵۲ء میں میر تقی میر کا ''تذکرہ نکات الشعراء'' سامنے آیا۔ جو تذکرہ اور تحقیق کی ملی جلی شکل ہے۔ اس کے علاوہ ''گلشنِ گفتار'' خواجہ خان حمید اورنگ آبادی اور ''تحفۃ الشعرأ'' اور افضل بیگ قاقشال سامنے آئے۔ اس روایت نے آگے چل کر مزید ترقی کی اور ۱۷۵۵ء میں ''مخزن نکات'' (قائم) اور ''تذکرہ ریختہ گویاں'' خان حسینی گردیزی مرتب ہوئے۔

تذکرہ نویسی کا یہ سلسلہ بدستور چلتا رہا اور اس میں ارتقاء کی نمایاں رفتار بھی محسوس کی جانے لگی۔ مثلاً شعرأ کے مکمل نام اور نمونۂ کلام کی جمع بندی کے ساتھ ساتھ شعرا کی ذاتی زندگی اور عصری صورتحال کے علاوہ دیگر واقعات اور حالات کی تفصیل بھی پیش کی جانے لگی اور یوں یہ تذکرے آج آلاتِ تحقیق بن کر محققین کو چراغِ راہ کا کام دیتے ہیں۔

محمد حسین آزاد کی 'آبِ حیات' میں پہلی بار شعوری طور پر تذکرہ نویسی اور تحقیقی شعور کو مدغم کیا گیا اور کسی حد تک محققانہ اصولوں کو اپنایا گیا لیکن یہ بھی تنقید اور تحقیق کے درمیان کی منزل تھی اور دونوں کے فاصلوں کو کم کرتی نظر آتی تھی۔ البتہ محمد حسین آزاد وہ پہلے نقاد ہیں جنھوں نے شعراً اور ادباً کے حالات ممکنہ حد تک تفصیل سے بیان کرنے کی کوشش کی۔ تاریخی مقامات کو وہ احتیاط کے ساتھ چھان بین کر کے پیش نہ کر سکے۔ البتہ تحقیق اور تنقید دونوں کو ایک ساتھ لے کر چلنا انہوں نے ہی نے شروع کیا اور یہی وہ انداز ہے جس سے اردو تحقیق کا پایہ بلند ہو سکتا ہے۔

تذکروں کے علاوہ لغات میں بھی محققانہ شعور کی ابتدائی تگ و دو نظر آتی ہے۔ مثلاً سراج الدین علی خان آرزو کی ''نوادر الالفاظ'' یہ اُردو کی ابتدائی لغت ہے۔

خان آرزو نے عبد الواسع ہانسوی کی ''غرائب اللغات'' کی اغلاط کی نشاندہی کرتے ہوئے اس کی تصحیح کی اور اس طرح تحقیق کی تاریخ چند قدم اور آگے بڑھی۔ لغات اور تذکروں کے علاوہ دواوین کی تدوین اور نثری تصانیف کی تدوین بھی تحقیق میں شامل ہے۔ جیسے کلیاتِ قطب شاہ، علی نامہ، چندر بدن مہیار، مثنوی گلشنِ عشق، سب رس اور ابراہیم نامہ۔ جدید تحقیق کی ابتدائی روایات میں وہ مقالات بھی شامل ہیں۔ جو مختلف موضوعات پر قلمبند کیے گئے جیسے تنقید شعر العجم از حافظ محمود شیرانی اس میں وہ مطالعے بھی شامل ہیں۔ جو کسی شاعر کی سوانح سے تعلق رکھتے ہیں۔ جیسے نصرتی از مولوی عبد الحق یا سوداؔ از شیخ چاند اس میں ایسے مقالات بھی شامل ہیں جو کسی ایک موضوع کا احاطہ کرتے ہیں۔ جیسے ''اردو کی نشوونما میں صوفیائے کرام کا حصہ''۔ خالقِ باری' مرتبہ شیرانی یا قتل خالقِ باری، مرتبہ افسر امرہوی اسی طرح مختلف علاقوں میں اردو کی ترویج و اشاعت اور نشوونما کے مطالعے بھی اسی ذیل میں آتے ہیں۔ جیسے پنجاب میں اُردو زبان و ادب کا ارتقأ، کشمیر میں اُردو، ریاست میسور میں اردو زبان و ادب کی ترویج بھوپال کا حصہ وغیرہ۔ اسی طرح وہ وضاحتی فہرستیں بھی تحقیق کی ذیل میں آتی ہیں۔ جو وقتاً فوقتاً شائع ہوئیں۔ جیسے کتب خانہ خاص، انجمن ترقی اردو پاکستان کی وضاحتی فہرستیں یا پانچ جلدوں میں ادارہ ادبیات اردو کے مخطوطات کی وضاحتی فہرستیں مرتبہ ڈاکٹر زور، یا مشفق خواجہ کی تحقیقی تالیف کا جائزہ۔ مخطوطاتِ اُردو، جلد اوّل یا نثری متون میں رشید حسن خان کا کام جو انہوں نے فسانۂ عجائب اور باغ و بہار کو مرتب کر کے انجام دیا۔ اس کے علاوہ وہ تذکرے بھی قابل ذکر ہیں۔ جو تحقیق و تدوین کے بعد شائع کیے گئے

اور جن میں مجموعہ نغز مرتبہ شیرانی اور دستور الفصاحت مرتبہ عرشی کے علاوہ عمدہ منتخبہ مخزنِ نکات، نکات الشعرأ اور خوش معرکۂ زیبا شامل ہیں۔ موضوع کے اعتبار سے ایسے تحقیقی کام بھی منظرِ عام پر آگئے ہیں جن میں محققین نے تقابلی رجحان کا انداز اختیار کیا ہے۔ مثلاً پروفیسر غلام مصطفٰی خان کی تحقیق ''فارسی کا اردو پر اثر'' یا 'ثقافتی اردو' وغیرہ۔ بعض محققین نے کسی دوسرے محقق کے کام کا محاسبہ کیا ہے اس نوعیت کی تحقیقی تصنیفات میں حافظ محمود شیرانی اور قاضی عبد الودود کے کام نمایاں ہیں۔

لیکن اردو تحقیق کے پس منظر میں جن اکابر ہستیوں کے نام نمایاں ترین ہیں ان میں آغاز سر سید احمد خان سے کیا جا سکتا ہے۔ سر سید میں تحقیقی بصیرت موجود تھی۔ انہوں نے 'آثار الصنادید' کی دو جلدیں شائع کرائیں۔ وہ اس کی پہلی جلد کی اشاعت کے وقت سے ہی ایک اچھے محقق کی خوبیوں سے آراستہ تھے اور کوئی بات کرتے وقت حقائق سے منہ نہیں موڑتے تھے۔ آثار الصنادید کی دوسری اشاعت میں انہوں نے مغربی آداب تحقیق کا خیال رکھا اور جامع ومختصر اسلوبِ بیان اپنایا۔ اس کے علاوہ ان کی مدون کردہ کتب میں 'آئین اکبری' تزک جہانگیری اور تاریخ ہندوستان شامل ہیں۔ اس میں انہوں نے متنی تدوین کے جدید اصولوں کو اپنا کر ایک نئی روش کی بنیاد رکھی۔ گویا جدید اُردو تحقیق کا آغاز سر سید احمد خان سے ہوا۔ ان کے علاوہ ان کے معاصرین میں محمد حسین آزاد اور علامہ شبلی نعمانی نقاد اور محقق تھے۔ حالؔی بھی میانہ روی کے ساتھ تحقیق کی دشوار گزار راہوں پر چل رہے تھے۔ حالی نے سوانح نگاری کے میدان میں محققانہ کاوشوں کو جاری رکھا۔ ان کی لکھی ہوئی تین سوانح عمریوں 'حیات سعدی' یادگار غالبؔ اور حیات جاوید میں تحقیق کے اوّلین رجحانات کو دیکھا جا سکتا ہے۔ لیکن حالؔی کی طبیعت کو تحقیق جیسے میدان سے کوئی مناسبت نہ تھی وہ صلح جو اور مفاہمت پسند انسان تھے۔ اگر ایک طرف تحقیق کے میدان میں مولانا حالی نے سوانح عمریوں کا راستہ اپنایا تو دوسری طرف مولانا شبلی نے تاریخ کا میدان منتخب کر لیا۔ ''شعر العجم'' میں فارسی شعرأ کا دلچسپ تذکرہ پیش کیا گیا۔ اس کے علاوہ انہوں نے سوانح عمریاں بھی لکھیں۔ جن میں 'المامون' 'سیرت النعمان' ''الفاروق'' ''الغزالی'' سوانح مولانا روم اور ''سیرۃ النبیؐ'' شامل ہیں۔ ان سوانح عمریوں میں شبلی نے جس دیدہ ریزی سے تحقیق کے اصولوں کو برتا وہ انہی کا خاصہ ہے۔ ان مفصل تخلیقات کے علاوہ علامہ شبلی نعمانی نے کچھ تحقیقی مضامین بھی لکھے۔ ان مضامین میں انہوں نے انشاء پردازی کی بہترین مثالیں پیش کیں۔ ان میں ''مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم، ''الجزیہ'' ''اسلامی کتب

خانے'' اور اسلامی حکومتیں اور ''شفا خانے'' قابلِ ذکر ہیں۔ شبلی نے پہلی بار تحقیق کے اصولوں کو خوش اسلوبی سے اپنایا اور ان کو اپنی تحقیق میں استعمال بھی کیا۔ لیکن کہیں کہیں ان کے لہجے میں خطابیہ انداز اور عقیدت کا پہلو آ جاتا ہے جو تحقیق کے مزاج سے میل نہیں کھاتا۔ لیکن پھر بھی انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں تدوین و تحقیق کے حوالے سے شبلی، حالی اور آزاد کے نام معتبر روایات کے امین ٹھہرتے ہیں۔ ان کے بعد مولوی عبد الحق کا نام آتا ہے۔ جنہوں نے خود تو انتہائی مصروف اور ہنگامہ خیز زندگی گزاری اور تحقیق کے میدان میں قدم نہ روک سکے لیکن انہوں نے اُردو تحقیق کے بڑے بڑے اور معرکۂ آرا محققین سے کام کروایا۔ مثلاً حافظ محمود خان شیرانی، ڈاکٹر عبد الستار صدیقی، اور مولوی وحید الدین سلیم وغیرہ۔ انہوں نے تحقیق و تدوین دونوں کی طرف توجہ دی اور اہم تذکروں اور قدیم مثنویوں کو شائع کیا۔

شبلی نے سیرت النبیؐ (۱۹۱۴ء) میں بہترین تحقیقی شعور کا مظاہرہ کیا۔ ایک تو یہ کتاب روایت اور درایت کے عمل کو بخوبی برتتی ہے۔ پھر جس ہستی پر لکھی گئی وہ ایسی تھی کہ جس کی شان میں کسی قسم کی کوتاہی، کمزوری یا تحقیقی شعور کی کمی گوارا نہیں کی جا سکتی تھی۔ انہوں نے ماخذ اور منابع پر جرح کی۔ بنیادی اور ثانوی ماخذ کے استعمال کے انداز اور طریقوں کو درست طریقے پر استعمال کیا۔ ان کی کتابیں شعر العجم المامون، الفاروق بھی ان کے تاریخی و تحقیقی شعور کی عمدہ مثالیں ہیں۔ شبلی کی اس روایت کو ان کے شاگردوں مولانا عبد السلام ندوی، اور سید سلیمان ندوی نے برقرار رکھا۔

اُردو میں ادبی تحقیق کی اعلیٰ مثال حالؔی کے تحقیقی کارنامے ہیں۔ حیاتِ سعدی، ۱۸۸۲ء ''یادگارِ غالبؔ'' ۱۸۹۷ء اور حیاتِ جاوید، ۱۹۰۱ء یہ تینوں سوانح عمریاں ادبی حیثیت کو اُجاگر کرتی ہیں۔ تحقیقی اور سوانحی تفصیلات ان ہی کی ذیل میں آتی ہیں۔ واقعات نگاری سے زیادہ شاعری اور انشا پردازی کی خوبیاں ایک سیاسی اور سماجی کارنامہ ہیں اور اس کمی کو پورا کرنے کا سہرا شبلی کے سر ہے۔

مندرجہ بالا تمام کارناموں نے اُردو تحقیق کے راستوں کو کشادگی بخشی۔ تحقیق تاریخی نوعیت کا عمل ہے۔ اس کے ساتھ تنقیدی شعور بھی ہونا ضروری ہے۔ تنقید کے مزاج میں وضاحت ہوتی ہے۔ جو تحقیق کے ساتھ مل کر اسے وقعت اور گہرائی عطا کرتی ہے۔ جدید تحقیق میں تدوین کا عمل خاص اہمیت رکھتا ہے۔ ایک اچھا اور نکتہ شناس محقق ہی علمی و ادبی رائے دینے کا اہل ہو سکتا ہے اور بہترین انداز پر تدوین کر سکتا ہے۔ ادبی معاملات و موضوعات پر

جو تنقید ہوتی ہے اس کے پسِ پشت اگر تحقیق کی بنیاد موجود ہو تو تنقید کی ایک عظیم الشان عمارت تعمیر کی جا سکتی ہے۔ قدیم اہلِ علم و ادب کثیر الجہات علمی شخصیات تھے۔ وہ بیک وقت علم کی مختلف جہتوں کو سنبھالنے کی اہلیت رکھتے تھے۔ وہ محقق بھی تھے، نقاد بھی، مقالہ نگار تھے اور مقدمہ نگار بھی، خاکہ نگار بھی تھے اور اُردو زبان کے مبلغ اور حامی بھی۔ اُردو تحقیق کی روایت کے چند ابتدائی رجحانات کے بعد اگر بیسویں صدی کے اوائل کا جائزہ لیا جائے تو بے موقع نہ ہوگا۔

نامور محققین میں حافظ محمود شیرانی کا نام سرِ فہرست ہے۔ انہیں برملا طور پر اردو میں تحقیق و تدوین کا معلم اوّل قرار دیا جا سکتا ہے۔ انہیں اکابر محققین نے بھی اپنا معنوی امام تسلیم کیا ہے۔ انہوں نے نادر قلمی نسخوں اور قدیم مطبوعہ کتب کے سلسلے میں ہمہ جہت خدمات سرانجام دیں۔ وہ اُردو زبان و ادب کے بے بدل محقق ہیں۔ ان کے متنوع مطالعے تجربے اور مشاہدے نے انہیں محققانہ بصیرت عطا کی۔ وہ اُردو تحقیق میں ایک خاص دبستان کے بانی ہیں۔ وہ عربی و فارسی زبان کے فاضل تھے۔ انہوں نے مطبوعہ کتب کی قدامت، نوعیت علمی حیثیت وغیرہ کے متعلق مستند معلومات فراہم کیں۔ یہاں تک کہ کتابت کی اقسام، رسم الخط، اندازِ کتابت، کاتب اور استعمال ہونے والی سیاہی کی نوعیت اور کتابت کا تعلق کس عہد سے ہے وغیرہ وغیرہ پر بھی اظہار رائے کیا۔ ان امور کے متعلق حافظ محمود شیرانی نے بے حد جامع اور مربوط معلومات فراہم کیں۔ وہ انگریزی زبان و ادب کے شناسا بھی تھے۔ اس طرح ان کے علمی تحقیقی کام کی نوعیت بڑی مستند اور گہری ہو جاتی ہے وہ کسی جماعت، گروہ یا مکتبِ فکر کے فیصلوں کے پرچار کو تحقیق کا منبع یا منزل قرار نہیں دیتے بلکہ تحقیقی ثبوت اور علمی نتائج کے استخراج کو تحقیق کی منزل سمجھتے ہیں۔ وہ اپنے تاثرات و تعصبات کی بنیاد پر فیصلے کرنے کو محقق کے منصب کے منافی سمجھتے ہیں اور اپنے نتائجِ تحقیق کا بے خوف ابلاغ کرنے کو محقق کی شان اور مقامِ علمی کا تقاضا خیال کرتے ہیں۔

پہلی جنگِ عظیم کے بعد اور قیام پاکستان سے قبل ڈاکٹر سلیمان ندوی، عبد الستار صدیقی، مولوی عبد الحق، محی الدین قادری زور، مولوی عبد الحئی اور ڈاکٹر محمد شفیع کے نام سامنے آتے ہیں۔ اس زمانے میں تحقیق کی ضرورت اور اہمیت کا احساس بڑھا۔ تحقیق کے بنیادی اصولوں کو سامنے رکھ کر حقائق اور شواہد کے تعین کا احساس پیدا ہوا۔ تحقیق کو اگر فکری بنیادوں پر تقسیم کیا جائے تو کئی دبستان تحقیق بھی وجود میں آتے ہیں۔ جو مختلف

الخیال محققین کے گروہوں اور ان کے کارناموں پر مشتمل ہیں۔

اس ضمن میں ڈاکٹر وحید قریشی فرماتے ہیں:

''ڈاکٹر زور، عبد السلام ندوی، سید سلیمان ندوی، عبد الحیٔ، ڈاکٹر عبد الستار صدیقی، مولوی عبد الحق، حافظ محمود شیرانی، پروفیسر محمد اقبال، ڈاکٹر مولوی محمد شفیع۔۔۔ یہی وہ بزرگ ہیں جنہوں نے صحیح معنوں میں ریسرچ کا آغاز کیا۔ اردو، فارسی اور عربی کے سرمائے کو بند الماریوں سے نکالا۔ متون کی ترتیب و تصحیح کی۔ تاریخ ادب کی گمشدہ کڑیوں کو دریافت کیا۔ زبان کے آغاز و ارتقاء کی نشاندہی کی۔ ادبا اور شعراً کے حالات و واقعات کو متعین کیا اور وہ سرمایہ فراہم کیا جس سے تاریخِ ادب کی تدوین کا کام ممکن نظر آنے لگا۔''[۲]

اُردو تحقیق کو اگر دبستانوں میں تقسیم کیا جائے تو پہلا دبستان سرسید سے شروع ہوتا ہے۔ جو تالیفی دبستان کہلایا جا سکتا ہے۔ شبلی، مولوی عبد الحق، مسعود حسن خان سے ڈاکٹر گیان چند تک بیشتر محققین اسی سے منسلک نظر آتے ہیں۔ دوسرا دبستان انتقادی دبستان ہے۔ یہ حقائق کی تشریح و توضیح کرتا ہے۔ ڈاکٹر لائٹنر، حافظ محمود شیرانی، ڈاکٹر سید عبد اللہ، قاضی عبد الودود، خلیل الرحمٰن داؤدی، مشفق خواجہ اور رشید حسن خان اس مکتب فکر کے پیروکار ہیں۔ تیرے مکتبِ فکر نے موضوعات کی جانچ پرکھ اور تجزیوں کو معیاری تحقیق کے لیے تکنیک کو بنیاد بنایا اور یوں اپنی تحقیقی بصیرت کا اظہار کیا۔ ان محققین میں مولانا حالؔی، ڈاکٹر فرمان فتحپوری، ڈاکٹر جمیل جالبی جیسے نام شامل ہیں۔

یہ دبستانوں کی فکری تقسیم تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ زمانی و مکانی لحاظ سے بھی دبستان تقسیم کیے جا سکتے ہیں۔ قیامِ پاکستان کے بعد کئی محققین نے تحقیق کے سفر کو منزل کی جانب رواں دواں رکھنے کے لیے سخت کوشش اور جانفشانی سے کام لیا اور تحقیق میں مستقل رجحانات کی بنیاد رکھی۔ حافظ محمود شیرانی نے لاہور میں تحقیق کے شعبے کو ایسی جہت عطا کر دی کہ دبستانِ لاہور کی بنیاد پڑی۔ حافظ محمود شیرانی نے تحقیق کے عمل کو ایک علمی تحریک کا درجہ دے دیا۔ ان کے نتائج تحقیق نے کئی مروجہ نظریوں اور تصورات کو باطل ثابت کیا۔ حافظ محمود شیرانی کے شعرالعجم (شبلی) اور آبِ حیات، آزاد پر تنقیدی مضامین دیکھ کر اندازا ہو جاتا ہے کہ انہوں نے جو

استناد اور ثبوت پیش کیا وہ نکتہ شناسی اور گہری بصیرت پر بنی ہے۔انہوں نے یہ ثابت کیا کہ تحقیق کا تعلق جذبات سے نہیں حقائق سے ہے۔ انہوں نے تحقیقی عمل کو ایک اکائی بنا کر پیش کیا۔ حافظ محمود شیرانی نے رسمیات تحقیق وضع کیں۔ انہوں نے تحقیق میں باریک بینی اور کاوش کی روایت قائم کی۔ حافظ محمود شیرانی بیرسٹر بننا چاہتے تھے۔ لیکن قدرت نے انہیں اردو زبان و ادب کی آبیاری کے لیے منتخب کر لیا تھا۔ چنانچہ انگلستان میں اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ کر پروفیسر آرنلڈ کے ساتھ علمی کاموں کے سلسلے میں وابستہ ہو گئے۔ اس طرح ان کی دلچسپیوں اور ذہنی سرگرمیوں کا رُخ علم و ادب کی جانب مڑ گیا۔ انہوں نے مشرقی علوم وفنون سے متعلق کاروبار کرنے والی فرم میں کام کرنے کے ساتھ ساتھ لیوزک کمپنی میں ملازمت اور پھر حصہ داری بھی کی۔ گویا ان متنوع سرگرمیوں نے انہیں رنگا رنگ مطالعے کی طرف راغب کیے رکھا اور ان کے تجربے اور مشاہدے میں گراں قدر اضافہ ہوتا رہا۔ اس طرح انہوں نے علمی و ادبی کاموں میں متنوع قسم کی مہارتیں پیدا کر لیں۔ ان کی محققانہ بصیرت میں کسی کو کلام نہیں۔ حافظ محمود شیرانی کا نام دبستانِ لاہور کے حوالے سے مستند اور اہم ہے۔ دبستان لاہور کے علاوہ دبستانِ اعظم گڑھ، دبستانِ پٹنہ، دبستان رام پور کے علمی و تحقیقی کارنامے ایسے ہیں۔ جنہوں نے اردو ادب کے ذخیرے کو زندہ کیا۔ قدیم متون کی تلاش اور ان کی تدوین کا آغاز ہوا۔ دبستان دکن میں مولوی عبدالحق، ڈاکٹر محی الدین قادری زور، سید شمس اللہ قادری، نصیر الدین ہاشمی، ڈاکٹر مسعود حسن خان، ڈاکٹر زینت ماجدہ، ڈاکٹر حسینی شاہد، ڈاکٹر حفیظ قتیل، مبارز الدین رفعت، اکبر الدین صدیقی سخاوت مرزا، ثمینہ شوکت، ڈاکٹر رضیہ سلطانہ، آمنہ خاتون، ڈاکٹر فہمیدہ بیگم اور نئی نسل میں ڈاکٹر محمد علی اثر وغیرہ کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ اس دبستان نے اُردو ادب کے قدیم ذخائر کو سامنے لانے میں قابل ستائش خدمات سر انجام دیں۔ دکن میں ڈاکٹر زور اور ان کے رفقاً خصوصاً ڈاکٹر عبد القادر سروری، اور نصیر الدین ہاشمی نے دکنی ادب کے متن کی تصحیح کا کام کیا اور لسانی اعتبار سے زبان کی نشوونما اور ارتقاً کا جائزہ لیا۔ دبستانِ دکن کے محققین اختلافِ نسخ میں قلمی نسخوں کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے اور نظری مباحث میں واقعات کی سمت کا دارومدار ادبی مآخذ پر رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر وحید قریشی اس ضمن میں فرماتے ہیں:

> اس علمی مرکز نے دکنیات کے ذخیرے کو زندہ کیا اور لسانیات کو فلالوجی کی حدود سے نکال کر صوتیات کے علم سے ملا دیا۔ ڈاکٹر زور کی کتابیں ہندوستانی لسانیات اور Daccani

Phonetics بہت اہم ہیں۔ لسانیات کا علم ڈاکٹر مولوی عبد الحق اور ڈاکٹر عبد الستار صدیقی سے گہرائی اور توانائی حاصل کرتا ہے۔[۳]

اگر دکن کے مصنفین نے ادبی کاوشیں سر انجام دیں تو دار المصنفین کی تحقیق مذہبی رجحانات کا جائزہ لیتی دکھائی دیتی ہے۔ دبستانِ اعظم گڑھ میں اُردو کو صرف زبان کی حیثیت سے نہیں مسلمانوں کی علمی زبان کی حیثیت سے دیکھنے کی کوشش کی گئی۔ اردو تحقیق مذہبی رُجحانات اور مذہبی علوم کے حوالے سے انجام دی گئی۔ اُردو ادب کے بنیادی مسائل کو تاریخ کی کسوٹی پر رکھا گیا۔ شبلی کی سیرت النبیؐ اس کی روشن مثال ہے۔ اس دبستان میں علمی و ادبی کارگزاری کے لحاظ سے عبد الماجد دریا آبادی، مصباح الدین عبد الرحمٰن، عبد السلام ندوی اور عبد الحیؒ کے کارنامے نمایاں ہیں۔

دبستان پٹنہ میں قاضی عبد الودود، ڈاکٹر اختر اورینوی اور ڈاکٹر مختار الدین آرزو نمایاں ہیں۔ قاضی عبدالودود اس دبستان کے سرخیل ہیں۔ اس دبستان کے نمایاں رجحانات میں اہم رجحان یہ ہے کہ ثانوی ماخذ کو صرفِ نظر کر دیا گیا قاضی صاحب کے ہاں احتیاط کا عنصر بہت زیادہ ہے لیکن مخففات کے بے دریغ استعمال سے تحریر کا حسن ماند پڑ گیا ہے۔

دبستان رام پور کے اہم ترین محقق امتیاز علی عرشی ہیں۔ اس دبستان کے محققین نے تصحیح متن کے اہم کارنامے سر انجام دیئے ترتیب میں تذکروں کے استعمال کا نیا اسلوب اپنایا۔ اس دبستان کے نقطۂ عروج پر پاکستان کا قیام عمل میں آیا۔ قیامِ پاکستان سے قبل بیسویں صدی میں تحقیقی روایت مزید آگے بڑھی اس تحقیق کے مراکز اعظم گڑھ، پٹنہ، لاہور، دلی اور لکھنؤ ہیں۔ ان مختلف تحقیقی دبستانوں میں مختلف نوعیت کا تحقیقی کام ہوا۔ اس دور کی تحقیق کے بارے میں سید احتشام حسین لکھتے ہیں۔

> اس دور کی تنقیدیں سب اپنی اپنی جگہ چھوٹی یا بڑی چمکتی ہوئی چنگاریاں ہیں جو بھڑک کر شعلہ نہیں بنتیں۔[۴]

برصغیر پاک و ہند کی تقسیم کے بعد پاکستان میں تحقیقی روایت کی نشوونما اور ارتقاً سست رفتاری سے ہوا۔ اس کی کئی وجوہات ہیں مثلاً ملکی حالات، سماجی و سیاسی بحران، تحقیق کے سلسلے میں نقادوں کا رویہ دغیرہ سیاسی

حالات نے بھی تحقیق کے لیے پُرسکون حالات فراہم نہ کیے۔ تعلیمی منصوبہ بندی کے فقدان نے بھی ابتدائی طور پر تحقیقی مزاج کو استوار نہ ہونے دیا۔ علمی ذخائر تک نارسائی، عمدہ لائبریریوں، کی عدم موجودگی اور وسائل کی کمی تھی، پھر تقسیم برصغیر کے بعد تحقیق کو تنقید کا دشمن قرار دیا گیا۔ لیکن اس دور میں ہی ایسے ادارے بھی قائم ہوئے جو خالصتاً تحقیقی مقاصد کے لیے بنائے گئے۔ مثلاً انجمن اردو کراچی، پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی، اقبال اکیڈیمی، مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، سندھی ادبی بورڈ، ترقی اُردو بورڈ کراچی، اُردو اکیڈیمی بہاول پور، اُردو اکیڈیمی لاہور، مرکزی اُردو بورڈ لاہور، بزم ثقافت لاہور، بزمِ اقبال لاہور، مجلس ترقی ادب لاہور، پنجابی اکیڈیمی لاہور، پشتو اکیڈیمی پشاور وغیرہ۔

ڈاکٹر شمس الدین صدیقی اپنے مضمون ''تحقیق و تنقید'' میں لکھتے ہیں:

> اس دور میں تحقیق کی روایت کو امتیاز علی عرشی، شیخ چاند، ڈاکٹر مسعود حسین خان، ڈاکٹر شوکت سبز واری اور ڈاکٹر وحید قُریشی نے آگے بڑھا کر خوب مستحکم کیا۔ چونکہ مختلف یونیورسٹیوں میں اُردو میں تحقیقی کام شروع کر دیا گیا اور اُردو میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگریاں دی جانے لگیں اس لیے قدیم و جدید شعرا اور ادبا، اصناف، ادوار اور رجحانات، تحریکات پر کئی مقالے لکھے گئے۔ بعض تحقیقی و تنقیدی مقالے شائع بھی ہوئے۔ ۵

بہر حال قیامِ پاکستان کے بعد تحقیق کے آغاز اور ابتدا کے بارے میں عرض کیا جا رہا ہے۔ دبستانِ لاہور کا آغاز یوں تو محمد حسین آزاد کی ''آبِ حیات'' کے ساتھ ہی ہو چکا تھا کیونکہ یہ کتاب بھی لاہور ہی میں لکھی گئی۔ یہ دبستان، جدید تحقیق کا آغاز تھا اور حافظ محمود شیرانی اس جدت کا نقطۂ آغاز قرار پائے۔ حافظ محمود شیرانی بہت بڑے بت شکن تھے ان کی پیروی کرتے ہوئے اس دبستان کے دیگر محققین بھی محتسب کا کردار ادا کرتے رہے۔ انہوں نے مختلف علوم اور دیگر زبانوں کے مطالعے کو بھی ضروری قرار دیا۔ وہ تاریخ کی مدد حاصل کر کے ادب سے دریافت شدہ مواد کے مختلف رشتوں کو دریافت کرتے ہیں۔ انہوں نے پہلی بار صحافتی اور شاعرانہ انداز ترک کر کے جامع زبان کی داغ بیل ڈالی۔ مشرقی علوم کی برتری کو دلائل و براہین کے ساتھ ثابت کیا۔

عربی، فارسی اور اُردو ادب کے ساتھ دیگر لسانی و علمی روایت کا گہرا مطالعہ کیا اور ان کی مدد سے اپنی تحقیق کو مزید وقیع بنایا۔ علوم شرقیہ کو زندہ کرنے کی سعی کی۔ نئے حقائق کی تلاش میں پرانے حقائق کی مدد

لی۔ تحقیق ایک نامیاتی عمل ہے۔ اسی حقیقت کو محسوس کرتے ہوئے دبستانِ لاہور کے محققین نے تحقیق میں اخلاقی قدروں پر سختی سے عمل کیا۔ انہوں نے تحقیق کو جستجو اور دریافت کا عمل قرار دے کر اسے سائنسی طریق کار کے طرز پر اپنایا اور جدید سائنٹفک اصولوں پر سوانح اور متون کو درست کیا اور ان کی ترتیب و تصحیح کی۔ پروفیسر شیرانی، مولوی محمد شفیع، ڈاکٹر اقبال جیسے اکابرین علماء نے ریاضت اور تحقیق کو لازم و ملزوم قرار دیا۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے اُردو، فارسی، عربی ہر سہ زبانوں کے بارے میں تحقیق اور علمی کام کیا۔ دیگر علوم سے گہری شناسائی نے ان کی تحقیق میں وسعت اور گہرائی پیدا کی۔ دبستانِ لاہور کے محققین نے تحقیق میں نئے ماخذ تلاش کیے اور ان ماخذوں کے باطن میں داخل ہو کر ایسے شواہد پیش کیے جو نہ صرف ان کے نقطۂ نظر کی ترجمانی کرتے ہیں۔ بلکہ وضاحت کر کے اِسے ایک قطعی صورت بھی دیتے ہیں۔ دبستانِ لاہور کے دیگر محققین میں برج موہن دتاتریہ کیفی، پروفیسر محمد شفیع، ڈاکٹر محمد اقبال، قاضی فضل حق اور ڈاکٹر وحید قریشی کے نام شامل ہیں۔ جنہوں نے گہرائی سے متون کا مطالعہ براہِ راست ماخذ کا استعمال جیسی روایات کو قائم رکھا۔ ان محققین کی اصل تحقیقات کو اگر یکجا کیا جائے تو اس سے ایک دبستان پیدا ہوتا ہے۔ جسے ہم دبستانِ لاہور کا نام دے سکتے ہیں ان محققین میں سرفہرست نام ڈاکٹر وحید قریشی کا ہے۔ جنہوں نے ڈاکٹر سید عبد اللہ اور ڈاکٹر مولوی محمد شفیع سے براہِ راست استفادہ کیا۔ ان کے ساتھ ہی مشفق خواجہ، ڈاکٹر جمیل جالبی، قاضی احمد میاں، اختر جونا گڑھی، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان، افسر صدیقی، امر وہوی، نجم الاسلام کے نام بھی لیے جا سکتے ہیں۔ جنہوں نے دبستانِ لاہور کے تحقیقی اصول وضوابط کو اپنایا اور انہیں عام کیا۔

ان بزرگ محققین کی تربیت یافتہ نسل آج بھی دبستانِ لاہور کے فروغ میں پیش پیش ہے اور ان کے اہم کارناموں کے سبب دبستانِ لاہور کا نام اُردو تحقیق میں تابناک ہے ان محققین میں ڈاکٹر گوہر نوشاہی، ڈاکٹر تبسم کاشمیری، محمد اکرام چغتائی، ڈاکٹر اے بی اشرف، ڈاکٹر معین الدین عقیل، ڈاکٹر صدیق جاوید، خواجہ محمد زکریا، ڈاکٹر تحسین فراقی قابل ذکر ہیں۔

ان بزرگ محققین کے عمل نے اُردو تحقیق میں ایک ٹھوس اور معینہ روایت قائم کی جسے ان سے متاثر ہونے والے اور ان کے تربیت یافتہ محققین نے آگے بڑھایا اور دبستانِ لاہور کو زندہ جاوید ادارے کے طور پر قائم رکھا۔ ڈاکٹر وحید قریشی فرماتے ہیں:

"ان جامع کمالات شخصیتوں کے علم اور مطالعے کے حدود کا احاطہ ممکن نہیں۔۔۔ وہ کسی ایک مضمون پر بند نہیں تھے۔ مختلف علوم اور زبانوں کی مدد سے تحقیقی مقالات کی تحریر میں وسعت اور گہرائی پیدا کرتے تھے اور علوم کی اکائیاں بنانے کی بجائے کل پر نظر رکھتے تھے۔ اس سے ان کے علمی کارنامے پائیدار اور عظیم ہوئے۔"[۶]

دبستانِ لاہور کی تحقیقی خدمات افراد اور شخصیات کے حوالے سے تو ہیں ہی ادارے بھی اس میں شامل ہیں۔ چونکہ تقسیم ہند کے وقت انتشار اور افراتفری کا عالم تھا اور تحقیق کے صبر آزما عمل میں جن سہولتوں اور ماخذ کے ذخیروں کی ضرورت ہوتی ہے وہ یہاں موجود نہ تھے لیکن پھر بھی لاہور میں تحقیقی روایت برقرار رہی۔

ڈاکٹر گوہر نوشاہی دبستانِ لاہور کے حوالے سے ڈاکٹر وحید قریشی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اپنے پچیس سالہ تجربے کی بناء پر بڑے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ تحقیقی موضوعات پر ڈاکٹر وحید قریشی سے بہتر کسی اُستاد راہنما کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ برعظیم میں فن تحقیق کی اگر کسی روایت کو صحیح معنوں میں دبستان کہا جا سکتا ہے تو وہ دبستانِ لاہور ہے۔ جو اپنے بعض امتیازی خصائص کے سبب مثالی اور زندہ جاوید ہے اور اگر میرا یہ مؤقف درست ہے تو اس میں یہ اضافہ بھی کروں گا کہ: ڈاکٹر وحید قریشی کی ذات اور علمی شخصیت نہ صرف اس دبستان کی نمائندہ ہے۔ بلکہ دبستان لاہور کی تربیت گاہ کے طور پر ان کی شخصیت مثالی حیثیت رکھتی ہے بلکہ اس روایت کا دور حاضر میں محور و مرکز بھی ہے اگر انہیں دبستان لاہور کی تربیت گاہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔"[۷]

لاہور میں دبستانِ لاہور کے محققین کے علاوہ جن اداروں نے تحقیق کی سرپرستی کی۔ ان میں ادارہ تحقیقاتِ پاکستان، ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور اور مرکزی اردو بورڈ لاہور شامل ہیں۔ ان کے علاوہ جامعہ پنجاب کا شعبۂ تصنیف و تالیف گراں قدر خدمات سرانجام دے رہا ہے۔ جامع پنجاب کا مبسوط منصوبۂ اُردو دائرہ معارف اسلامیہ بھی کام کر رہا ہے اور اورینٹل کالج کے اساتذہ اور اس کا مجلّہ اورینٹل

کالج میگزین بھی تحقیقی عمل کو آگے بڑھانے میں کوشاں ہے۔ کتب خانۂ پنجاب کے مخطوطات کی پہلی فہرست ۱۹۴۲ء میں اور دوسری جلد ۱۹۴۸ء میں شائع ہوئی۔ کتب خانۂ پنجاب کے دیگر ذخائر ذخیرہ محمود شیرانی اور ذخیرہ مولوی محمد شفیع کی فہرستیں شائع ہوئیں۔ ڈاکٹر عارف نوشاہی نے ۱۹۶۸ء سے ۱۹۸۱ء کے درمیان شائع ہونے والی متعدد فہارس، مخطوطات اور مطبوعات کی مدد سے مزید نسخوں کی نشاندہی کر کے اس کو مزید مفید بنایا ہے کتب خانۂ جامع پنجاب میں موجود مائیکروفلم اور فونوگراف کی کتابیات بھی شائع ہوگئی ہیں۔ محققین کے علاوہ اُردو ادب کی تحقیقی روایت کی آبیاری کرنے میں کچھ اداروں نے بہت کام کیا ہے۔ ''انجمن ترقی اُردو'' کا نام اس ضمن میں نمایاں ہے۔ ''مجلس ترقی ادب لاہور'' نے تحقیقی و تدوینی کام سرانجام دیا۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی، کلب علی خان فائق رام پوری نے مجلس سے وابستہ رہ کر نمایاں کارنامے سرانجام دیے جن میں پدماوت اور یادگار چشتی مرتبہ ڈاکٹر گوہر نوشاہی اور مومن، از فائق رام پوری، قابل ذکر ہیں۔ ڈاکٹر شمس الدین صدیقی کا مرتبہ کلیاتِ سودا بھی مجلس نے شائع کرایا۔ فنِ تحقیق کے معائیر متعین کرنے کے لیے ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان نے توجہ دی اور فنِ تحقیق کو اپنا موضوع بنایا ہے ان کا مقالہ فنِ تحقیق ''کل پاکستان اُردو تدریس کانفرنس'' منعقدہ لاہور دسمبر ۱۹۶۱ء میں پڑھا گیا۔ پاکستان میں فنِ تحقیق کے موضوع پر لکھا جانے والا یہ پہلا قابلِ توجہ مقالہ ہے۔ ڈاکٹر عندلیب شادانی نے تحقیق اور اس کا طریقۂ کار تحریر کیا۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے دستاویزی تحقیق کے بارے میں طریقِ تحقیق کی وضاحت کی کہ مواد کن ذرائع سے حاصل کیا جاتا ہے۔ محمد اکرام چغتائی نے کتب خانہ جامع پنجاب لاہور اور پنجاب پبلک لائبریری لاہور میں موجود دیوان ولی کے سات قلمی نسخوں اور اول الذکر کتب خانوں کی قلمی بیاضوں سے ولی کا ایسا کلام دریافت کیا جو غیر مطبوعہ تھا۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی نے حیدری کے غیر مطبوعہ کلام کا مخطوطہ لندن برٹش میوزیم اور آکسفورڈ لائبریری سے بازیاب کیا اور اس کو شائع کرایا۔ ڈاکٹر معین الدین عقیل نے ''پاکستان میں اردو تحقیق'' کے حوالے سے پاکستان میں تحقیقی عمل کی رفتار کا مفصل جائزہ لیا ہے۔ ڈاکٹر معین الدین عقیل لکھتے ہیں:

> ادبی تحقیق میں بھی پاکستانی محققین نے قابلِ قدر خدمات انجام دی ہیں۔ متعدد نئے متون دریافت ہوئے، نظم و نثر کے قدیم متون کو مدون کیا گیا اور اہم انکشافات

سامنے آئے۔ شعراً اور نثر نگاروں کے حالات پر بھی تحقیق ہوئی۔ ادبی اور تاریخی تذکرے تصنیف ہوئے اور اصناف ادب پر بھی تحقیقی نظر ڈالی گئی۔ ۸

تحقیقی عمل کی رفتار کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر گوہر نوشاہی کے نام سے کسی طور صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی اہم خدمات پنجاب کے قدیم ادبی سرمائے کی دریافت اور متون کی جدید اصولوں کے مطابق تدوین ہیں۔ وہ اُردو زبان و ادب کے اس حقیقی خاکے کو مرتب کرنے اور اس فطری مسیر (Route) کو دریافت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ جس کی مدد سے تاریخِ ادب تحقیقی عظمت کے ساتھ مرتب کی جا سکے گی۔ وہ فن تدوین کو تحقیقی عمل کا اصل منشا اور رُوح سمجھتے ہیں۔

ڈاکٹر تبسم کاشمیری کا سب سے اہم کارنامہ ان کی تصنیف اُردو ادب کی تاریخ ہے جس کی ایک جلد شائع ہو چکی ہے اور دوسری تصنیف، کے مراحل میں ہے۔ غلام رسول مہر نے غالب کے، خطوط کی جمع و تدوین کا کام کیا۔ ڈاکٹر وحید قریشی کی تحقیقی خدمات کی تفصیل الگ باب میں آئے گی۔

ڈاکٹر گوہر نوشاہی پاکستان میں تحقیق کی صورتحال اس طرح واضح کرتے ہیں:

> ہمارے ہاں قلمی کتابوں، دستاویزات اور مطبوعات کی کوئی اجتماعی فہرست یعنی ''یونین کیٹیلاگ'' موجود نہیں۔۔۔ پاکستان میں موجود تمام سرکاری، نیم سرکاری، قومی اور نجی کتب خانوں کی ایک مفصل تعارفی فہرست مرتب کی جانی چاہیے۔ یہ کام قومی سطح پر ہونا چاہیے۔ نیشنل لائبریری، پاکستان آرکائیوز اور پاکستان ڈاکیومینٹیشن سنٹر جیسے مؤثر ادارے اس کام کو اپنے ذمے لے سکتے ہیں۔ ۹

لیکن ان مسائل کے باوجود بڑے بڑے محققین و مصنفین اس ملک میں نام پاتے رہے جن میں ڈاکٹر وحید قریشی کی خدمات اُردو تحقیق میں روشن مثال کی حیثیت رکھتی ہیں۔

☆☆☆

حوالہ جات (باب اوّل)

۱ مشمولہ معین الدین عقیل ڈاکٹر، ''پاکستان میں اُردو تحقیق،(موضوعات اور معیار) انجمن ترقی اُردو کراچی ۱۹۸۷ء،صفحہ۲۔

۲ وحید قُریشی ڈاکٹر۔ دیباچہ کلاسیکی ادب کا تحقیقی مطالعہ۔ مکتبہ ادب جدید مٹیالہ گراونڈ لاہور ۱۹۶۵ء،صفحہ۹۔

۳ ڈاکٹر وحید قُریشی، تحقیق کے تقاضے، ایم سلطانہ بخش ڈاکٹر، اُردو میں اصول تحقیق، ورڈ ویژن پبلشرز بلیو ایریا، اسلام آباد، ۱۹۸۵ء، صفحہ ۲۴ تا ۲۵۔

۴ احتشام حسین، ذوقِ ادب اور شعور، مطبوعہ لکھنؤ، ۱۹۵۵ء ،صفحہ ۶۸۔

۵ شمس الدین صدیقی، ڈاکٹر، مضمون تحقیق وتنقید، بشمولہ تاریخ ادبیاتِ مسلمانانِ پاک و ہند مدیر سید فیاض محمود پنجاب یونیورسٹی لاہور، طبع اوّل ۱۹۷۶ء صفحہ ۳۶۷۔

۶ وحید قریشی ڈاکٹر، تحقیق کے تقاضے، مشمولہ اصولِ تحقیق جلد اول مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، ۱۹۸۵ء، صفحہ ۲۷ تا ۲۸۔

۷ گوہر نوشاہی ڈاکٹر، ڈاکٹر وحید قُریشی شخصیت اور فن، اکادمی ادبیات پاکستان اسلام آباد، ۲۰۰۶ء، صفحہ ۲۷۔

۸ معین الدین عقیل ڈاکٹر، ''پاکستان میں اردو تحقیق'' انجمن ترقی اُردو کراچی، ۱۹۸۷ء، صفحہ ۳۳۔

۹ گوہر نوشاہی، ڈاکٹر۔ ''پاکستان میں تحقیق وسائل اور امکانات'' Newsletter شمارہ 23، دسمبر 1995ء پاکستان ڈاکومنٹیشن سنٹر، کیبنٹ ڈویژن، اسلام آباد، صفحہ ۲۵۔

☆☆☆

باب دوم

ڈاکٹر وحید قریشی اور اُن کا خاندان

ڈاکٹر وحید قریشی کا نام عبدالوحید، وحید تخلص اور ڈاکٹر وحید قریشی قلمی پہچان ہے۔ آبائی شجرہ چھ واسطوں سے سلسلہ قادریہ کے ممتاز صوفی اور صاحب ولایت بزرگ حضرت شاہ جمال نوری (م ۱۰۶۱) سے ملتا ہے۔ حضرت شاہ جمال نوریؒ ایک واسطے سے حضرت میاں میر لاہوریؒ کے مرید تھے۔ ان کے جدِّ اعلیٰ محمد بن قاسم کی قیادت میں برعظیم آئے تھے۔ اسلامی فتوحات کے بعد آپ کچھ عرصہ اُچ میں مقیم رہے اور بعد ازاں ایک شاخ نے ڈیرہ غازی خان بہ مقام حضرت ولا میں سکونت اختیار کر لی اور درس و تدریس میں مشغول ہوئے۔ فیضانِ باطن کی جستجو میں حضرت میاں میر کے حلقہ ارادت میں آئے۔ روحانی تربیت کے بعد اپنے مرشد کے ارشاد پر موضع کھیالی متصل گوجرانوالہ میں چلے آئے اور تبلیغ اسلام کے عظیم مشن میں مصروفِ عمل ہوئے۔ آپ کی تبلیغ سے ہزاروں غیر مسلم حلقۂ اسلام میں آئے۔ آستانۂ مبارک گوجرانوالہ میں بیرونِ کھیالی دروازہ مرجع خلائق ہے۔

برصغیر پاک و ہند میں مغلیہ سلطنت کی تباہی و بربادی کی داستان طویل ہے۔ پنجاب میں برچھا گردی اور لکھا شاہی نے لوگوں کا جینا دوبھر کر رکھا تھا۔ شرفاء اور علماء اپنی جانیں بچانے کی خاطر شہر چھوڑ کر دور دراز دیہاتوں میں مقیم ہو رہے تھے لیکن اس پریشانی کے دور میں بھی انہوں نے اشاعتِ اسلام اور ترویج علوم دین کی طرف خصوصی توجہ مبذول رکھی اور اسے اپنا شعار بنائے رکھا چنانچہ اسی طرز کے ایک خانوادے سے ڈاکٹر وحید قریشی کا بھی تعلق ہے یہ موضع کھیالی ضلع گوجرانوالہ کا علم پرور خاندان تھا، جن کے علم و حکمت کی روشنی چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔

حضرت شاہ جمال نوری کے دو فرزند تھے۔ حضرت شاہ عبدالرحیم اور حضرت شاہ عبدالکریم۔ شاہ عبدالرحیم کے پوتے مولوی محمد سعید کے چار بیٹے تھے۔ جن میں سے ایک مولوی نظام الدین تھے۔

ڈاکٹر وحید قریشی کے پردادا مولوی محمد اشرف قریشی صدیقی تھے جو مولوی نظام الدین کے بیٹے تھے۔ مولوی محمد اشرف قریشی خاندان کے پہلے فرد تھے جنہوں نے روایات کے برعکس انگریزوں کی ملازمت اختیار کی۔آپ عالم و فاضل شخصیت اور اعلیٰ پائے کے خوش نویس تھے۔ انہوں نے قرآنِ حکیم کا نفیس اور خوبصورت نسخہ اپنے ہاتھ سے لکھا۔ مولوی محمد اشرف کے بیٹے مولوی احمد علی ڈاکٹر وحید قریشی کے نانا تھے۔ جبکہ مولوی محمد اشرف کے ہی دوسرے بیٹے مولوی امیر علی قریشی ڈاکٹر وحید قریشی کے دادا تھے جو پنجاب کے پہلے مسلمان ڈی۔ ایس۔ پی تھے۔ مولوی امیر علی قریشی کے منجھلے بیٹے محمد لطیف قریشی، ڈاکٹر وحید قریشی کے والد گرامی تھے جو ۱۲ دسمبر ۱۸۹۸ء کو گوجرانوالہ میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے خالصہ کالج گوجرانوالہ سے ایف۔ اے کیا۔اسلامیہ کالج ریلوے روڈ لاہور میں بی۔ اے کے آخری سال میں تھے کہ والد کا انتقال ہوگیا اس لیے محکمہ پولیس میں بحیثیت سب انسپکٹر ملازم ہو گئے۔ بارہ تیرہ سال ساہیوال میں گزارے تھے۔ پھر ایس ایچ او مقرر ہو کر لاہور آ گئے۔ جہاں مزنگ اور انارکلی کے تھانوں میں خدمات سرانجام دیں۔ لاہور کے بعد کچھ عرصہ پسرور، سمبڑیال اور سیالکوٹ میں بھی ملازمت کے سلسلے میں قیام کیا۔ ۱۹۴۹ء میں ہرنیا کی شکایت ہوئی جس کے بعد ذاتی مجبوری کی وجہ سے پنشن حاصل کی۔ انہوں نے یکم اگست ۱۹۹۱ء کو رحلت فرمائی۔ شگفتہ مزاجی، تقویٰ، شرافت اور وضع داری کے پیکر تھے۔ سراپا شفقت اور سراپا اخلاص تھے۔ ان کے دو بچے پیدا ہوئے۔ بیٹی سعیدہ جو جواں مرگی میں انتقال کر گئیں اور بیٹے وحید قریشی جو کہ بہن کے انتقال کے وقت میٹرک کے طالب علم تھے۔

ڈاکٹر وحید قریشی ۱۴ فروری ۱۹۲۵ء کو ہفتے کے دن اپنے نانا کے گھر میانوالی میں پیدا ہوئے۔کسووال کے پرائمری سکول میں ۱۹۳۰ء میں تعلیم کا آغاز ہوا۔ استاد اور اتالیق کے طور پر ماسٹر خورشید کی خدمات حاصل کی گئیں۔ ماسٹر صاحب کی شرافت اور تعلیم و تربیت میں دلچسپی کی وجہ سے ڈاکٹر وحید قریشی میں علمی و ادبی ذوق پروان چڑھا۔ ڈاکٹر وحید قریشی کے والد ملازمت کے سلسلے میں جہاں جہاں گئے ماسٹر خورشید کو بیٹے کی علمی رہنمائی کے لیے ساتھ ساتھ رکھا۔

ڈاکٹر وحید قریشی اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھے۔ڈاکٹر صاحب کو بچپن سے ہی والدین کی توجہ اور شفقت میسر آئی۔ وہ طبعاً کم آمیز اور قدرے محجوب تھے۔ ان کی بنیادی ادبی تربیت تو ان کے گھریلو ادبی

ماحول نے کر دی تھی لیکن کالج جا کر بھی وہ کم گوئی وجہ سے کتب کو ہی اپنا رفیق سمجھتے تھے۔ وہ تعلیمی تگ و دو اور مطالعے میں محو رہتے۔ لیکن بی اے کے دوران تنہائی کا یہ خول ٹوٹا اور ڈاکٹر صاحب نے مطالعے اور تلاشِ ذات کے عمل کو تیز تر کر دیا۔ ان کے بنیادی رجحانات میں ہمہ جہت مطالعے کا شوق شامل تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ زندگی میں بلند ترین نصب العین کو تشکیل دینے اور پھر اسے حاصل کرنے کے خواہاں تھے۔ انھیں اپنی بچت کے روپے سے بھی کتب خریدنے کا شوق اوائل عمری ہی سے تھا۔ ان کے والدین نے ان کی پرداخت ان خطوط پر کی جس سے ان کی دلچسپی اور والہانہ لگاؤ کے عناصر اجاگر ہوتے رہے۔ والدین کے علمی لگاؤ اور روحانی سربلندی نے ڈاکٹر صاحب میں دونوں جوہر پیدا کیے۔ ڈاکٹر صاحب کے بزرگ بھی عربی و فارسی کے عالم تھے یہی علمیت اور روحانیت ڈاکٹر صاحب کے لہو میں رچ بس گئی۔ ان کے اتالیق نے انھیں اُردو اور فارسی کے کئی اشعار از بر کرائے۔ اقبال کی نظم پرندے کی فریاد، حالی کی نعت ''وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا'' بچپن ہی میں ڈاکٹر صاحب کے ذہن نشین تھیں۔ مسدسِ حالی اور فردوسی کے کچھ اشعار بھی ڈاکٹر صاحب نے اپنے اتالیق ماسٹر خورشید سے یاد کیے۔ بچپن ہی میں ادبی جریدے نیرنگِ خیال، اور ''کارواں'' عالمگیر، ان کی نظر سے گزرے، بانگِ درا اور بالِ جبریل کو سکول کے زمانے سے ہی پڑھا۔ افسانوں کو بھی دیکھا پرکھا۔ اُردو رسائل کی ورق گردانی نے ادبی شوق کو جلا بخشی اور آئندہ آنے والی اُدبی و تحقیقی موضوعات کے لیے بنیاد فراہم کی۔ مصوری میں بھی ڈاکٹر صاحب کا رجحان ان کی دلچسپی کا ثبوت ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے اسلامیہ ہائی سکول بھاٹی گیٹ لاہور سے ۱۹۴۰ء میں میٹرک پاس کیا۔ میٹرک کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہوئے۔ اس دور کے بارے میں وہ اپنی یادداشتیں یوں قلمبند کرتے ہیں۔

> ایک فرد کی حیثیت سے کبھی گردوپیش سے غافل نہ تھا۔ میری توجہ گھر سے زیادہ کالج کی طرف ہوئی۔ علاوہ ازیں اپنی ذاتی لائبریری بنانے کا خیال بھی اسی زمانے میں ہوا۔ ۱۹۴۳ء میں جب گورنمنٹ کالج لاہور میں میرا دوسرا سال تھا۔ جدید اُردو شاعری اور فارسی شاعری کی کتابیں جمع کرنے لگا۔[۱]

یہ اَمر قابلِ ذکر ہے کہ اس سال اسلامیہ ہائی سکول بھاٹی گیٹ سے صرف تین طالب علموں کو

گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ مل سکا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کے علاوہ دوسرے دو طالب علم عنایت اللہ اور جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال تھے۔

ڈاکٹر وحید قریشی میں بچپن ہی سے اَدبی ذوق وشوق موجود تھا جس کا تذکرہ مندرجہ بالا سطور میں ہو چکا ہے۔ شاعری سے لگاؤ اور شاعری کا فنی شعور انہی رسائل، نظموں اور کتب سے بیدار ہوا۔ کالج میں داخلے کے زمانے ہی سے اپنی لائبریری بنانے کا خیال انہیں دامن گیر ہوا۔ جس کے زیر اثر انہوں نے اُردو اور فارسی شاعری کی کتابیں جمع کرنا شروع کیں۔ اس زمانے میں انہوں نے شاعری بھی کی اور اختر شیرانی، حفیظ جالندھری اور احسان دانش کے تتبع میں اشعار کہے۔ کالج کی سطح پر تاریخ، منطق اُردو نثر، اُردو شاعری، قدیم و جدید تنقید اُردو اور انگریزی میں شاعری، فارسی شاعری، فارسی افسانہ اور نفسیات کی کتابیں ان کے زیرِ مطالعہ رہیں۔ مغربی تنقید کے مختلف دبستان اور نقاد بھی ان کی نظر سے گزرے۔ فرائڈ، ایڈلر، میکڈوگل کو بھی اسی زمانے میں بنظرِ غائر دیکھا۔ ٹی۔ ایس ایلیٹ، آئی اے رچرڈز، سی۔ آر لیوس، ایف۔ آر لیوس اور ہربرٹ ریڈ کو بھی پڑھا۔ سید عابد علی عابد، ڈاکٹر اقبال، ڈاکٹر سید عبداللہ اور عباس ابن محمد علی شوستری ایسے اساتذہ سے استفادہ کیا۔ جن سے انہیں تحقیق اور تنقید دونوں کو اپنے مزاج کے مطابق اپنانے اور برتنے کی تربیت ملی۔ ڈاکٹر صاحب نے مولانا علم الدین سالک سے تاریخ کا صحیح ذوق حاصل کیا۔ فارسی زبان و ادب اور بالخصوص شاعری کا ذوق صوفی غلام مصطفیٰ تبسم سے پایا۔ تجزیہ وتحلیل کے ضمن میں عابد علی عابد نے ان کی ذہنی وعلمی رہنمائی کی۔ تحقیق کے سلسلے میں مولوی محمد شفیع جیسے استاد کی رہنمائی حاصل رہی۔ قیوم نظر اور مولانا صلاح الدین احمد سے بھی انہوں نے استفادہ کیا۔ حلقہ اربابِ ذوق کی مجالس میں باقاعدہ شرکت کی بدولت کنہیا لال کپور، شیر محمد اختر، اور یوسف ظفر سے تعارف حاصل ہوا۔ ہنس راج رہبر اور نریش کمار شاد بھی انہی دنوں ادبی دُنیا میں متعارف ہوئے۔ جن سے ڈاکٹر صاحب کے بعد ازاں بہترین مراسم استوار ہوئے لاہور کی تہذیبی وعلمی فضا نے ڈاکٹر صاحب کی ادبی شخصیت کو نکھارا۔ یہاں انہیں فاضل اور جید اساتذہ کرام میسر آئے۔ جنہوں نے ان میں کلاسیکی روایات اور ادب سے لگاؤ پیدا کیا۔ لاہور ہی سے ڈاکٹر صاحب نے اپنے علمی و اَدبی سفر کا باقاعدہ آغاز کیا۔ لاہور علم و ادب کا مرکز ہی نہیں ایک منفرد اور یگانہ تہذیبی مقام اور دبستان بھی ہے۔ خود ڈاکٹر وحید قریشی اپنی شخصیت کی پرداخت میں لاہور کے کردار پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں:

''لاہور کی تہذیبی فضا میں شعراء، نقاد اور نامور اساتذہ کی قربت میسر آئی اور ادب وشعر کا بے پناہ لگاؤ پیدا ہو گیا۔ اس لیے اگر میں یہ کہوں کہ میری ادبی شخصیت کی تشکیل اور نشو ونما میں لاہور کا ہی ہاتھ ہے تو کوئی مبالغہ نہ ہو گا۔''۲

ڈاکٹر وحید قریشی کی شخصیت پر لاہور کی علمی و ادبی فضاؤں کے کئی طرح کے اثرات ہیں۔ ان کے والدین نے انہیں بڑے ناز ونعم سے پالا لیکن گھر سے باہر کی فضا سے تعلق پیدا کرنے سے گریز کرتے۔ اس کم گوئی نے ان کے قلب ونظر کو مطالعے کی طرف موڑ دیا۔ کم آمیزی کو سخن وری اور سخن فہمی کی جانب متعین کر دیا۔ لیکن ایف اے کے بعد یہ خول بھی ٹوٹا اور ڈاکٹر صاحب نے دوستوں سے بے تکلفی کو مشاعروں میں شرکت کر کے اپنایا۔ رفتہ رفتہ کالج کی ادبی مجالس میں شرکت نے انہیں ذاتی اور شخصی سطح پر سنورنے کے لیے سازگار فضا مہیا کر دی۔ یہ تو تھا ایف اے تک کا احوال۔ لیکن ۱۹۴۴ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے بی۔ اے (آنرز) فارسی ۱۹۴۶ء میں ایم فارسی اور ۱۹۵۰ء میں ایم۔ اے (تاریخ) کر کے ڈاکٹر صاحب نے علم وفضل کی شاہراہ پر قدم جمانے اور منزل کا رُخ متعین کرنے کا آغاز کیا۔ آپ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۰ء تک یونیورسٹی اورینٹل کالج میں الفریڈ پٹیالہ ریسرچ سکالر رہے۔ ۱۹۵۲ء میں Insha Literature in Persian- A critical study کے موضوع پر فارسی میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد ڈاکٹر صاحب فارسی علوم پر ایک معتبر حوالہ بن کر سامنے آئے۔ ۱۹۶۴ء میں ''میر حسن اور ان کا زمانہ'' کے موضوع پر ڈی لٹ اُردو میں حاصل کیا۔ باقاعدہ ڈگریاں حاصل کرنے کے علاوہ انہوں نے مولانا فیض الرحمٰن سے علم معانی و بیاں پڑھا اور عباس شوستری سے پہلوی زبان کے اسرار و رموز سمجھے۔

ماہنامہ ''محفل'' ڈاکٹر وحید قریشی نمبر کے مضمون ''زندگی نامہ ڈاکٹر وحید قریشی'' میں یوں درج ہے: ''۱۹۴۷ء تا ۱۹۵۰ء وہ الفریڈ پٹیالہ ریسرچ سکالر پنجاب یونیورسٹی رہے۔''۳

تعلیم حاصل کرنے کے بعد انہوں نے درس وتدریس کو اپنا پیشہ بنایا۔ جس کی تفصیل یوں ہے۔ ۱۹۵۱ء سے ۱۹۵۶ء تک اسلامیہ کالج گوجرانوالہ میں شعبۂ تاریخ کے صدر رہے۔ ۱۹۵۷ء میں اسلامیہ کالج سول لائنز لاہور میں شعبۂ تاریخ سے منسلک ہوئے۔

۱۹۵۸ء سے ۱۹۶۳ء تک اسی کالج میں صدر شعبۂ فارسی رہے۔ ۱۹۶۳ء میں یونیورسٹی اورینٹل کالج میں

اُردو کے لیکچرر کی حیثیت سے ان کا تقرر ہوا۔

تاریخ صد سالہ جامع پنجاب کے صفحہ ۳۵۸ پر رقم ہے کہ ڈاکٹر وحید قریشی کا تقرر اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی میں ۲۰ دسمبر ۱۹۶۲ء کو اُردو کے لیکچرر کے طور پر ہوا۔

۱۹۶۶ میں شعبۂ اُردو میں ریڈر (Reader) مقرر کیا گیا۔ ۱۹۷۵ء میں پنجاب یونیورسٹی میں شعبۂ اردو میں اُن کا تقرر ہوا۔ ۱۹۸۰ء میں اورئنٹیل کالج میں بحیثیت پرنسپل ان کا تقرر ہوا اور ۱۹۷۵ء سے ۱۹۸۰ء تک علوم اسلامیہ اور علوم شریعہ کی فیکلٹی کے ڈِین رہے۔ ۱۹۸۲ء میں ڈاکٹر صاحب اعزازی ڈائریکٹر اقبال اکیڈمی اور ۱۹۸۳ء میں مقتدرہ قومی زبان کے کُل وقتی صدر نشین کے عہدے پر فائز ہوئے اور ۱۹۸۷ء تک اس عہدے پر کام کرنے کے بعد ریٹائر ہوئے۔

چند سال بزمِ اقبال لاہور کا سربراہ رہنے کے بعد دوبارہ اقبال اکیڈمی کے کُل وقتی ڈائریکٹر مقرر ہوئے جہاں اپنے تقرر کی معیار پوری کرنے کے بعد جون ۱۹۹۷ء میں ملازمت سے فارغ ہو گئے۔

تخلیقی سفر کا آغاز ڈاکٹر صاحب نے ۱۹۴۳ء میں ایک نظم سے کیا پھر کچھ مضامین لکھے۔ بعد ازاں چند پنجابی نظمیں لکھیں جو گورنمنٹ کالج کے مجلّہ ''راوی'' میں چھپ گئیں۔ آپ حلقہ ارباب ذوق کے رکن بھی تھے اس حلقہ کے زیر اثر آپ نے ''شبلی کی حیاتِ معاشقہ'' اور ''میرا جی'' پر مضامین لکھے۔ ''ساقی'' اور ''امروز'' میں ان کی نظمیں چھپتی رہیں جن میں ادب میں اخلاقی پہلوؤں پر زور دیا گیا۔ علاقائیت کی نفی کی گئی۔ آپ رائٹرز گلڈ کی صوبائی شاخ کے سیکرٹری بھی رہے۔ شاعری میں ڈاکٹر وحید قریشی، احسان دانش اور حفیظ جالندھری سے متاثر رہے۔ قدیم شعراء میں حافظ غالب، نظیری اور عرفی سے بھی لگاؤ رکھتے تھے۔ انگریزی میں ایذرا پاؤنڈ اور ایلیٹ سے متاثر رہے۔ تنقید میں آئی اے رچرڈز کا مطالعہ کیا۔ لیکن مشرق میں فراق، نیاز فتحپوری، حسن عسکری اور کلیم الدین احمد کے مداح رہے۔ مختلف موضوعات پر ڈاکٹر وحید قریشی کی اَسّی سے زائد تصنیفات و تالیفات منظر عام پر آ چکی ہیں جن میں ترتیب و تدوین کے علاوہ درسی اور نظرثانی کردہ کتب بھی شامل ہیں۔ ان تمام کتب کا موضوعات کے اعتبار سے الگ الگ تذکرہ اور جائزہ آنے والے ابواب میں کیا جائے گا۔ مصوری کے میدان میں ان کے متبحر علمی کا جائزہ لینا مقصود ہو تو ''مخزن'' ۲۰۰۵ء کے شمارہ ۱۰ میں ڈاکٹر وحید قریشی کی رائے ملاحظہ ہو جو کہ کسی ماہر خطاط کی رائے معلوم ہوتی ہے۔

> مصورانہ خطاطی پچھلے چند برس سے پاکستان میں اہمیت اختیار کر گئی ہے۔ تین مصور سرفہرست رہے۔ اسلم کمال، بشیر موجد اور صادقین۔ اسلم کمال کی خطاطی کی بنیاد خط کوفی ہے۔ موجد نے خط ثلث خصوصاً طغرٰی نویسی کو اپنایا صادقین کے ہاں خط ریحان کو اساس بنایا گیا لیکن ہر مصوران خطوط کی سکہ بند پیمائشوں کے اسیر نہیں ہوئے۔ صرف بنیادی تاثر کو ہی لے کر آگے بڑھے ہیں اور کمال فن کا اظہار کیا ہے۔[۴]

اِس رائے کو پیش کرنے سے مقصود یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے جس راہ کو اختیار کیا۔ اس میں کمال فن حاصل کیا۔

''مخزن'' کی طرح وہ بے شمار دیگر جریدوں کے مدیر رہے مثلاً مجلّہ ''علمی'' لاہور ریسرچ سوسائٹی آف پاکستان اور ''صحیفہ'' لاہور مجلس ترقی ادب، مجلّہ تحقیق، لاہور جامعہ پنجاب، اورنٹیل کالج میگزین لاہور ''اقبال ریویو'' اُردو، انگریزی، فارسی لاہور، اقبال اکیڈمی پاکستان، اخبارِ اُردو اسلام آباد مقتدرہ قومی زبان، ''اقبال'' لاہور بزمِ اقبال مخزن، لاہور قائداعظم لائبریری وغیرہ۔

ڈاکٹر وحید قریشی نے اُردو اور فارسی زبانوں میں وسیع پیمانے پر تحقیق و تدوین تالیف وتصنیف، اور تنقید کے کارنامے سرانجام دیے۔ وہ کئی عظیم اشاعتی اور تحقیقی اداروں کے سربراہ رہے۔ وہ اپنی ذات کے اندر ایک محفل اور جیتی جاگتی تاریخ ہیں۔

نامور محقق ڈاکٹر گوہر نوشاہی جنھیں خوش قسمتی سے ڈاکٹر وحید قریشی کے عزیز طالب علم ہونے کا شرف بھی حاصل ہے، اپنے عظیم استاد کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں:

> میں ۱۹۵۸ء سے ۱۹۸۳ء تک یعنی ایف اے سے پی ایچ ڈی تک ڈاکٹر صاحب سے بہ حیثیت شاگرد مسلسل وابستہ رہا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب اس ربع صدی میں میرے لیے مثالی شخصیت تھے۔ میں نے زندگی میں جن چند لوگوں کی ذات کو اپنے لیے نمونہ قرار دیا ان میں سے ایک ڈاکٹر صاحب بھی ہیں۔ ان کی پچیس برسوں میں ڈاکٹر صاحب کی شخصیت اور سیرت کے مختلف پہلو میرے سامنے آئے بحیثیت مدرس، بطور استاد، اتالیق اور نگران، بحیثیت محقق اور صاحب علم و دانش۔[۵]

ڈاکٹر وحید قریشی کی اس ہمہ جہت شخصیت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ان کے سامنے زمانے کے کئی نشیب و فراز گزرے۔ سیاسی، تعلیمی و سماجی بیداری کا دور، جدوجہد آزادی کا دور، تقسیم، آزادی، قیامِ پاکستان نومولود ریاست، سیاست دانوں، بیوروکریسی اور فوجیوں کی سازشیں، فوجی انقلابات اکھاڑ پچھاڑ، علاقائیت، کرپشن، غیرملکی مفادات و مداخلت، مشرقی پاکستان کی علیٰحدگی اور بنگلہ دیش کا قیام، سیاست، صحافت و ادب علمی و ادبی سماجی تحریکیں سیاست اور تعلیم کی نمایاں شخصیات کو انہوں نے بہت قریب سے دیکھا۔ صاحب بصیرت اور صاحب علم و نظر شخصیت کی حیثیت سے اِن حالات کا مشاہدہ کیا اور ان پر غور و خوض کیا۔ پاکستان کی ادبی تاریخ علاقائی زبانوں کے فروغ اور قومی زبان کے نفاذ کے بارے میں ڈاکٹر صاحب کی رائے اور تجزیہ ماہرانہ ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے ہمہ جہت، علمی وتحقیقی زندگی گزاری۔ ان کے تجربات نے ان کی تحریر کو پختگی اور کمال فن عطا کیا۔ ان کی خدمات کے صلے میں حکومتِ پاکستان نے انہیں مختلف اعزازات سے نوازا۔ مثلاً ۱۹۸۴ء میں انہیں نیاز فتحپوری میڈل دیا گیا۔ ۱۹۸۶ء میں طفیل ایوارڈ سے نوازا گیا۔ ۱۹۹۳ء میں حکومت پاکستان کی جانب سے صدارتی تمغہ حسن کارکردگی دیا گیا۔ ۲۰۰۳ء میں اقبال شناسی کے حوالے سے حکومتِ پاکستان نے انہیں اقبال ایوارڈ عطا کیا۔ یہ ڈاکٹر صاحب کی اعتراف عظمت کا ثبوت ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی کی زندگی کی بے شمار جہات ہیں۔ جن کے بارے میں اندازہ لگانا قریب قریب ناممکن ہے۔ ممتاز مفتی اِس ضمن میں لکھتے ہیں:

> صاحبو! ڈاکٹر وحید قریشی پانی سمان ہے۔ صراحی میں ڈالو تو صراحی بن جائے گا۔ مٹی کے پیالے میں ڈالو تو پیالہ بن جائے گا۔ اسلام آباد پنڈی کی اَدبی محفلوں میں میں نے اسے مرصّع صراحی بھی بنتے دیکھا ہے اور جام سفال بھی۔ [۲]

ڈاکٹر وحید قریشی کے ادبی ماحول کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک سازگار ادبی دور تھا۔ جس میں ایک طرف حفیظ جالندھری اور احسان دانش کی شاعری کا چرچا تھا تو دوسری طرف قیوم نظر اور میرا جی کا فن عروج پر تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ الطاف گوہر اور اعجاز بٹالوی اپنے قدم جما رہے تھے۔ اِن کے پسندیدہ شعراء میں میرا جی، مجید امجد، ن م راشد اور اختر شیرانی شامل ہیں۔ حلقۂ ارباب ذوق بھی ڈاکٹر صاحب کے سامنے پروان چڑھا۔ آپ اس کے رکن بھی رہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی کے حوصلے اور فراخ دلی کی ایک مثال یہ

ہے جس کا تذکرہ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان یوں کرتے ہیں:

> ڈاکٹر وحید قریشی دوسروں کی خوبی کا کھلے دِل سے اعتراف کرتے ہیں ان جیسا عالی ظرف کرم فرما بہت کم دیکھنے میں آتا ہے۔ انہوں نے ممتحن کے طور پر بعض مقالوں کی رپورٹ میں یہاں تک لکھ دیا کہ فلاں موضوع پر طالب علم مجھ سے زیادہ واقفیت رکھتا ہے۔ ۷

ڈاکٹر وحید قریشی نے جس طرح شبلی کی حیات معاشقہ، کلامِ اقبال کے نفسیاتی عوامل اور غالب کی انانیت اور عصری خوف کو پیش کیا ہے اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ خود ڈاکٹر صاحب شخصیت اور اس کے Complexes میں گہری دِلچسپی لیتے ہیں۔ ان کی اپنی ذات کے حوالے سے اگر مختلف واقعات کا جائزہ لیا جائے تو ان کی شخصیت کے متفرق پہلو سامنے آتے ہیں۔ مثال کے طور پر ڈاکٹر صاحب اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھے۔ ان کی پرورش بڑے ناز و نعم اور توجہ سے کی گئی اس طرح ان کی نظر میں ان کی اپنی ذات زیادہ اہم ہو گئی۔ وہ بیرونی دُنیا سے کٹ کر Introvert بن گئے۔ کم گوئی کی عادت نے انہیں مطالعے کی جانب راغب رکھا اور مطالعے نے انہیں علمی و ادبی میدان میں بہت آگے تک پہنچا دیا۔ ان کی بلند ذہنی سطح، ان کی نفسیاتی داستان اسی داستان کی ذیلی کہانی کا حصہ ہے۔ ان کی آرزوؤں کی مثالی دنیا یہی ہے۔ جس میں اپنے اجداد کے سپہ گری اور پولیس کے پیشے سے ہٹ کر خیالی اور علمی و ادبی دُنیا بساتے ہیں۔ برتری کا احساس انہیں جدت طرازیوں پر مجبور کرتا ہے۔ ان کے لیے ان کے محبوب کی بجائے ان کی ذات اہم ہے۔ وہ عام روش پر چلنے سے گریزاں ہیں۔ برتری کے اسی ڈھکے چھپے احساس نے لاشعوری طور پر انہیں لکھنے پڑھنے کی جانب مائل رکھا۔ ادب ان کے لیے ذات سے فرار کا راستہ نہ تھا بلکہ اظہار ذات کا وسیلہ بن گیا۔ جذباتی زندگی کے مدوجزر نے انہیں متحرک رکھا۔ وہ کبھی دیہات کی کھلی فضا، خواب آگیں آسماں اور اس کے ستاروں کو اپنے مصرعوں اور نظموں میں ترازو کرتے ہیں۔ کبھی شہر کے شوروغل اور مشینوں کے دھوئیں کا احساس انہیں ناآسودگی کے اندھیروں میں دھکیل دیتا ہے۔ ان کا ذاتی اضطراب ان کی تخلیقات میں بھی جھلکتا ہے۔ کہیں سیاست سے کنارہ کشی اختیار کر کے اپنا جذباتی ردِعمل ظاہر کرتے ہیں اور کبھی آئیڈیل پسندی کا مظہر ان کی جدید روش نقد ونظر اور تحقیق کے نت نئے راستے دریافت کرنا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا مزاج ان کے آباؤ اجداد کے پولیس میں ہونے کی بدولت تحکمانہ

ہے۔ وہ ملازمت کے دوران مختلف نفسیاتی الجھنوں کا شکار رہے۔ وہ چومکھی لڑتے اور خود کو مضبوط کر کے علمی طور پر آگے بڑھتے اور خود کو نمایاں کرتے رہے۔ وہ کلاس روم میں باآوازِ بلند طلبا و طالبات سے مخاطب ہوتے۔ آواز کی بلندی گویا ان کی شخصیت میں خود پرستی اور خود پسندی کا ہی ایک رُخ ہے۔ پھر والدین کی ناز برداری نے انہیں اپنی شخصیت اور انا کو مضبوط بنانے میں مدد دی۔ انہوں نے کبھی زندگی میں شکست تسلیم نہ کی۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی کے ساتھ محکمانہ مسائل ہوں یا شہرت بخاری کے ساتھ بحثیں۔ ذہنی دفاعی محاذ نے ہمیشہ انہیں حالات کے مقابل ڈٹے رہنے پر مجبور کیا۔ انانیت کے حصار نے انہیں استحکام بخشا اور علمی و ادبی معرکے سرانجام دیتے رہے۔ انہوں نے گوناں گوں مصروفیات اختیار کیں اور رنگا رنگ زندگی بسر کی لیکن ریٹائرمنٹ کے بعد کئی امراض کی بنا پر بیرونی زندگی سے کنارہ کشی اختیار نہیں کی اور بے بسی و بیچارگی کو اپنے اوپر غالب نہیں آنے دیا۔ وہ ذہنی طور پر زندہ ہستی ہیں۔ اپنی تخلیقی قوتوں کی بنا پر وہ اعصابی انحطاط سے بچ گئے اور اپنی ذات کے خول میں نہ سمٹے۔

تنقید و تحقیق میں ان کے کام میں ایک رواں ہمواری ہے۔ کہیں جھنجھلاہٹ کا احساس نہیں ہوتا، ان کے ردِ عمل میں نرالا پن، احتجاج، تازگی اور وسیع تہذیبی شعور موجود ہے۔ ان کی تحقیق و تخلیق میں گردوپیش کے تہذیبی و تمدنی اثرات موجود ہیں۔ ان کے اظہار میں ندرت اور فکری توانائی ان کے گہرے اور وسیع مطالعے کی مرہونِ منت ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے اپنی ذہنی زندگی اور حقیقی زندگی کے فاصلوں کو ہمیشہ کم کرنے کی کوشش کی۔ اپنی نفسیاتی الجھنوں اور ذہنی تقاضوں کو مدنظر رکھ کر ان کے حل اور اسباب دریافت کیے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحقیق میں مواد اور اسلوب دونوں پر کڑی گرفت موجود ہے۔ ان کی زبان دانی، ہمہ جہتی اور شستہ مزاجی بے پناہ مقبولیت کی حامل ہے۔ ان کا عہد اکابر ادیبوں کا عہد تھا۔

انہوں نے ان سب اکابرین سے بھرپور استفادہ کیا۔ اپنی فربہی اور موٹاپے کی وجہ سے مشاعروں میں جانے سے کتراتے رہے۔ وہ معاشرتی اور سیاسی انتشار کو نثری نظم کے فقدان کا باعث قرار دیتے ہیں۔ شعراء میں ڈاکٹر وحید قریشی میرا جی، ن م راشد، فیض، ناصر کاظمی، مجید امجد، منیر نیازی، ظفر اقبال، اختر الایمان، انیس ناگی، شبنم رومانی، محمد اظہار الحق، اور عدیل سہیل کی شاعری کے مداح ہیں اور ان کو اس عہد کے نمایاں شعراء قرار دیتے ہیں۔ البتہ تنقید کے باب میں وہ عدم اطمینان کا اظہار کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں عملی تنقید تو بہت ہو

رہی ہے لیکن نظری تنقید نہ ہونے کے برابر ہے۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر سیّد عبداللہ، شمس الرحمٰن فاروقی اور ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر جمیل جالبی اور ڈاکٹر تبسم کاشمیری کی تنقید کے وہ دِل سے قائل ہیں۔

ڈاکٹر وحید قریشی کی اپنی تنقید امتزاجی تنقید ہے وہ نفسیات سے متاثر رہے۔ فرائڈ کے نقطۂ نظر سے انہوں نے ''شبلی کی حیاتِ معاشقہ'' تحریر کی۔ وہ ادب کو تاریخ کے پس منظر میں دیکھتے ہیں۔ سماجی تجزیہ بھی کرتے ہیں اور شخصی بھی۔ شخصیت کے تجزیے میں نفسیات کا استعمال بھی کرتے ہیں۔ فرائڈ، ایڈلر، میگ ڈوگل اور یونگ کا گہرا مطالعہ ان کی نفسیاتی تنقید کو بنیادیں فراہم کرتا ہے۔ ان کے تنقیدی کام برصغیر پاک و ہند کی آٹھ یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل ہیں۔ انہوں نے میر حسن، فورٹ ولیم کالج، غالب اور اقبال پر خصوصی کام کیا ہے۔

ڈاکٹر وحید قریشی نے ''میر جملہ لاہوری'' کے نام سے چار پانچ سال روزنامہ جنگ میں مزاحیہ کالم لکھے۔ جن میں طنز و مزاح کی چاشنی موجود ہوتی تھی۔ انہوں نے ریڈیو پر مزاحیہ تقاریر بھی کیں اور بچوں کے لیے بھی لکھا۔ انہوں نے ''پاکستان ہسٹاریکل ریڈرز'' میں صوفی عبدالعزیز، صوفی محبوب الٰہی اور محمد حفیظ کے ساتھ مل کر چھ کتابوں کا سلسلہ انگریزی زبان میں تحریر کیا ہے۔ جو بچوں کے نصاب میں شامل ہے۔ اس کے علاوہ پانچویں سے آٹھویں تک کے نصاب میں سیّد امتیاز علی تاج، مولانا غلام رسول مہر اور اسحاق جلال پوری کے ساتھ شرکت کی۔

ڈاکٹر صاحب خود اپنی ذات میں انجمن ہیں۔ ان کا کتب خانہ وسیع بھی ہے اور وقیع بھی۔ انہوں نے اپنی کاوشوں سے مقتدرہ قومی زبان کی رگوں میں زندگی کی لہر دوڑا دی اور اس ادارے نے پاکستان کے بڑے اشاعتی ادارے کی حیثیت سے نیک نامی حاصل کی۔ مغربی پاکستان اُردو اکیڈیمی، اقبال اکیڈیمی اور بزمِ اقبال نے بھی ڈاکٹر صاحب کی فکری اور انتظامی صلاحیتوں کے بل بوتے پر کامیابی کی نئی منازل طے کیں۔

☆☆☆

حوالہ جات (باب دوم)

۱ وحید قریشی ڈاکٹر، میں اور حالی۔ اُردو بک سٹال لاہور ۱۹۶۱ء۔ صفحہ ۵۔

۲ ڈاکٹر وحید قریشی کا انٹرویو۔ صلاح الدین ندیم ماہِ نو کراچی۔ دسمبر ۱۹۷۱ء، صفحہ ۵۔

۳ زندگی نامہ، وحید قریشی ماہنامہ ''محفل''۔ وحید قریشی نمبر فروری ۱۹۹۰ء، صفحہ ۲۹۔

۴ وحید قریشی ڈاکٹر، مدیر ''مخزن'' قائد اعظم لائبریری لاہور، شمارہ نمبر ۱۰، جلد ۵، ۲۰۰۵ء، صفحہ نمبر ۵۔

۵ گوھر نوشاہی ڈاکٹر۔ ڈاکٹر وحید قریشی شخصیت اور فن، اکادمی ادبیات پاکستان اسلام آباد، ۲۰۰۶ء، صفحہ ۲۷۔

۶ ممتاز مفتی۔ اوکھے اولڑے۔ فیروز سنز لاہور۔ ۱۹۹۵ء۔ صفحہ ۱۶۶۔ ۱۶۷۔

۷ وحید قریشی از ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان۔ ماہنامہ محفل وحید قریشی نمبر فروری ۱۹۹۰ء۔ صفحہ ۱۷۔

☆☆☆

باب سوم

ڈاکٹر وحید قریشی بحیثیت محقق

ڈاکٹر وحید قُریشی تحقیق کے میدان میں حافظ محمود شیرانی اور ڈاکٹر مولوی محمد شفیع کی روایت کے پیرو ہیں۔ انہیں ایسے اساتذہ کرام کی رہنمائی، رفاقت اور شفقت میسر آئی جو خود اپنی ذات میں دبستان کی حیثیت رکھتے تھے۔ مثلاً ڈاکٹر سید عبداللہ، سید عابد علی عابد، ڈاکٹر پروفیسر محمد اقبال، پروفیسر عباس شوستری، پروفیسر مولوی محمد شفیع صاحب، یہ وہ اکابر صاحبانِ علم تھے جنھوں نے ڈاکٹر صاحب کو فنِ تحقیق کے اسرار و رموز سمجھائے۔ ڈاکٹر صاحب کی نظر علوم شرقیہ پر گہری ہے۔ انہوں نے فارسی میں پی۔ ایچ۔ ڈی اور اُردو میں ڈی لٹ کیا تھا۔ اس کے علاوہ تاریخ اور نفسیات ان کے پسندیدہ مضامین ہیں۔ دورانِ ملازمت بھی ڈاکٹر صاحب کو تحقیقی اداروں کے سربراہ کی حیثیت سے کام کرنے کا موقع ملا۔ مثلاً ۱۹۷۵ء سے ۱۹۸۰ء تک علوم اسلامیہ اور علوم شرقیہ کی فیکلٹی کے ڈین کا عہدہ۔ ۱۹۸۲ء میں ڈاکٹر صاحب اعزازی ڈائریکٹر اقبال اکیڈیمی اور ۱۹۸۳ء میں مقتدرہ قومی زبان کے کل وقتی صدر نشین کے عہدے پر فائز ہوئے۔ چند سال بزم اقبال لاہور کے سربراہ رہنے کے بعد دوبارہ اقبال اکیڈیمی کے کل وقتی ڈائریکٹر رہے۔ انہوں نے اعلیٰ معیار کی تحقیقی کتب تصنیف کیں اور اس طرح حافظ محمود شیرانی، مولوی محمد شفیع اور ڈاکٹر سید عبداللہ نے تحقیق کی روایت کو نہ صرف آگے بڑھایا۔ بلکہ اس فن میں نئی سمتوں اور جہتوں کا سُراغ بھی لگایا۔ ڈاکٹر صاحب کی تحقیق کے بنیادی اوصاف میں موضوع کے اصل ماخذوں تک رسائی اور اُن سے درست نتائج کا استنباط شامل ہیں۔ ڈاکٹر وحید قریشی اپنے اسلوب تحقیق کے متعلق مطالعہ حالؔی کے مضمون ''میں اور حالؔی'' میں فرماتے ہیں:

> سید عابد علی عابدؔ ڈاکٹر اقبال مرحوم، ڈاکٹر سید عبداللہ اور عباس ابن محمد علی شوستری جیسے مختلف مذاق کے اساتذہ سے استفادہ کیا۔ ڈاکٹر اقبال ، ڈاکٹر سید عبداللہ اور شوستری صاحب نے تحقیق کے اصولوں سے باخبر کیا اور فارسی شاعری اور نثر کے مطالعے میں ایک خاص نہج پر ڈال دیا۔ شیرانی صاحب، شفیع صاحب اور ڈاکٹر اقبال صاحب نے

اورنٹیئل کالج میں ریسرچ کا ایک خاص دبستان قائم کیا تھا۔ ریسرچ میں میں ان سے متاثر ہوں۔ لیکن اسلوب میں ادبیت اور تنقید کی شمولیت کچھ عابد صاحب کی رہنمائی اور کچھ اپنے گذشتہ رجحانات کی مرہون منت ہے۔ اس زمانے میں ڈاکٹر عبداللہ صاحب کی تحریک پر میں نے اُردو تذکروں کو دیکھا اور ان پر مضامین لکھے۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ 'کٹھ ملائی' کا دور تھا۔ تنقید اور اس کے اصولوں سے بدکتے تھے اور زبان کی اس تبدیلی کو جو ۱۹۳۵ء کے لگ بھگ شروع ہو چکی تھی جسارت سے تعبیر کرتے تھے۔ عابد صاحب ان کے مقابلے میں دوسری انتہا پر تھے اور مجھے تنقید ہی کی طرف لے جانا چاہتے تھے۔ الحمد للہ کہ دونوں بزرگوں کی توقعات پوری نہ ہو سکیں اور میں نے اپنے لیے جدا راستہ بنا لیا۔ فارسی ادب کے شوق اور اُردو کی لگن نے نہ پوری طرح تحقیق کی طرف جانے دیا نہ میں پوری طرح تنقید ہی کا ہو سکا۔ آئندہ میرا مطالعہ ان دو راستوں پر تھا۔ میں نے دونوں نقطہ ہائے نظر کے امتزاج سے اپنی راہ نکالنے کی کوشش کی ہے۔[۱]

پاکستان میں تحقیقی مراحل کے دوران جیسی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر گوہر نوشاہی کو دیے گئے ایک انٹرویو میں فرماتے ہیں:

اُردو اور فارسی میں اَب تک جو بنیادی کام اس سلسلے میں ہونا چاہیے وہ نہیں ہو پایا ہر محقق کو خود کنواں کھود کر پانی پینا پڑتا ہے۔ یہ ایک غور طلب مسئلہ ہے۔ دوسرے ممالک کے محققین شاید اس صورتِ حال سے دوچار نہیں ہیں مثلاً آپ یورپ میں دیکھیں آپ اگر ٹی۔ ایس ایلیٹ پر کام کر رہے ہیں تو آپ کو اپنے موضوع پر بنی بنائی فہرست ماخذ مل جائے گی۔ اُردو اور فارسی میں ابھی تک اس طرح کا کوئی منظم اور جامع کام نہیں ہوا۔ اسی لیے ہر محقق کو یہ کام خود کرنا پڑتا ہے۔ تنقید میں زیادہ تر ٹھوکریں وہ لوگ کھاتے ہیں جو صحیح متن سامنے نہیں رکھتے۔ متنی نقاد اور متنی محقق کے لیے لازمی ہو جاتا ہے کہ وہ پہلے متن کو صحیح کرے اور پھر اس سے صحیح نتائج اخذ کرے۔[۲]

گزشتہ ربع صدی میں اُردو ادب کے منظر نامے میں جن محققین کو بطور محقق اور نقاد غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی ان میں ڈاکٹر وحید قریشی کا نام کئی پہلوؤں سے نمایاں ہے۔ ان کی کئی حیثیات پہلے سے مسلم تھیں۔

مثلاً استاد نقاد، مؤرخ، شاعر، ماہر ثقافت، فارسی وعربی سکالر، ماہر تعلیم اور علم و ادب کے دیگر متعدد شعبے جن میں ان کی خدمات نا قابلِ فراموش ہیں۔ ان کا کام کیفیت وکمیت کے اعتبار سے غیر معمولی نوعیت کی اہمیت کا حامل ہے۔ لیکن تحقیق کے حوالے سے ان کی غیر معمولی شہرت ''شبلی کی حیاتِ معاشقہ'' سے ہوئی۔ اِس کتاب میں ڈاکٹر صاحب نے شبلی کی زندگی کے واقعات کو ایک عام نقاد کی نظر سے دیکھنے کی بجائے نفسیاتی نقاد کی نظر سے پرکھا ہے اور ان کی زندگی کے واقعات کی توضیح پیش کی ہے۔ ان کے اندازِ تنقید وتحقیق میں جدت کا ایک پہلو یہ تھا کہ انہوں نے شبلی کی شخصیت کی تحلیلِ نفسی کے ساتھ ساتھ ان کی شاعری کے مختلف رنگوں میں ان کے کردار کو سمجھنے کی کوشش کی ہے اور ان کے اشعار کی نفسیاتی توجیہہ ان کے ذاتی، حالات کے رنگ میں پیش کرنے کی سعی کی ہے۔

ڈاکٹر وحید قریشی خود اس کتاب کے ابتدایے میں لکھتے ہیں:

> یہ مقالہ اب سے چار سال ادھر ''حلقۂ اربابِ ذوق'' میں پڑھا گیا تھا۔ اس کے بعد اسی سال ''کتاب'' اور پھر ''ادبی دنیا'' میں شائع ہوا۔ اب اسے ترمیم و اضافے کے ساتھ کتابی صورت میں پیش کیا جا رہا ہے۔[۳]

اس مضمون کی پہلی اشاعت کے بعد ادبی حلقوں میں بڑا ہنگامہ ہوا۔ اعتراضات اور جوابی مضامین میں محترمہ عطیہ فیضی کا مضمون بعنوان ''شبلی اور خاندانِ فیضی'' خالد حسن قادری کا نوے صفحات پر مشتمل مضمون جو نگار میں شائع ہوا۔ یادِ ایام کے سلسلے میں علامہ کی زندگی کے اس پہلو پر سید سلیمان ندوی کا ایک خط بھی نگار میں چھپایا گیا اور امین زبیری کی طرف سے اس پر کچھ اضافے بھی کیے گئے۔ امین زبیری کا مضمون بعد ازاں ایک چھوٹے سے رسالے کی شکل میں چھپا۔ جن پر بعض لوگوں نے تبصرے کیے۔ ان میں سے قاضی عبد الغفار مصنف ''شبلی کے خطوط'' عبد الماجد دریا آبادی مولوی احمد علی صاحب کے تبصرے قابلِ ذکر ہیں۔ شیخ محمد اکرام نے بھی شبلی نامے میں لکھا۔ ان اعتراضات کے جوابات ''شبلی کی حیات معاشقہ'' کے اختتام پر ڈاکٹر وحید قریشی نے مدلل انداز میں فرداً فرداً دیے ہیں۔ جن کا تذکرہ اس باب کے آخر میں آئے گا۔

شبلی کی حیات معاشقہ میں ڈاکٹر وحید قریشی نے نفسیاتی تحقیق کا اسلوب اپنا کر ایک نئی روش کی بنیاد رکھی ہے۔ ان کے ذہن اور ماحول کو سمجھ کر ان کی تخلیقات کا عمرانی، نفسیاتی اور تہذیبی تجزیہ کیا ہے۔ اس طرح

شبلی کے زمانے کی پوری روح سمٹ کر اس مضمون میں آ گئی ہے۔ یہاں پہنچ کر تحقیق اور تنقید یک جان ہو گئے ہیں۔ ڈاکٹر وحید قریشی دونوں کو ہمراہ لے کر چلے ہیں۔ ان کے اس مضمون میں حقائق کی کھوج کا درست اور منطقی انداز ملتا ہے۔ انسانی کمزوریوں کا غیر جانب دارانہ تجزیہ ڈاکٹر وحید قریشی کو ایک اہم نفسیاتی نقاد اور محقق بنا کر پیش کرتا ہے۔ انھوں نے شبلی کی سوانح نگاری سے لے کر شاعری تک تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ شبلی کے خطوط بنام عطیہ فیضی سے شبلی کی شخصیت کے نئے گوشے سامنے لائے ہیں۔ اس مضمون سے مولانا شبلی کے کردار کے نفسی اور شخصی پہلوؤں کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

مولانا شبلی نعمانی کی گذشتہ زندگی سے ڈاکٹر وحید قریشی نے کئی ایک واقعات کے ذریعے یہ ثابت کیا ہے کہ وہ نرگسیت کا شکار تھے۔ ان کی طبیعت کے بدلتے رنگوں میں ایک رنگ سیمابیت کا بھی تھا۔ مزاج کے تلون نے انہیں کبھی کٹھ ملا، کبھی انتہا پسند زمین دار، وکیل اور سرکاری ملازم بنا دیا۔ مذہبی رنگ جس شدت سے ان پر چڑھتا تھا اسی شدت سے اتر بھی جاتا تھا۔ اپنی شخصیت کو منوانے کے جذبے نے انہیں ہمیشہ ماحول سے متصادم اور زمانے سے برسرِ پیکار رکھا۔

ڈاکٹر وحید قریشی، علامہ شبلی نعمانی کی زندگی کا جائزہ اس طرح لیتے ہیں:

> علامہ شبلی اپنے بھائیوں میں سب سے بڑے تھے۔ گھر میں ان کی یہ پوزیشن ان کے طرزِ حیات کی طرف کھلا اشارہ کرتی ہے۔ لیکن ان کی نشوونما ایک سیدھے خط میں نہ ہو سکی۔ اس لیے ان کے (Character Trait) میں ہمیں ظفر مندی کے وہ آثار نہیں ملتے جو انہیں امن و اصلاح کا محافظ بنا سکتے۔ ان کی زندگی ایک مستقل جدوجہد رہی جس میں فتحیں کم اور شکستیں زیادہ تھیں۔ اپنی ان شکستوں کا شمار وہ ابتدائے حیات سے کرتے رہے۔ اس لیے اگر ان کی نرگسیت کو ایک ٹیڑھا خط تصور کیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔[۴]

علامہ شبلی کی ابتدائی تعلیم مشرقی طرز پہ ہوئی جب کہ بعد ازاں ان کے والد نے دیگر بھائیوں کی تعلیم انگریزی کی طرف متوجہ ہو کر کی۔ ان کے بھائی مہدی نے بیرونِ ملک سفر اختیار کیا۔ وکالت کا امتحان پاس کیا۔ لیکن علامہ شبلی کو ان سب کاموں میں ناکامی ہوئی۔ یہ وہ واقعات ہیں جنھوں نے شبلی میں شکستِ آرزو کے ماتم کی کیفیت پیدا کی۔ ان کے والد نے شبلی کے بچپن ہی میں دوسری شادی کر لی تھی۔ اس طرح وہ والد کے خلاف

ہوئے۔ ماں کی محبت ہر چیز پر غالب آئی اور شبلی کے کردار اور ذات کو تقسیم کر دیا۔ وہ شدید احساسات کے انسان ہو گئے۔ ان میں منفی طرزِ احساس اور انتہا پسندی نے جنم لیا جو بعض اوقات ان کے مقاصد کی کامیابی کی راہ میں رکاوٹ بنی اور کبھی ذہنی انتہا پسندی ان کے مقاصد کو عروج کی طرف بھی لے گئی۔ انہوں نے الکلام لکھی لیکن سر سید احمد خان کا ذکر تک نہ کیا۔ حالانکہ خود ان کے مقام تک پہنچنے کی ہمیشہ آرزو کرتے رہے۔ وہ ہمیشہ لیڈری اور مجلسی مقام کے خواہاں رہے۔ سرسید کی صحبت میں شبلی کی تربیت سے تنگ نظری کا غلاف اتر گیا تھا۔ اب وہ حسن و عشق کی رنگینیوں میں اپنے لیے جائے پناہ تلاش کر رہے تھے۔ ان کے اس رجحان کے ابتدائی آثار قیام حیدر آباد اور پھر اعظم گڑھ میں نظر آتے ہیں۔ اس کے تین مراکز تھے۔ ایک ابو الکلام کی ذات، دوسرے عطیہ بیگم اور تیسرے اور کوئی شخصیت جس کی تفصیلات 'شبلی کی حیاتِ معاشقہ' میں موجود نہیں ہیں۔ شبلی کے ان رجحانات میں بظاہر شک و تضاد پایا جائے لیکن اس کے در پردہ ایک ہی جذبہ کارفرما تھا اور وہ تھا اپنی ذات اور انانیت کا جذبہ ڈاکٹر وحید قریشی ان مشاغل کی نفسیاتی تعبیر یوں پیش کرتے ہیں:

> اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ شبلی میں کوئی تضاد یا مصنوعیت تھی۔ کیونکہ ان کی نرگسیت ان کے دنیوی مشاغل، علمی مشاغل، شاعری اور عورتوں کے عشق، لڑکوں کے عشق سب میں کارفرما نظر آتی ہے اور کہیں کوئی تضاد نہیں ہے۔ کیونکہ سب کا عمل ایک ہی ذہنی افق کا کرشمہ ہے۔[۵]

علامہ شبلی نعمانی کی پہلی بیوی کا انتقال ۱۹۰۰ء کے آس پاس ہوا۔ جس کے بعد وہ ایک اور خاتون سے شادی کے خواہاں تھے۔ لیکن ان کا عقد کہیں اور طے پا گیا۔ اس کے بعد ایک اور خاتون سے علامہ کی شادی ۱۹۰۰ء میں ہی ہوئی۔ لیکن ۱۹۰۵ء میں اس خاتون کا بھی انتقال ہو گیا اور مولانا پھر اکیلے رہ گئے۔ ان کی عائلی زندگی کے تذکرے کا مقصد یہ ہے کہ علامہ کی خانگی زندگی میں بھی استحکام نہ تھا۔ ان سانحوں کے بعد ہی مولانا ابو الکلام آزاد اور عطیہ بیگم سے بیک وقت ان کی محبت کا آغاز ہوا اور ان دنوں مولانا کا مزاج بھی بے حد رومانی تھا۔ مذہبی شغف میں انتہا پسندی باقی نہ رہی تھی۔ ڈاکٹر وحید قریشی اس پس منظر میں علامہ شبلی نعمانی کی ۱۹۰۶ء سے لے کر ۱۹۰۸ء تک کہی ہوئی غزلوں کا جائزہ لیتے ہیں۔ جو مولانا شبلی نے بمبئی میں قیام کے دوران کہیں۔ وہاں کی خوشگوار آب و ہوا اور من پسند صحبت نے شبلی کے تغزل کو رعنائی بخشی۔ یہ غزلیات پڑھ کر کوئی

شخص یہ اندازہ نہیں کر سکتا کہ یہ اس شخص کا کلام ہے جس نے سیرۃ النعمان، الفاروق اور سوانح مولانا روم جیسی کتابیں لکھی ہیں۔ یہ غزلیں نہیں بلکہ دو آتشہ شراب کی تاثیر رکھتی ہیں۔ ان کے الفاظ اور خیالات میں حافظ کی غزلیات کی دلربائی، رندی اور بے باکی ملتی ہے۔

مست و پر عربدہ تنگش بکشم در آغوش
تشنہ وصلم و تا کی بہ ہواہا باشم!
من ندانم بت شوخی کہ بہ ہنگام وصال
بمن آموخت خود آئین ہم آغوشی را
گوئیا دشمن ہم از ذوقش نصیبی بردہ است
بادہ وصلش چشیدم از مذاق افتادہ بود

ان غزلوں کے گہرے مطالعے سے ڈاکٹر وحید قریشی یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ علامہ شبلی کا عشق اول اول حجاب کی منزل میں تھا اور اپنے تخیل کے اعجاز سے ایسی غزلیات کہنے میں کامیاب ہوئے تھے لیکن بعد ازاں بمبئی آتے تو عطیہ فیضی کا آستانہ ہوتا اور پھر ندوے کے کاموں میں خود کو اُلجھا لیتے اور بمبئی سے بادل نخواستہ نکلتے۔ ڈاکٹر وحید قریشی جہاں وکیل کے طور پر شبلی کی غزلیات کے حصے پیش کرتے ہیں۔ وہاں انہوں نے ان کے خطوط کو بھی بنیادی ماخذ کے طور پر استعمال کیا ہے۔

علامہ شبلی نے متضاد مشاغل میں اپنی دلچسپیوں کے سامان تلاش کیے تو اس کے ساتھ ساتھ ان کی نرگسیت کے سیلِ رواں نے ندوے کے علمی کاموں عطیہ بیگم کے آستانہ محبت اور ابو الکلام آزاد کی دستار سب کو ایک ہی لہر میں پار کیا۔ ابو الکلام آزاد کی خط و کتابت مولانا شبلی سے عرصہ دراز سے ہو رہی تھی لیکن ان خطوط کی کوئی نقل موجود نہیں۔ البتہ یہ روابط موجود رہے اور علامہ شبلی نے ابو الکلام کو عالم السرائر کہا۔ اس مجاز کو حقیقت کا زینہ گردانا اور پھر شبلی نے ابو الکلام میں اپنی ذات کا عکس دیکھا تھا۔ اس نرگسی الجھاؤ کو ممتاز حسین نے غبار خاطر پر تبصرہ کرتے ہوئے ابو الکلام میں دکھایا بھی تھا۔ جسے خود ابو الکلام نے فسق و فجور کا نام دیا تھا۔ بہر حال ندوہ ابو الکلام اور عطیہ فیضی کے علاوہ شراب اور ساغر کا دور بھی تھا جس سے شبلی گزرے اور اس کا ذکر بھی کرتے دکھائی

دیتے ہیں۔

ے شبلی خراب کردۂ چشم خراب اوست
تو در گماں کہ مستی او از شراب بود

خطوطِ شبلی اور کلامِ شبلی وہ آئینہ ہے جس میں ان کی شخصیت جلوہ گر ہے۔ لیکن اس جلوہ گری کو دیکھنے کے لیے نفسیاتی اور عمرانی محقق اور نقاد کی نگاہ درکار ہے۔ ۱۹۰۶ء تا ۱۹۱۲ء کے زمانے کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر وحید قریشی اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ شبلی کی حیات معاشقہ کی ابتدا حادثۂ گزند پا کے بعد نہیں ہوئی۔ بلکہ ستمبر ۱۹۰۲ء میں لکھے ہوئے اشعار بھی اس وارداتِ قلبی کی عکاسی و نشاندہی کرتے ہیں۔

ے ای خوشا روز کہ رازم کند از پردہ برون
دست در دامن آں شوخ خودآرا باشم
دامن عیش زدستم نہ رود تا شبلی
دامن بمبئی از کف ندھم تاباشم
ساغر چند بیادِ رخ رنگیں خوردم
قدحی چند در آغوشِ گلستاں زدہ ام
ہر یکے تشنہ گرانِ عرب دھند و عراق
یم حسن است و منِ دل زدہ طوفاں زدہ ام

ان غزلیات میں کسی ملاقات کی یاد پوشیدہ ہے اور انہیں اشعار کی مدد سے ڈاکٹر وحید قریشی نے علامہ شبلی کی نفسیاتی تحلیل کی ہے۔ شبلی کی عطیہ فیضی سے اس دور تک ملاقات رہی لیکن اپریل ۱۹۰۷ء میں عطیہ یورپ میں تھیں اور علامہ اقبال سے ان کا میل جول شروع ہو گیا تھا اور وہ انہیں My dear Miss

Fyzee کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ وہ اپریل ۱۹۰۷ء میں یورپ کے دوسرے سفر سے لوٹیں اور اپریل ۱۹۰۷ء میں شبلی گھر لوٹے اور حادثہ گزند پاظہور پذیر ہوا۔ اس تفصیل کے سلسلے میں شبلی کے مکاتیب سے ڈاکٹر وحید قریشی نے یہ شعر نقل کیا ہے۔

دل کے بہلانے کی باتیں ہیں یہ شبلی ورنہ
جیتے جی مردہ ہوں مرحوم ہوں مغفور ہوں میں

اس دوران شبلی نے اعظم گڑھ میں قیام کیا۔ جنوری میں بمبئی آئے اور یہاں لکڑی کا پاؤں بنوایا اور بقول شبلی اس کے بعد ہی بمبئی کو شداد کی سی کیفیت کے ساتھ خیر باد کہا۔ اس زمانے میں عطیہ بمبئی میں موجود تھیں۔ اس دوران بھی عطیہ فیضی سے رسمی خط و کتابت جاری رکھی اور آپ کی بجائے 'تم' کی ضمیر استعمال کرتے کہ اس میں بے تکلفی تھی۔ جب کہ 'آپ' میں بیگانہ پن کی بوجھل فضا محسوس ہوتی تھی۔ اس زمانے میں مولانا کی شاعری کا رنگ بھی منفرد اور ویدنی تھا لیکن اس کے بعد مارچ ۱۹۰۸ء میں عطیہ کی بیماری کے سبب خطوط میں تاخیر کی کیفیت پیدا ہوگئی۔ اس کے بعد عطیہ یورپ روانہ ہو جاتی ہیں اور ۱۹۰۸ء میں ہی شبلی کا فارسی دیوان ''دستہ گل'' طبع ہوگیا۔ عطیہ کو یورپ سے واپسی پر اکتوبر ۱۹۰۸ء میں شبلی نے مبارک باد کا خط ان لفظوں میں لکھا۔ '' ایک بے ریا دل۔ ایک مخلص دل، وفا شعار دل کی طرف سے سفر سے مراجعت کی مبارک باد قبول ہو۔''[۷]

اس کے ساتھ تہنیت کی ایک غزل بھی ارسال کی اور اپنی ایک بتیس سال کی عمر کی تصویر بھی بھیجی۔ لیکن عطیہ فیضی کی جانب سے کوئی اشتیاق ظاہر نہ کیا گیا۔ جس پر مولانا شبلی کا ملال ان کے خطوط سے ظاہر ہوتا ہے۔ جن میں یہ گلہ کیا گیا ہے کہ یورپ سے واپسی کے بعد آپ ہم لوگوں کی سطح سے بالاتر ہوگئی ہیں۔ اسی زمانے میں اقبال کے خطوط بنام عطیہ فیضی میں خلوص اور رنگینی بڑھتی نظر آتی ہے۔ شبلی عطیہ کی بے نیازی کے شاکی ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس کی ذہانت اور مردانہ صفات کی دل کشی کے بھی معترف ہیں۔ عطیہ فیضی نے شبلی سے اپنے نام ایک تصنیف معنون کرانے کی خواہش بھی ظاہر کی اور مولانا کے دل میں کتنی آرزوئیں ہیں کہ چٹکیاں لیتی ہیں لیکن وہ اس کام کو کسی اور موزوں وقت پر اٹھا رکھتے ہیں۔ ۱۹ اگست ۱۹۰۹ء کو لکھتے ہیں کہ:

''تم کہتی ہو میں بدقسمت ہوں میری زندگی کے دو حصے ہیں۔ پرائیویٹ اور پبلک اگر

پبلک کام میرے ہاتھ میں نہ ہوتا تو میری ہمت کا اندازہ کر سکتی۔"[۸]

وہ اکتوبر کو بمبئی سے جنجیرہ پہنچے۔ مولانا کا عشق کامیابی کی حدوں کو چھو رہا تھا۔ خود ان کے اپنے کلام میں اس کا تذکرہ یوں کرتے ہیں:

ے کسی کو یاں خدا کی جستجو ہو گی تو کیوں ہو گی
خیالِ روزہ و فکر وضو ہو گی تو کیوں ہو گی
جو دو دن بھی بسر کر لے گا اس قصرِ معلیٰ میں
اسے خلدِ بریں کی آرزو ہو گی تو کیوں ہو گی
ہوائے روح پرور بھی یہاں کی نشہ آور ہے
یہاں فکرِ مے و جام و سبو ہو گی تو کیوں ہو گی

قیامِ جنجیرہ کے بعد ۱۷ اکتوبر ۱۹۰۹ء کو مولانا بمبئی پہنچے اور ذیل کا قطعہ لکھا۔

ے یاد صحبت ہائے رنگیں جو جزیرے میں رہیں
وہ جزیرے کی زمیں تھی یا کوئی میخانہ تھا

لطف تھا ذوقِ سخن تھا صحبتِ احباب تھی
مطرب و رود و سرود و ساغر و پیمانہ تھا
سبزہ و گل سے بھرا تھا دامن کہسار سب
غیرتِ خلد بریں ہر گوشہ ویرانہ تھا
نشہ آور تھی نگاہِ مستِ ساقی اس قدر

خود بخود لبریز ہے ہر ساغر و پیمانہ تھا

جزیرے کی صحبتوں کے خواب شبلی بیداری کے عالم میں بھی دیکھتے رہے۔ لیکن بعد ازاں کچھ امور میں مثلاً ندوہ کی بنیاد کا پتھر عطیہ کی بہن نازلی بیگم سے رکھوانا اور ملاؤں کی مخالفت کے بعد عطیہ کے غیض وغضب کا سلسلہ شروع ہوتا۔ مولانا نے کئی خطوط لکھے لیکن عطیہ فیضی کی جانب سے جواب موصول نہ ہوا۔ اب مولانا کے لیے یہ چشمہ سراب بن رہا تھا۔ دوسری طرف ملاؤں کی جانب سے لگائے گئے الزامات میں ابو الکلام آزاد کی محبت بھی شامل تھی۔ گویا آزاد کے ساتھ تعلقات میں بھی اتار چڑھاؤ آنا شروع ہوگیا۔ اسی دور میں شبلی نے یہ شعر کہا۔

عشقی ہنگامۂ نہ د نگاہی ذوقِ نی ے

نیست فتنہ کہ شہری بہ دای ای

عطیہ نے ایک یہودی سے شادی کر لی۔ اب شبلی کے جذبات کا طوفان تھم چکا تھا۔ یہاں ان کی شاعری کی علامتیں بدل جاتی ہیں۔ اس شکست کے ساتھ ندوہ کے میدان میں بھی شبلی شیخ الکل نہ بن سکے۔ شبلی کے خطوط، کلام، معاصر شہادتوں اور تاریخوں سے کام لیتے ہوئے ڈاکٹر وحید قریشی اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ:

> ندوے کی سیاسی بساط پر انہوں نے سماجی، معاشی، اقتصادی، سیاسی ہر طرح کے مہرے پھیلائے لیکن ہر جگہ ناکامی ہوئی۔ اس زمانے کی سیاسی شاعری طنز کے نشتر تھے۔ اُردو میں ان کے اشعار کا یہی پہلو انہیں اپنے معاصر شاعروں سے الگ کرتا ہے۔ ان اشعار کی برش اور تیزی سے بڑے بڑے سورما کترانے لگے کیونکہ امرت زہر میں تبدیل ہو چکا تھا اور زیرِ شاخ گل بلبل نہیں افعی سوتے تھے۔ ایسی عظیم شخصیت کا نوحہ ایسی طنزیہ شاعری ہی ہوسکتی ہے۔ شبلی ناکام جیے اور ناکام مرے۔ یہی ان کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ ہے اور یہی ان کی زندگی کا سب سے بڑا المیہ ہے۔[۴]

ڈاکٹر وحید قریشی نے غیر شخصی انداز میں شبلی کے اسلوبِ سوانح نگاری، ان کے احساس فخر و برتری ان کے خطیبانہ انداز اور ان کے کلام کی واقعیت کو پیش کر کے اس سے استخراجِ نتائج کا انداز اپنایا ہے۔ سادگی اور صفائی سے اس مقالے کی شان دوبالا ہوگئی ہے۔ ان کا اندازِ تحقیق استدلالی ہے۔ سنین اور تاریخوں کے ساتھ

واقعات ہیں۔ واقعات کی کڑیاں ملاتے ہیں۔ جس سے وہ اصل حقیقت تک پہنچ گئے ہیں۔ یہاں وہ ایک ایسے محقق کا رُوپ دھار لیتے ہیں جو سچائی کی دریافت اور حقیقت کا کھوج لگانے کے لیے ہر طرح کے ذرائع استعمال کرتا ہے اور کسی ایک ذریعے پر اعتماد یا بھروسہ نہیں کرتا۔ یہ ان کے اسلوب تحقیق کی پختگی ہے جو انہوں نے شبلی کی شخصیت کو یک رخا بنا کر پیش نہیں کیا۔ انہوں نے خارجی اور داخلی دونوں طرح کی شہادتوں کے سہارے اپنا فیصلہ بڑی دلیری کے ساتھ پیش کر دیا اور دیگر لکھنے والوں کو صلائے عام دے دی۔ انہوں نے صرف شبلی کے خطوط اور کلام کی مدد سے ان کی تصویر نہیں بنائی بلکہ معاصرین کے خطوط آراء، انٹرویوز، تخلیقات سے بھی مدد لی اور ان میں تاریخی ترتیب کا خیال رکھا۔ انہوں نے سوانح کی تشکیل کے لیے تصانیف کی مدد حاصل کی اور واقعات کی نفسیاتی گہرائی کا سراغ لگا کر ان حقائق کو دریافت کیا جو شبلی کی نفسیات کی تشکیل کرتے ہیں۔ انہوں نے تحقیق سے شبلی کی زندگی کا خام مواد لے کر اسے تاریخی پسِ منظر میں دیکھا۔ ان رجحانات کا جائزہ لیا جو شبلی کی شخصیت کی تعمیر کی اہم وجہ بنے۔ بلاشبہ ڈاکٹر وحید قریشی ایک ایسے محقق ہیں جو فارسی زبان و ادب کا گہرا مطالعہ اور شعور رکھتے ہیں۔ وہ تاریخ اور تہذیب پر بھی گہری نظر رکھتے ہیں۔ جمالیات، فلسفے، لسانیات اور زبان و بیاں کے اسرار و رموز سے واقف ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنی تحقیق میں ان تمام مضامین میں مہارت کا ثبوت دیتے ہوئے ان لوازمات کا خیال رکھا ہے جو کسی بھی تحقیقی مقالے میں ناگزیر خیال کیے جاتے ہیں۔ انہوں نے مولانا شبلی پر ایک مضمون لکھ کر اسی پر اکتفا نہیں کیا۔ بلکہ اس مضمون پر کیے گئے اعتراضات کو بھی اپنی کتاب کے آخر میں جگہ دی۔ یہ ان کی عظمت اور ظرف کی بلندی کی دلیل ہے۔ ایک بہترین محقق اعتراضات سے کبھی نہیں گھبراتا۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے ان اعتراضات کے جوابات بھی دیے ہیں۔

خالد حسن قادری کے اعتراضات کا ڈاکٹر صاحب نے جواب بڑے مدلل انداز میں دیا ہے۔ انہوں نے مہدی حسن کے خطوط شبلی کی اشاعت، اور سلیمان ندوی کے خطوط شبلی کی اشاعت امین زبیری کی کتاب تبصرۂ حیاتِ شبلی اور عطیہ فیضی کے خطوط ان سب کی روشنی میں ان اعتراضات کے جواب دیے۔ فرماتے ہیں کہ خالد حسن صاحب کے بگڑنے کی وجہ یہ تھی کہ وہ شبلی کو اپنے تصور اخلاق کی روشنی میں دیکھتے ہیں۔ اس دوران جو امران کے معیار سے متصادم ہوتا ہے۔ وہ اس کو گوارا نہیں کرتے۔ خواہ وہ حقیقت پر مبنی ہی کیوں نہ ہو۔ ڈاکٹر

وحید قریشی نے ''دستہ گل'' کے اشعار مثال کے طور پر پیش کر دیے اور نفسیات کے لیے فرائڈ کا نام تجویز کر دیا۔ اگر پڑھنے والے ان اصولوں کی روشنی میں پرکھیں تو انہیں اپنے اعتراضات کا واضح اور مدلل جواب مل جائے گا۔ پھر عطیہ فیضی کا تجاہل عارفانہ کہ انہوں نے شبلی کے واضح اشارات کو نہ صرف قبول کیا بلکہ ان کے اشعار کی داد بھی دی۔ وہ شبلی کی آتشِ عشق سے نہ صرف باخبر تھیں بلکہ ۱۹۱۰ء سے پہلے تک انہوں نے شبلی کی حوصلہ شکنی نہ کی۔ اپنے مضمون میں جو جولائی اگست ۱۹۴۶ء میں شائع ہوا اس میں دلائل سے زیادہ جذبات سے کام لے کر مولانا شبلی کی ذات کے بارے میں بعض ناواجب الفاظ کا استعمال کیا۔ اگرچہ شبلی کے خطوط اور اشعار سے شبلی کی داخلی کیفیات کا پتہ چلتا ہے جن سے عطیہ فیضی نے خود کو لاعلم قرار دیا ہے۔ حالانکہ اقبال اور شبلی جیسی نابغہ روزگار ہستیوں نے عطیہ فیضی کو ذہین و فطین قرار دیا تھا۔

ڈاکٹر وحید قریشی کی ایک اور تحقیقی کاوش 'باغ و بہار' کا تجزیہ ہے۔ جس میں انہوں نے ایک خاص تہذیب کو اس عہد کے آئینے کی روشنی میں دیکھا اور پرکھا ہے اور ایک خاص عہد کے اجتماعی لاشعور کے پس پشت پوشیدہ محرکات کا جائزہ لیا ہے۔ اس دور کے افراد کے حالات اور ماحول کو خارجی اور تہذیبی عناصر کی روشنی میں دیکھا ہے۔ ادیب کی شخصیت اور رویے پر بحث کرتے ہوئے غیر جانبداری اور سائنسی اندازِ تحقیق سے تجزیہ کیا ہے۔ باغ و بہار اور میرامن کے انداز کا یہ تجزیہ بغیر گہرے سماجی اور نفسیاتی شعور کے نہیں کیا جا سکتا اس دور کی خصوصیات اور داستان کی علامتوں کا زندگی کے نئے نظام کے ساتھ مصنوعی رشتہ استوار نہیں کیا جا سکتا۔ جب تک الفاظ، لغات اور تراکیب کے برمحل استعمال کے بارے میں معلومات نہ ہوں۔ عام فہم الفاظ عوامی زندگی کی روزمرہ کا دین ہوتے ہیں۔ سینکڑوں تجربات و حوادث کو نئی تخلیقی شکل میں پیش کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے علامتوں، تشبیہوں اور الفاظ کے ذخائر میں پوشیدہ حقائق کا تجزیہ منطقی دلائل کے ساتھ کیا ہے۔ لفظوں کی خاص نفسیات اور صوتیاتی حسن کا مشاہدہ بڑی گہرائی کا حامل ہے۔ ان کی تشریح و تجزیہ کا انداز سماجی تنقید اور عمرانی تنقید کی بنیاد پر قائم ہے۔ یہاں آ کر تحقیق اور تنقید ایک ہو جاتے ہیں اور دونوں کی مغائرت ختم ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے تحقیق کے دوران سماجی اسباب اور واقعات سے بھی رشتہ جوڑا ہے اور سماجی تحقیق کے لیے کلچر کا مطالعہ بھی کیا۔ وہ تاریخ دان اور تاریخی دستاویزات کے ماہر ہیں۔ انہوں نے باغ و بہار کی داستان کے حسن و قبح پر بحث کرنے سے قبل ایک محقق

کی نگاہ سے درج ذیل امور کا سراغ لگایا ہے۔

۱۔ میرامن کس دور سے تعلق رکھتے ہیں؟

۲۔ باغ و بہار کی داستان کے تار و پود میں میرامن کا کتنا ہاتھ ہے۔

۳۔ قصے کا خالق کون ہے؟

۴۔ اس کے مختلف اجزاء کس زمانے سے تعلق رکھتے ہیں؟

یہاں تاریخ اور نفسیات ڈاکٹر وحید قریشی کے ہم رکاب ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ داستانیں ہمارا اجتماعی لاشعور ہیں۔ جن میں انسانی شعور روزمرہ کی زندگی کی کوتاہیوں کو پورا کرتا ہے۔ سماجی رکاوٹوں (Social Taboos) کا مقابلہ کرتا ہے۔ اس طرح زندگی انسان کے لیے آسان اور قابلِ فہم بن جاتی ہے۔ انسان کوشش کر کے بہروپ کے نیچے چھپے ہوئے (shadow) کو بھی سامنے لاتا ہے۔ ایسے میں اجتماعی لاشعور کے ذریعے ذہنی میراث ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل ہوتی ہے۔

ڈاکٹر وحید قریشی کا تاریخی شعور باغ و بہار کے تجزیے میں پوری طرح کارفرما ہے۔ لکھتے ہیں:

> باغ و بہار میں جن عقائد، جن خیالات، جن اخلاقی نکات کو بیان کیا گیا ہے۔ وہ میرامن کے دور کا مشترک طرزِ احساس ہے۔ وہ ایسی امانت ہے جس کا رشتہ بہت دور تک ماضی میں چلا گیا ہے۔ قبلِ اسلام کی ہندوانہ فضا، عباسی دور کا بغداد، بابر سے قبل کا آگرہ مغلوں کے دلی کے نقوش، بغداد، بصرہ، استنبول کے گلی کوچوں میں پائے جاتے ہیں۔ مغل تمدن نے زندگی کو بھی آرٹ بنا دیا تھا۔ ان پر مستزاد وہ تہذیبی زوال ہے جو محمد شاہی عہد میں ایک نقطۂ خاص پر پہنچ گیا تھا۔ باغ و بہار اس زوال کی نقیب بھی ہے۔[۵]

ڈاکٹر وحید قریشی نے ایک خاص عہد کے کلچر اور تہذیب پر تحقیق کرتے ہوئے اقدار کی بازیافت اور تمدنی زندگی کے نظام کی پرکھ بھی کی ہے۔ اس طرح اس سماجی زندگی کی معنویت کا سراغ لگایا گیا ہے جو اس دور کے واقعات اور اسباب و علل کی تشکیل کرتی تھی۔

میرامن کے سن پیدائش کا تعین کرنے کے لیے ڈاکٹر وحید قریشی نے 'باغ و بہار' میں میرامن کے

حالات، گنج خوبی کے دیباچے، گلکرسٹ اور اس کا عہد، عتیق صدیقی، میر حسن اور ان کا زمانہ از وحید قریشی، Origins of modern Hindustani Literature and source material: Gilchrist Letters سے مدد لی ہے۔ یوں بیرونی شہادتوں کے ساتھ ساتھ ادب کی داخلی شہادتوں کو اپنے تحقیقی عمل میں بروئے کار لائے ہیں۔محتاط اندازے کے مطابق میر امن کا سن پیدائش محمد شاہی دور کے بعد کا ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے میر امن کے حالات زندگی کے حوالے باغ و بہار اور گنجِ خوبی کے دیباچوں سے حاصل کیے ہیں۔ میر امن نے باغ و بہار کے دیباچے میں اردو زبان کے آغاز کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ گنج خوبی کے دیباچے میں میر امن اپنے بارے میں یوں رقم طراز ہیں:

> خداوند نعمت، صاحب خلق و مروت، جان گلکرسٹ صاحب نے کہ زبان اردو کے قدردان اور فلک زدوں کے فیض رساں ہیں۔ اس بعید الوطن میر امن دلی والے کو لطف وعنایت سے فرمایا کہ اخلاقِ محسنی جو فارسی کتاب ہے۔ اس کو اپنی زبان میں ترجمہ کرو تو صاحبانِ عالی شان کے درس کی خاطر مدرسے میں کام آوے۔ ٦

اسی طرح فورٹ ولیم کالج کی رودادوں سے بھی اس دور میں پیش آنے والے واقعات کے سنین کا جائزہ لیا جا سکتا ہے۔ میر امن معمولی شدبد کے شاعر تھے۔ انہوں نے گنج خوبی کے دیباچے میں لطف نامی شاعر کے اشعار نقل کیے اور باغ و بہار میں بھی اسی لطف کے اشعار پیش کیے۔ ان کے حالات یہ ہیں کہ دلی میں سورج مل جاٹ کے حملے کے بعد جواہر سنگھ کے حملے سے جاٹ گردی شروع ہوئی اور پھر احمد شاہ درانی (ابدالی) نے دلی پر پہلا حملہ (١١٧٠ تا ١١٧١ھ) میں کیا۔ دلی میں خوف و ہراس کی وجہ سے دلی کے امراء روسا نقل مکانی پر مجبور ہوئے۔ میر امن دلی سے نکلے اور عظیم آباد آئے۔ ازاں بعد کلکتے کی راہ لی۔ اتفاقاً دلاور جنگ نے بلوا کر اپنے چھوٹے بھائی میر محمد کاظم خاں کی اتالیقی کے واسطے مقرر کیا۔ دو سال تک وہاں قیام کیا۔ پھر ازاں فورٹ ولیم کالج سے متعلق ہوئے۔ جہاں میر امن کا تقرر میر بہادر علی حسینی کے توسط سے عمل میں آیا۔ گلکرسٹ شعبہ ہندوستانی کے صدر تھے۔ میر امن کب تک فورٹ ولیم کالج سے متعلق رہے اور ان کا انتقال کب ہوا؟ تفصیلات میسر نہیں ہیں۔ البتہ ممتاز حسین باغ و بہار کے دیباچے میں تذکرہ ہمیشہ بہار از نصراللہ خان قمر خورجوی اور مواقیت الفواتح از مولوی مجتبیٰ علی خان گوپاموی کے حوالے سے میر امن کا انتقال بیان کرتے ہیں۔ اس ضمن

میں ڈاکٹر وحید قریشی نے سنین اور فورٹ ولیم کالج کی کارروائیوں سے مواد اخذ کیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے۔ نصر اللہ خورجوی کے تذکرہ ''ہمیشہ بہار'' کا مؤقر مجموعہ نسخہ ترقی اردو بورڈ کراچی کے کتب خانے میں ہے۔ اسے ڈاکٹر اسلم فرخی نے انجمن ترقی اُردو کراچی کی طرف سے شائع بھی کرایا ہے یہ تذکرہ میرامن کے ذکر سے خالی ہے۔ میرامن کی پیدائش کے سال کے سلسلے میں ممتاز حسین اور ممتاز منگلوری نے آبِ حیات کے بیان کی مدد لی ہے اور یہ سال محمد شاہ (۱۱۳۱ ہجری تا ۱۱۶۱ ہجری) بتایا ہے۔ لیکن ڈاکٹر وحید قریشی کے خیال میں آب حیات کا بیان کسی مؤثر شہادت کے بغیر قابلِ قبول نہیں۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے گنج خوبی اور 'باغ و بہار' کے داخلی قرینوں کو مستند اور قابلِ اعتماد کہا ہے اور ایسی شہادتیں اور داخلی حوالے تلاش کیے ہیں۔ جن کی مدد سے میرامن کی زندگی، شخصیت اور احوال کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے داخلی شہادتوں سے یہ حقائق ثابت کیے ہیں کہ میرامن کثیر العیال شخص تھے۔ گنج خوبی کا دیباچہ اور 'باغ و بہار' کا حوالہ اس ضمن میں ان کے مآخذ ہیں۔ باغ و بہار کے خاتمے کا قطعہ یوں نقل کرتے ہیں۔

میں اس کے سوا چاہتا کچھ نہیں
یہی ہے دعا میری اے کردگار
تری یاد میں میں رہوں دم بدم
کٹے اس طرح میرا لیل و نہار
نہ پرسش کی سختی ہو مجھ پر کبھی
نہ شب گور کی اور نہ روز شمار
تو کونین میں لطف پر لطف رکھ
خدایا بحق رسول کبار

میرامن کے عہد کو ان کی تخلیق 'باغ و بہار' کی طرزِ معاشرت میں بھی تلاش کیا جا سکتا ہے۔ یہ محمد شاہی دور کی فراغت ہے جو کبھی لوٹ کر نہ آئی اور اگر میرامن نے یہ عہد نہ دیکھا ہوتا تو اس کی اتنی زندہ تصویر کیونکر

کھینچ سکتے تھے۔ انھوں نے تاجروں کی خوشحالی، دعوتوں اور ضیافتوں کے اہتمام، مے نوشی، حسینوں کے زمزموں میں آداب مجلس کے قرینے تلاش کیے ہیں۔

ڈاکٹر وحید قریشی نے محمد شاہی عہد کی قید ضروری قرار نہیں دی۔ میرامن نے جس طرزِ معاشرت کی تصویر کشی کی ہے۔ اس کا تھوڑا حصہ میرامن کی ذات سے متعلق ہے۔ انہوں نے تحسین کی نوطرزِ مرصع کا سہارا بھی لیا ہے۔ جس کی بنیاد فارسی قِصہ چہار درویش پر ہے۔ محمد شاہی عہد اور میرامن میں جو بُعد پایا جاتا ہے۔ اس کے اختلاف کو ڈاکٹر وحید قریشی تاریخی حوالوں سے ثابت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> تاریخوں سے ظاہر ہے کہ محمد شاہی عہد کا نصف اول امن و آشتی کا ہے۔ ۱۱۴۰ھ میں دلی پر مرہٹوں کی پہلی یورش ہوئی۔ ۱۱۵۰ھ میں نادر بادشاہ کا حملہ ہوا اور بعد ازاں محمد شاہی دور میں بھی امن و امان نہ رہا۔ اس لحاظ سے تو میرامن کو ۱۱۴۰ھ سے بہت قبل پیدا ہونا چاہیے کہ وہ محمد شاہی دور کی شان و شوکت کا آنکھوں دیکھا حال بیان کر سکے۔ اسے ۱۱۴۰ء سے قبل سن شعور کو پہنچنا ہوگا۔ پیدائش ۱۱۳۱ء سال تخت نشینی محمد شاہ ہی فرض کریں۔ جب بھی ۱۱۴۰ھ تک وہ بمشکل گیارہ برس کا ہوگا۔ ۱۲۱۷ھ میں اس کی عمر (۱۱۳۱ تا ۱۲۱۵) کم از کم چوراسی برس ہو جائے گی۔ یہ بات قابل تسلیم نہیں کہ عمر رسیدہ حالت میں اسے فورٹ ولیم کالج میں ملازمت ملی ہو۔ [۱۲]

ان حقائق اور تواریخ کی مدد سے ڈاکٹر وحید قریشی اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ میرامن یا تو محمد شاہی عہد کے بالکل آخر میں یا اس کے بعد احمد شاہی دور میں پیدا ہوئے ہوں گے۔ اب باری آتی ہے میرامن کی فورٹ ولیم کالج میں ملازمت باغ و بہار اور گنج خوبی کی اشاعت کی تکمیل کے عہد کے تعین کی۔ اس ضمن میں ڈاکٹر وحید قریشی عتیق صدیقی کی کتاب گلکرسٹ اور اس کا عہد کا حوالہ دیتے ہیں۔ گنج خوبی کی اشاعت کی تکمیل ۱۹ اگست ۱۸۰۳ء تک ہو چکی تھی۔ باغ و بہار کی تکمیل داشاعت کے بارے میں سند کی بحث ابھی تفصیل طلب ہے۔ قِصہ چار درویش کی کاپیوں کی اشاعت کی تعداد ۵۰۰ تھی۔ جب کہ اس کا رسم الخط فارسی میں تھا۔ فورٹ ولیم کالج کی کارروائیوں کے رجسٹر کے مطابق اس کا نام چار درویش تھا اور پہلی بار اس کے ۱۰۲ صفحات اسی نام سے شائع ہوئے۔ میرامن نے اس کا تاریخی نام، باغ و بہار، رکھا۔ اسی نام سے یہ کتاب ۱۸۰۳ء میں ہندوستانی پریس

کلکتہ سے شائع ہوئی۔ اس ضمن میں ڈاکٹر وحید قریشی نے انڈیا آفس کے مخطوطات، فورٹ کالج کی کارروائیاں اور عتیق صدیقی کی کتاب 'گلکرسٹ اور اس کا عہد' سے استفادہ کیا ہے۔ اس ضمن میں 'باغ و بہار' کے اعداد کو بھی مدنظر رکھا گیا ہے جن کے مطابق اس کا سنہ تالیف ۱۸۰۲ء ہے۔ کالج کونسل کی کارروائی کے رجسٹر کے مطابق میرامن دہلوی کا تقرر ۱۹ اپریل ۱۸۰۱ء کو عمل میں آیا تھا۔ ان حقائق کو پیش کرنے کے بعد ڈاکٹر وحید قریشی فرماتے ہیں:

> اس سلسلے میں ایک امکان ظاہر کر دینا ضروری ہے اور وہ یہ ہے کہ جنوری ۱۸۰۲ء میں اور کتابوں کے ساتھ ساتھ چار درویش کی طباعت بھی ملتوی کر دی گئی تو اس وقت میرامن نے چار درویش کے مسودے پر نظر ثانی کر کے اس کو "باغ و بہار" بنایا ہو اور اسی مناسبت سے اس کا سنہ تالیف ۱۲۱۸ھ مطابق ۱۸۰۲ء قرار دیا ہو۔[۱۳]

یہ قِصہ اُردو میں ترجمہ ہونے سے پہلے فارسی زبان میں قصہ چہار درویش کے نام سے مقبول تھا۔ اس کی تصنیف کا ایک سبب ڈاکٹر گلکرسٹ نے باغ و بہار کے مقدمے میں یہ بیان کیا ہے کہ ایک دفعہ امیر خسرو کے پیر و مرشد حضرت نظام الدین اولیاء کی طبیعت ناساز ہوئی۔ تب ان کا دل بہلانے کے لیے امیر خسرو نے یہ قصہ فارسی زبان میں کہا۔ اس کا ترجمہ اُردو زبان میں میر عطا حسین خان تحسین نے کیا اور اس کا نام نو طرزِ مرصع رکھا۔ لیکن اُردو زبان کے لحاظ سے یہ ترجمہ ناقص تھا کیونکہ اس میں اُردو کے کم اور عربی و فارسی محاوروں کی بہتات تھی۔ اس پر میرامن نے اس کا اُردو Version پیش کیا۔ لیکن ڈاکٹر گلکرسٹ کا یہ کہنا کہ یہ قصہ امیر خسرو کی تصنیف ہے۔ اس پر ڈاکٹر وحید قریشی نے حافظ محمود شیرانی کے مقالات سے استفادہ کیا ہے۔ شیرانی صاحب کے بقول حضرت نظام الدین اولیأ کے حالات و مقامات میں اس کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ اس کتاب میں فرنگیوں کا ذکر ہے جن کا وجود خسرو کے زمانے میں نہ تھا۔ اسی طرح دوربین کا ذکر ہے جس کا رواج یورپ میں بھی سترہویں صدی عیسوی میں ہوتا ہے۔ چنانچہ امیر خسرد کی تصانیف کے ذیل میں اس کا کوئی مؤثر ثبوت مہیا نہیں ہوتا۔

ان دلائل کے بعد ڈاکٹر وحید قریشی محمود شیرانی کا قول نقل کرتے ہیں:

> یہ بعض امور ہیں جو اس کتاب کے سرسری مطالعے کے وقت ہماری نظر سے گزرے

ہیں۔ ان میں اکثر و بیشتر ایسا مواد ہے جو کتاب کو امیر خسرو کے ساتھ وابستہ کرنے کے بجائے اس کے جدید العہد ہونے کی شہادت پیش کر رہا ہے۔[۱۴]

حافظ محمود شیرانی کو یہ شبہ ہے کہ شاید اس قصے کو مقبول عام بنانے کے لیے دروغ مصلحت آمیز والا حیلہ تراشا گیا ہوگا۔ ڈاکٹر گیان چند نے بھی ''اُردو کی نثری داستانیں'' میں تحقیق سے یہ ثابت کیا ہے کہ امیر احمد کا متن میرامن سے بعد کا ہے۔

ڈاکٹر وحید قریشی نے بھی بعد از تحقیق دلائل سے ثابت کیا کہ بارہویں صدی سے قبل یہ قصہ تحریری صورت میں موجود نہ تھا۔ اس کا قدیم ترین نسخہ باڈولین لائبریری سے ملا۔ نوطرز مرصع کے بعد اُردو میں یہ قصہ ہمیں میرامن اور محمد غوث زریں کے ہاں ملتا ہے۔ میرامن ۱۸۰۱ء میں فورٹ ولیم کالج میں مقرر ہوئے اور اسی سال انہوں نے نوطرزِ مرصع کو سلیس اُردو میں ڈھالا۔ ۱۲۱۷ھ میں کتاب کا مسودہ کتابی شکل میں شائع ہونے کے لیے ہندوستانی پریس میں گیا۔ محمد غوث یا محمد عوض زریں نے بھی اسی سال یہ قصہ اُردو نثر میں لکھا۔

ڈاکٹر وحید قریشی نے 'باغ و بہار' کا سن تصنیف، ماخذ اور دیگر معاملات کو شواہد کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ قِصہ چہار درویش ایک ہندی الاصل داستان ہے یا فارسی الاصل؟ اس ضمن میں انہوں نے دیگر محققین کی آراء کی روشنی میں ذہن میں پیدا ہونے والوں سوالوں کا جواب تلاش کیا ہے۔ مثلاً حافظ محمود شیرانی کا باغ و بہار کے فارسی نسخے کا تجزیہ، گیان چند کا اُردو کی نثری داستانیں اور پھر نوطرزِ مرصع اور باغ و بہار کا موازنہ۔ خاص طور پر اس موازنے میں دلی کی معاشرت اور طرزِ بود و باش کے بارے میں تقابل وغیرہ۔ اس ضمن میں میرامن کے طرزِ زندگی اور معاشرتی احساس کو خراجِ تحسین پیش کیا گیا۔ اس طرز زندگی کی تصویریں تحسین کی نوطرزِ مرصع میں بھی موجود ہیں لیکن میرامن نے اس کہانی کو سطر بہ سطر آسان اُردو میں منتقل نہیں کیا۔ کہیں کہیں ردو بدل موجود ہے لیکن میرامن کی فنی بصیرت کی داد نہ دینا بھی زیادتی ہے۔

اس کے علاوہ ڈاکٹر وحید قریشی کے خیال میں 'باغ و بہار' تک آتے آتے اس داستان کی فنی و فکری تشکیل میں ان تمام ادیبوں کا ہاتھ بھی ہے جو قصہ چار درویش کے تمام داستان گو ہیں۔ ان کے علاوہ تحسین کی نوطرزِ مرصع کی تمام فنی و فکری خصوصیات 'باغ و بہار' کا جزو لاینفک بن گئی ہیں۔ افراد کے مخصوص ادبی عقائد اور تعصبات بھی اس داستان میں موجود ہیں اور عصری شعور کا اظہار بھی موجود ہے۔

یہ قصہ طبقہ امرأ کی نمائندگی کرتا ہے۔ شہزادے، شہزادیاں، تاجر اور سوداگر اس کے بنیادی اور مرکزی کردار ہیں جن کے گرد کہانی کا تانا بانا گھومتا ہے۔ کہانی کے کردار مُبہم جُو ہیں۔ محمد شاہی عہد کا داستان گو ہو یا احمد شاہی دور کا تخیل کے بل بوتے پر ہی اپنے معاشرے اور گردو پیش کا نقشہ پیش کرتا ہے۔ اس میں کچھ تخیل اور کچھ مشابہت پسندی کا عنصر بھی موجود ہوتا ہے اور پھر معاشرے کی تصویر بھی ان کی نظر کے سامنے ہوتی ہے۔ جس کے مختلف اجزاء کو چن کر ایک مکمل تصویر بناتے ہیں۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے اس داستان کے اجزأ سے اس عہد کے رویوں کا سراغ لگایا ہے۔ بادشاہوں کا کردار کیسا ہوتا ہے۔ ان کے ملک کی خوشحالی کا دارومدار کس بات پر ہوتا ہے۔ نیکی کی فتح اور برائی کی شکست ہر دور میں ہوتی ہے۔ یہ تمام پہلو اس داستان کے تجزیے کے دوران ڈاکٹر وحید قریشی کے مدنظر رہے ہیں۔ وہ تخیلی دنیا جس میں امن و امان کا دور دورہ ہے۔ جہاں اخلاقی قدروں کا بول بالا ہے۔ انسانوں میں وفا کی کمی کو کتے کی سرشتِ وفا میں دیکھا جاتا ہے۔ جہاں عشق و عاشقی کی مثالیں قائم کی جاتی ہیں۔ یہ مثالی کردار علامتی کردار ہیں اور ان کے نام ان کی کسی خصوصیت کی نشاندہی کرتے ہیں۔ ڈاکٹر وحید قریشی تاریخ دان بھی ہیں۔ وہ اس داستان کے واقعات اور سماجی بے یقینی کا سرا اس زمانے کے سیاسی اور سماجی حالات میں تلاش کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں یہ زمانہ سیاسی اور سماجی پسپائی، بے یقینی اور بے عملی کا تھا۔ عمل و حرکت کی جگہ عجیب و غریب، قناعت، نرمی اور ہتھیار ڈالنے کے انداز نے لے لی تھی۔

اتفاقات کے سلسلے کہانی کے اجزأ کو مربوط کرتے ہیں۔ جن سے یہ اندازا ہوتا ہے کہ کہانی گو اپنی جذباتی زندگی کی تسلی اور اطمینان بھی چاہتا ہے اور کسی معجزے کا منتظر ہے۔ جو اس کے آس پاس کی زندگی اور حقائق کو بدل ڈالے۔

کڑی آزمائشوں میں غیبی طاقتیں اور طلسمات ہوتے ہیں یا حضرت خضرؑ، حضرت علیؑ نمودار ہو کر مدد کرتے ہیں۔ غیبی مدد کے علاوہ جادو ٹونے اور ٹوٹکے بھی معاشرے کی عدم آسودگی کو ظاہر کرتے ہیں۔ عام آدمی منتشر جذباتی کیفیات سے گزرتا ہے۔

ڈاکٹر وحید قریشی اس عہد کا نقشہ یوں پیش کرتے ہیں:

یہ دور افراتفری اور بے چینی کا ہے۔ انسانی عقائد اور اعمال کے درمیان کا فاصلہ ہو چکا

تھا۔ اخلاقی سطح پر معاشرہ تضادات کا شکار تھا۔ مذہبی عقائد اور دنیاداری کے معاملات میں افتراق و انتشار کی کیفیت تھی۔ مذہب کے اصول محض درس و تدریس کی چیز ہوتے جا رہے تھے۔ اشخاص اصولی طور پر مانتے تھے۔ لیکن عملی زندگی میں ان اصولوں کی پرورش کی کوئی صورت نہ رہی تھی۔ یعنی حال اور قال میں فرق تھا۔ [۱۵]

ڈاکٹر صاحب نے کرداروں کی دولخت شخصیت کے نمونے پیش کرنے کے لیے مثالیں بھی دی ہیں۔ جو تضادات کا شکار ہیں۔ چار درویش میں محمد شاہی دور کی خصوصاً اور مغلیہ دور کی عملاً تصویر ملتی ہے۔ جس میں محمد شاہی عہد سے بابر کے زمانے تک کی معاشرتی اور درباری زندگی کی تفصیل موجود ہے۔ میرامن کا انداز بیان جو زیادہ مناسب اور مؤثر ہے۔ انہوں نے کہانی کے بے جان پیکر میں روح تازہ دوڑا دی ہے۔ اس زمانے تک سادگی اور اختصار کو اچھی نثر کا زیور سمجھا جاتا تھا۔ یوں بھی یہ کتاب فورٹ ولیم کالج نے ترجمہ کرائی اور اس کا مقصد نو واردوں کو زبان سکھانا تھا۔

میرامن کے مقدمے سے بھی ڈاکٹر وحید قریشی نے اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ گلکرسٹ اس قصے کو ٹھیٹھ ہندوستانی میں ترجمہ کرانا چاہتا تھا۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے تحقیق سے ان اسباب کا بھی سراغ لگایا ہے کہ میرامن کے لیے سادہ اور سہل اسلوب کیونکر قبول ہو گیا۔ ان کی تربیت اور تعلیم کا زمانہ نادری حملے کے بعد کا ہے۔ یہ وہ دَور تھا جب دلی میں امن و امان رخصت ہو چکا تھا۔

وہ دور گزر چکا تھا۔ جب لسانی مباحث جاری تھے اور ایہام گوئی شعراء کا شغف تھی۔ کربل کتھا (فضل) کی نثر، شاکر ناجی، مضمون اور حاتم کی شاعری جذبات کے بیرونی خول اور زبان و بیان کی آرائش کو اصل زندگی سمجھا جاتا تھا۔ دلی کے آس پاس زوال کے آثار نمودار ہو رہے تھے۔ لیکن پرتکلف زندگی کے اسباب مہیا کیے جاتے تھے۔ جبکہ نادری حملے کے بعد یہاں کے ادبا داخلی کرب سے دوچار ہوئے۔ داخلی حقائق کو موضوع بنایا گیا۔ اس دلی میں میرامن کی پرورش ہوئی اور انہوں نے مصنوعی غلاف اترے ہوئے معاشرے میں سانسیں لیں۔ جہاں معاشرہ ایک بحران کا شکار تھا۔ یہاں احساس اور جذبہ اصل چیز تھے۔ یہی وجہ ہے کہ باغ و بہار کی نثر زندہ نثر ہے اور میرامن کا نثر میں وہی مرتبہ ہے جو میر تقی میر کا شاعری میں ہے۔ میرامن گرامر اور لسانیات کے بندھے ٹکے اصولوں کے پابند نہیں۔ انہوں نے اردو نثر کو ایک نئی سمت کا تعین دیا۔ ان کا لہجہ بیانیہ اور نثر

مکالماتی ہے۔ لیکن ان کی زبان اور لہجہ داستان گوئی کے فنی تقاضے پورے کرتے ہیں۔ گیان چند اس کی زبان کو سریع الفہم کہتے ہیں۔ جب کہ مولوی عبد الحق اس کے مقدمے میں اس کی زبان کو فصیح کہتے ہیں۔ ان کا اسلوب تخاطب اور مکالمے کا ہے۔ وہ زبان و بیان میں کرداروں کے مراتب اور مقام کا لحاظ رکھتے ہیں۔ میرامن ہر طبقے کی زبان کے فرق کو جانتے ہیں۔

ڈاکٹر وحید قریشی نے میرامن کے دور کی سماجی اور عصری صورتحال سے اپنے تحقیقی عمل کے ماخذ تلاش کیے اور انہیں دریافت کے مراحل میں سمویا۔ ان کی تحقیق اس داستان کو نئے انداز سے ہمارے سامنے لے آتی ہے۔

''شبلی کی حیات معاشقہ'' میں تحقیق کے دوران ڈاکٹر وحید قریشی ایک محتسب نظر آتے ہیں لیکن باغ و بہار کے تحقیقی تجزیے کے دوران وہ محقق، نقاد اور تجزیہ نگار نظر آتے ہیں۔ ان کی تحقیق ان کی تنقید کی تکمیل کرتی ہے اور ان کی تنقید ان کی تحقیق کو مکمل کرتی ہے۔ ''باغ و بہار'' کا یہ تجزیہ بھی دراصل ان کی مغلوں کے آخری دور کی تحقیق سے تعلق رکھتا ہے۔ اس دور کے زوال کے اسباب اور ان کا جائزہ ڈاکٹر صاحب کے تعلقِ خاطر کا ثبوت ہے۔ اس ضمن میں ان کا بنیادی تحقیقی کام ''میر حسؔن اور ان کا عہد'' ہے۔

اس کام سے ان کی وابستگی بھی بہت زیادہ رہی۔ 'میر حسن اور ان کا عہد' دراصل ڈاکٹر صاحب کے اردو میں ڈی۔ لٹ کا مقالہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے میر حسن کے عہد کو ان حالات کے تناظر میں دیکھا۔ جو اس دور کا خاصہ تھے۔ اس ضمن میں ان کی پیش کردہ تاریخیں اور سنین توجہ طلب ہیں۔ جن کے ذریعے انہوں نے حقائق کی تہہ تک پہنچنے کی سعی کی۔ اگرچہ یہ سوانحی تحقیق ہے۔ لیکن اس کا اصل مواد اور بنیادی ماخذ بہت کم دستیاب ہیں۔ تحقیق یوں بھی تلاش و جستجو اور مشاہدات کا نام ہے اور یہ عمل سائنٹفک ہے جس میں سماجی علوم کی روشنی میں موضوع کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی کے مضامین میں تاریخ، لسانیات، فارسی ادبیات، اردو ادب، انگریزی ادب سے آگہی، نفسیات اور کلچر کا مطالعہ شامل ہیں۔ اس طرح انہیں اپنی تحقیق میں کسی بیرونی سہارے کی ضرورت نہیں۔ انہوں نے اپنی تحقیق کو وقیع بنانے کے لیے دوسری زبانوں کے سرچشموں کی طرف رجوع بھی کیا۔ اس طرح ان کی تحقیق، سماجی اور تاریخی دستاویز بن جاتی ہے۔

'میر حسن اور ان کا عہد' ڈی۔ لٹ کا مقالہ ہے جو کتابی صورت میں ۸ مئی ۱۹۵۹ء کو شائع ہوا۔ میر حسن

پر ان کی یہ کتاب آٹھ برس کی محنت کا نتیجہ ہے۔غالباً ۱۹۵۱ء کے آغاز کی بات ہے جب اس کام کا تہیہ کیا گیا اور ۱۹۵۹ء میں یہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا۔

ڈاکٹر صاحب نے اس تحقیقی سفر میں برٹش میوزیم کے کلیاتِ میر حسن کا مائیکروفلم ڈاکٹر مختار الدین آرزو کے ذریعے حاصل کیا۔علی گڑھ کے قلمی نسخوں کی مدد حاصل کی۔ برلن کے نسخہ تذکرہ مبتلا کے متعلقہ اوراق کے پیشِ نظر رہے۔ انجمن ترقی اردو کراچی کے نسخوں کی معلومات مولوی عبد الحق کے ذریعے حاصل کی گئیں۔ رام پُور کے نسخوں کی تفصیلات مولانا امتیاز علی خاں عرشی، عابد رضا خان بیدار اور کلب علی خان فائق کے توسط سے معلوم ہوئیں۔لکھنؤ سے مسعود حسن رضوی اور پٹنے سے قاضی عبد الودود صاحب کی علمی سرگرمیاں ان کے لیے راہنمائی کا وسیلہ بنیں۔ جناب عبد العلیم شیر کوٹی کے کلیات میر حسن کا قلمی نسخہ بھی ان کے پاس کچھ عرصہ موجود رہا۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے اس تحقیق کی بنیاد مؤثر شہادتوں پر رکھی۔ میر حسن کے حالات کی تلاش میں تاریخ کے مضمون نے ان کی خاصی مدد کی۔ کیونکہ اس کتاب کا پہلا باب تاریخی ہے۔ میر حسن کے فیض آباد آنے کی تاریخ، ان کی پیدائش کا سنہ، معاصرین کے حالات سب تاریخوں میں بکھرے پڑے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب حرف آغاز میں بھی اس امر کا اعتراف کرتے ہیں کہ اردو ادب کی تحقیق کا کام تاریخ ہند کے بغیر ادھورا رہتا ہے۔ میر حسن کے زمانے کے بارے میں انہوں نے البتہ معاصر بیانات پر اکتفا کیا ہے۔ اس ضمن میں میر حسن کے اپنے بیانات کو ترجیح دی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا اسلوبِ تحقیق اس کتاب میں کھل کر سامنے آیا ہے۔ جب وہ ایک طرف انگریزی اور دوسری طرف اردو مواد کی طرف اپنے موضوع کے سلسلے میں رجوع کرتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب وسیع النظر محقق ہیں۔ ان کی نظر اقتصادی اور سماجی عوامل کے ساتھ ساتھ سیاسی واقعات پر بھی گہری ہے۔ انہوں نے کسی جگہ بھی قیاس کو حتمی دعوے کے طور پر پیش نہیں کیا۔ اپنے تحقیقی مسلک کے بارے میں خود فرماتے ہیں:

> تحقیق و تنقید کو میں صرف ایک سائنسی عمل Scientific Process نہیں سمجھتا۔ میرے نزدیک یہ دونوں علم ادبی عمل (Literary Process) بھی ہیں۔ اس لیے اسلوب اور اس کے جان دار ذرائع سے کام لینا بھی میں نے ضروری خیال کیا۔[۱۹]

ڈاکٹر وحید قریشی نے اس سائنٹیفک انداز کا استعمال اپنے زیر بحث مقالے میں بھی کیا ہے۔ ان جاندار

ذرائع اور ماخذوں میں وہ کتابیں بھی شامل ہیں جن کا تعلق مغل سلطنت کے انتظام و انصرام کے ساتھ ہے۔ درحقیقت مغل عہد حکومت کا زوال اردو ادب کا نقطۂ عروج ہے۔

یہی دور میر حسن کے عہد کے پس منظر کو بھی ہموار کرتا نظر آتا ہے۔ اس دور میں سیاست اور تمدن تیزی سے روبہ زوال تھے۔ یہ زوال آنے والے ادبی عروج کا پس منظر بنا۔ لیکن زوال کے اسباب ہر دور کی طرح سیاست اور سماج میں گڑھے تھے۔ مرکز کی گرفت مضبوط نہ رہی تھی۔ عالم گیر کی وفات کے بعد آہستہ آہستہ اندرونی سازشیں اور خانہ جنگیاں پروان چڑھنے لگیں۔ فوجی طاقت کمزور ہو چکی تھی۔ جب سیاسی زوال ہوتا ہے تو اخلاقی قدریں بھی روبہ زوال ہو جاتی ہیں۔ ان اخلاقی قدروں کی گراوٹ کا سبب بھی لوگوں میں پائی جانے والی بے یقینی، عدم استحکام قوت فیصلہ کی کمی، مالی و معاشی بحران تھے۔ اقتصادی حالات تو اکبر کے دور سے ہی مسلسل پستی کی طرف جا رہے تھے۔

اندرونی خلفشار اور بیرونی حملے بھی سلطنت کا شیرازہ بکھیر رہے تھے۔ ان میں مختلف گروہ شامل تھے۔ مرہٹے، راجپوت، جاٹ، ایرانی، تورانی، افغان اور سکھ وغیرہ۔

ان گروہوں کی باہمی آویزش مغلیہ حکومت کو امن و امان سے کوسوں دور لے گئی۔ بابر کے زمانے میں شیعہ، سنی اختلافات تو موجود تھے ہی لیکن اس کے ساتھ ساتھ سیاسی اختلافات بھی جاری تھے اورنگزیب کو صرف انہی اختلافات کا سامنا نہ تھا بلکہ مقامی قوتیں اور بیرونی حملے بھی خلفشار کا باعث بن رہے تھے۔

جاٹوں اور راجپوتوں کی ہوس ملک گیری نے ہندوستان میں تخریبی سرگرمیاں تیز کر دیں۔ ۳ مارچ ۱۷۰۷ء کو اورنگزیب عالم گیر نے وفات پائی۔ درمیان کے حکمران خانہ جنگیوں میں مصروف رہے۔ مغلیہ عہد کے اختتام اور اس سے پہلے کے حالات کے بارے میں انگریز مؤرخین نے بھی کسی حد تک مبالغہ سے کام لیا ہے۔ یہ اتنا بُرا دور نہ تھا لیکن انگریزوں نے اپنی سیاست کے ذریعے اسے بگاڑ دیا اور اسے اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا۔ اودھ کی سیاست کے بارے میں بھی جو کتابیں شائع ہوئیں۔ ان میں واجد علی شاہ کی بلوبک اور دور حاضر میں محمد تقی احمد کی کتاب آخری تاجدار اودھ ان الزامات کو غلط ثابت کرتی ہے۔ واجد علی شاہ معزول ہو کر مٹیا برج کلکتہ میں نظر بند ہوئے اور وہیں ۱۳۰۵ھ میں وفات پائی۔

پہلا باب ہندوستان کے سیاسی و سماجی حالات پر مشتمل ہے۔ جس میں ڈاکٹر وحید قریشی نے تاریخی کتابوں کے بھرپور حوالہ جات سے مدد لے کر بنیادی حقائق اور ان کی تفصیل تک پہنچنے کی کوشش کی ہے۔ میر حسن اور ان کے معاصرین کے حالات ڈاکٹر وحید قریشی نے براہ راست مائیکروفلم اور گارساں دتاسی کی تاریخِ ادب ہند سے لیے ہیں۔ جن میں میر حسن کی فارسی زبان میں تحریر شدہ حالات اور پس منظر لکھا ہوا ہے۔ اپنے خاندان کے بارے میں میر حسن فرماتے ہیں:

> اما بعد بر سخنورانِ شاطر و دانشورانِ ماہر (مخفی نماند) کہ اصل ایں مؤلف ابنِ میر غلام حسین ابنِ میر عزیز اللہ ابن میر برات اللہ ابن میر امامی موسوی از شاہجہاں آباد است کہ میر امامی موسوی در وقت شاہجہاں بادشاہ از ہرات آمدہ بہ منصب سہ ہزاری ذات بین الاقران ممتاز گردیدند۔ فاضل متبحر وفقیہہ ہم بودند۔ گاہ گاہ بجہتِ تفریحِ طبع فکرِ شعر ہم می نمودند کہ افکارِ معاد فرصتِ بے فائدہ گوئی نمی بخشد۔ پس ایں عاجز بسخن از سر رشتۂ شاعری اجدادی است نہ امروزی وقبلہ گاہی سلمہ اللہ تعالی ایں ہمہ قدرتِ علم چوں طباع سا معاں را درسخن بلند نیافتند بقدر حوصلۂ آں (ہا) بطرفِ ہزل توسن قلم راندند بحکم آں کہ ہر گاہِ کہ زمانہ باتو نسازد تو ماند بساز۔ [۱۷]

میر حسن کے بیانات کے تضاد سے بھی ڈاکٹر وحید قریشی نے میر حسن کی زندگی کے حقائق کا تحقیقی تجزیہ کیا ہے۔ مثلاً حسن کے بیان کردہ شجرہ نسب میں میر امامی ایک بزرگ ہیں۔ ان کے بارے میں میر حسن ہمارے ماخذ ہیں لیکن انہوں نے شاہجہانی دور میں میر امامی کا جو مقام دکھایا ہے۔ وہ حقیقت میں اتنے اہم نظر نہیں آتے میر حسن نے اس دور کی معاصر شہادتوں سے اس نتیجے تک پہنچے ہیں کہ غالباً امامی نہ اتنے بڑے کاتب تھے نہ اتنے بڑے منصبدار۔ کیونکہ معاصر تاریخوں میں میر امامی کا نام کہیں موجود نہیں۔ اس کے علاوہ محمد حسین آزاد نے آب حیات کی تالیف کے سلسلے میں بعض افراد سے خط و کتابت کی تھی۔ ان خطوط کا پلندہ ڈاکٹر محمد صادق صاحب کو ملا۔ اس میں دو خط خاندانِ حسن کے ضمن میں ہیں۔ اسی طرح میر شیر علی افسوس نے اپنے دیباچہ سحر البیان بھی ان کے خاندان کا تذکرہ کیا ہے لیکن اس سے پہلے مسودے میں افسوس حسن کے دیباچے میں ان کا بیان مختلف تھا۔ اس طرح میر حسن کے آباؤ اجداد کے بارے میں مختلف بیانات موجود ہیں۔ دیباچۂ افسوس میں

رقم ہے کہ ضاحک اورحسن نے ایک ساتھ دہلی چھوڑی حسن کے ترک دہلی کا سنہ ڈاکٹر وحید قریشی نے محرم ۱۱۷۹ھ میں قائم کیا ہے۔ ضاحک بھی اسی زمانے میں دہلی سے لکھنؤ گئے۔ فیض آباد میں آ کر میر ضاحک نے کسی کی ملازمت نہیں کی۔ بے روز گار رہے اور ہجویات لکھتے رہے۔ رفیع سودا اور میر ضاحک ہم عصر تھے اور دونوں کی جھڑپیں ہجویات میں ہوتی رہیں۔ عمر کے آخری تیس سال میں ضاحک نے قلندرانہ وضع اختیار کی۔ سودا کی زندگی اورفن پر کافی کام ہوا ہے۔ شیخ چاند کی ''سودا'' قاضی عبد الودود کے مقالات (معاصر اور نقوش میں) کلب علی خان فائق کے مقالے (معارف اور ماہِ نو میں) اسی طرح حافظ محمود شیرانی کا تبصرہ آب حیات اورنٹیل کالج اہم ہیں۔ اسی طرح ضاحک کے حالات بھی پردے میں نہیں۔ سودا اور ضاحک کی باہمی ہجویات سے ایک دوسرے کے حالات پر روشنی پڑتی ہے۔ اس دور میں شیخ حزیں بھی ایک شاعر ہوگزرے ہیں۔ ان کے علاوہ میر ضیاء سودا، میؔر اور دؔرد کے اثرات کا خود میر حسن نے ذکر کیا ہے۔ ان کے علاوہ افسوس میؔر، سوز، مصحفی، قتیل، رنگین اور انشاء بھی ان کے معاصرین میں شامل تھے۔ علاوہ ازیں جرأت جعفر علی حسرت، انشاء، اور قتیل بھی شامل تھے۔ میر حسن تک آتے آتے اُردو شاعری اور ادب کی روایت مستحکم ہو چکی تھی۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے دستور الفصاحت، تذکرہ شعرائے اردو، سفینۂ ہندی بانکی پور، بیاضِ فائق اور ڈاکٹر مختار الدین احمد کے مہیا کردہ نسخۂ ایشاٹک سوسائٹی لندن نمبر ہندوستانی میر حسن اور مرزا علی حسن، ادب لطیف، Hand book of urdu Literature Dr. Mohan حسرت موہانی رسالہ اردوئے معلیٰ علی گڑھ سے استفادہ کرتے ہوئے حسن کا پورا نام میر غلام حسن بتایا ہے۔

سچ تو یہ کہ آج میر حسن!!
اس نے خلعت پہن کے عباسی
ایک تم پر نہیں جنون کیا!!
کتنے ہی سیدوں کا خون کیا
کچھ کل ہم کو میر حسن کی خبر نہیں
کیا جانے تیرے کھوج میں کیدھر نکل گیا

مثنویوں اور دیوان میں انہوں نے حسن تخلص کیا ہے۔ تاریخِ ولادت کے ضمن میں آبِ حیات، اُردو شاعروں کا البم، خمخانۂ جاوید، لکھنؤ کا دبستانِ شاعری ڈاکٹر ابواللیث صدیقی اور تاریخِ ادب اردو رام بابو سکسینہ سے استفادہ کیا ہے۔ ان کی قطعی تاریخِ ولادت ۱۱۵۱ھ یا ۱۱۴۰ھ ہے۔ ان کی ولادت پرانی دلی کے محلّہ سید واڑہ میں ہوئی اور وفات ۱۲۰۱ء اول محرم کو ہوئی۔ مفتی گنج میں دفن ہوئے۔

بہرحال ان کی ابتدائی زندگی کا ذکر ہو رہا تھا۔ میر حسن اور ان کے والد میر ضاحک نے ایک ساتھ دلی چھوڑی۔ یہ وہ وقت تھا جب دلی تباہی سے دوچار تھی اور اودھ والوں کی قدردانی کے سبب شعراء دلی کو خیر باد کہہ رہے تھے۔ نادر شاہ کا حملہ، صفدر جنگ کی معزولی، دہلی میں عماد الملک کے ظلم و ستم کا آغاز احمد شاہ کا معزول ہونا، عاقبت محمود کی دہلی میں آمد، ابدالی کا حملہ، راگھو کا حملہ دہلی اور لوگوں کی تباہ حالی و پریشانی باہو کا حملہ دہلی، ابدالی کا دوسرا حملۂ دہلی، سورج مل جاٹ کا حملہ دہلی، دہلی پر مرہٹوں کا قبضہ، شاہ عالم کی شکست وغیرہ۔ تاریخ اودھ بھی اس ضمن میں ہماری تائید کرتی ہے۔ کہ اس دور میں لوگ فیض آباد پہنچے۔ دہلی کی بربادی کے ساتھ ہی فیض آباد کی آبادی وابستہ ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے میر حسن کے دورِ لکھنؤ کے متعلق فرضی روایات پر بھروسہ نہیں کیا بلکہ دیگر شعراؔ کے لکھنؤ روانہ ہونے کے بارے میں جو روایات اور تذکرے موجود ہیں۔ ان کا موازنہ بھی کیا ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ میر حسن شجاع الدولہ کے زمانے میں فیض آباد میں موجود تھے۔ میر حسن کا اپنا بیان ہے کہ بچپن یا صغرسن میں شاعری شروع کی اور فیض آباد کے دورِ عروج میں لکھنؤ آیا۔ 'گلزارِ ارم' میں لکھتے ہیں۔

؎ جونہی داخل ہوا میں اس نگر میں
کھلا جنت کا دروازہ نظر میں
عجب معمورۂ آباد پایا
مثالِ گل ہر اک دل شاد پایا

اس دور میں فیض آباد کو شجاع الدولہ نے اپنی لگن اور توجہ سے بے مثال شہر بنا دیا۔ شہر کی آرائش، وسعت اور چہل پہل کا عالم دیدنی تھا۔ یاد رہے کہ یہ لکھنؤ کی بربادی اور میر امن کے فیض آباد کی رونقوں کا دور

تھا۔ جس کی تائید میر حسن کی نظموں سے ہوتی ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے اس دور کے فیض آباد اور لکھنؤ کے حالات کا جائزہ میر حسن کے کلام کی روشنی لگایا ہے۔ یوں اندرونی شہادتیں مہیا کر کے تحقیق کی منفرد روایت قائم کی ہے۔ گویا میر حسن ۱۱۸۸ھ سے قبل فیض آباد آ چکے تھے۔ دہلی سے روانگی کے وقت اپنے استاد محترم حضرت خواجہ میر دردؔ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور حسرت و افسوس سے وطن کو خیر باد کہنے کی اجازت طلب کی۔

؎ جاناں ز تو امید نگاہے دارم
امید نگا ہے زتو گا ہے دارم

ما کشتۂ چشمِ سرمہ سایت ہستیم
نے نالہ ولے فغاں نہ آہے دارم

صرف یہ اشعار ان کی روانگی کا پیغام ہیں۔ ان کے علاوہ معاصر بیانات کہیں بھی تائید نہیں کرتے۔ دہلی سے روانگی چار و ناچار کی اس کا سبب وطن سے دوری کے ساتھ اولین عشق اور معشوق سے جدائی بھی بیان کیا ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی اس واقعے کی تائید مثنویات میر حسن مرتبہ آ سی میں شامل ان اشعار سے کرتے ہیں۔

؎ اگرچہ واں سے میں آنے کو آیا
ولے اس کی جدائی نے ستایا
چلا گاڑی میں یوں آیا میں ناچار
قفس میں جس طرح صیدِ گرفتار
غرض کرنے کو کی قطعِ منزل
ولے ہر ہر قدم رہتا گیا دل

بہانہ رکھ جدائی کا وطن کی
میں رو رو ندیاں کرتا تھا بن کی
کسی سے کہہ نہ سکتا تھا میں احوال
کہ تھی شرم و حیائے عشق دنبال
ہر اک میدان تھا اس اشک سے گل
کٹی برسات میں وہ اپنی منزل
کسی رہ میں نظر پڑتا تھا جب باغ
میں اپنے دل کے لگتا دیکھنے داغ
رہا میں ڈیگ میں آ کر کئی ماہ
چلا وہاں سے رضائے حق کے ہمراہ [۳]

دہلی سے آگرہ تک سات روز کی مسافت تھی۔ چنانچہ آگرہ سے مکن پور پہنچے۔ ان تمام راستوں اور منزلوں کا احوال ڈاکٹر وحید قریشی نے نہایت دیدہ ریزی سے تزکِ جہانگیری اور امپیریل گزیٹیر سے اخذ کیا ہے۔ علاوہ ازیں قاموس المشاہیر اور تاریخی کتب سے اس دور کے سفر اور سڑکوں کا بیان کیا ہے۔ حکومت کی پالیسیوں اور شہری اصول وضوابط اور قوانین بھی پیش کیے ہیں۔ شاہ مدار کی چھڑیوں کے قافلے کے ساتھ میر حسن کی روانگی، فرقۂ مداریہ کے عرس، بدیع الدین شاہ مدار کے زمانہ کے بارے میں معلومات، ان سب سے بھی ہم میر حسن کے اسی سفرِ لکھنؤ کے دوران متعارف ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر وحید قریشی کی تحقیق تمام حقائق اور متضاد مضامین کو ہم آہنگ اور یکجا کرتے ہوئے آگے بڑھتی ہے۔

آگرہ پُل عبور کر کے مکن پور کا راستہ واضح ہو جاتا ہے۔ یہاں ڈاکٹر وحید قریشی نے راستوں اور منزلوں کی نشاندہی جہاندار شاہ اور فرخ سیر کے درمیان لڑائی کی تفصیلات کے ذریعے کی ہے۔ ان کی محققانہ بصیرت کا یہ بیّن ثبوت ہے کہ انہوں نے تاریخ کو ادب سے الگ نہیں سمجھا۔ ان منازل کا تعین یوں کرتے ہیں:

آ گرہ پل سے دریا کو عبور کر کے مکن پور کا راستہ واضح ہے۔ جہان دار شاہ اور فرخ سیر کے درمیاں مذکورہ بالا لڑائی کی تفصیل اس راستے کی نشاندہی کرتی ہے۔ فرخ سیر ۱۲ ذی قعدہ ۱۱۲۴ھ کو مکن پور میں تھے۔ ۱۵ ذی قعدہ کو Mahrand Nagar آئے۔ وہاں سے راج گیر، راج گیر سے جلال آباد (۱۹ ذی قعدہ) سکندرہ (۲۰) رنگ پور (۲۱) عامی پور (۲۲) بسنت پور (۲۳) کلیان پور (۲۴) اٹارہ (۲۵) فاضل آباد (۲۷) Kharsana (۲۸) سرائے مرلی دھر (۲۹) شکوہ آباد (یکم ذی الحجہ) فیروز آباد (۲) علی نگر (۴) عماد پور (۵) سرائے بیگم کو گھاٹ، سرائے روز بہانی، سکندرہ کے پاس صوات پور (یہاں سے دریا عبور کیا گیا) اور آگرہ سے لکن پور تک کی منزلیں معلوم ہو گئیں۔ یہاں میر حسن ۱۷ جمادی الاول کو پہنچے۔ یہاں سے اگلے روز لکھنؤ کی طرف روانہ ہوئے۔ [۱۸]

یہ وہ دور ہے جب شجاع الدولہ تر پولیہ اور لال باغ وغیرہ تعمیر کر چکے تھے۔ البتہ یہ طے شدہ امر ہے کہ میر حسن کے فیض آباد جانے کا سنہ ۱۱۸۰ اور ۱۱۸۱ھ کے درمیان ہی ہے۔ میر حسن کے بعد سودا فیض آباد پہنچے۔ فیض آباد میں میر حسن کے جن لوگوں سے روابط تھے۔ ان میں میر حبیب اللہ خان، میر ابراہیم، میاں اسرار، حسن خواجہ، خوش دل، زار سوزاں، مشتاق، نثار محمد، پناہ محمد پناہ وغیرہ شامل ہیں۔ سالار جنگ کی سرکار میں میر حسن نے ملازمت اختیار کی اور ان کے بیٹے نوازش علی خان کی مصاحبت میں بھی رہے۔ میر حسن شاعری میں مثنوی کے علاوہ مرثیے کا شوق بھی رکھتے ہیں۔ اکثر سالار جنگ کی فرمائش پر مرثیے کے اشعار سناتے۔ جب ان کے مربی سالار جنگ نے فیض آباد کو ترک کر لکھنؤ کو اپنا مستقر بنایا تو میر حسن کو کچھ عرصہ کہیں اور رہنا پڑا لیکن بعد ازاں لکھنؤ آ گئے۔ بہر حال سالار جنگ کے دربار سے ملنے والی رقم اتنی نہ تھی کہ بہ آسانی زندگی بسر کی جا سکتی۔ ان کے دیوان میں یہ نوحہ ملتا ہے:

جز بے سرو سامانی حسن ہم نے جہاں میں
افسوس کہ کچھ اور سر انجام نہ پایا
ہو جو قسمت میں پریشانی تو وہ جائے کہاں
گو خدائی کے ہنر اہلِ ہنر جمع کریں [۱۹]

سالار جنگ اور سردار جنگ میر حسن کے ممدوحین تھے۔ ان کی تعریف میں بھی قصائد اور رباعیات ملتے ہیں۔۱۱۹۲ء میں میر حسن نے ''گلزار ارم'' لکھی۔ اس زمانے کے عام رواج کے مطابق گلزار ''ذ'' سے لکھا ہے اور اس سے تاریخِ تالیف برآمد ہوتی ہے۔

دوسری مثنوی سحر البیان ۱۱۹۹ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ جو میر حسن نے نواب آصف الدولہ کی خدمت میں پیش کی۔

سحر البیان میر حسن کی عمر بھر کی کمائی اور سرمایہ ہے۔ میر حسن کی وفات کے بارے میں میر شیر علی افسوس دیباچہ سحر البیان لکھتے ہیں:

> بعد اس کے (۱۱۹۹ھ کے) اس بزرگ (میر حسن) کو آخر ذوالحجہ سنہ بارہ میں مرض الموت لاحق ہوا۔ ندان غرہ ماہِ محرم کہ سنہ بارہ سے ایک شروع ہو چکے تھے، بتاریخ پانچویں ماہِ محرم کے اس دارِفانی سے اس نے سرائے جاودانی کو کوچ کیا اور شہر لکھنؤ میں مفتی گنج کے بیچ مرزا قاسم علی خاں بہادر کے باغ کے پیچھے مدفون ہوا۔ ۹؎

مصحفی نے تذکرۂ ہندی میں میر حسن کے چار بیٹے بتائے ہیں۔ جن میں سے تین شاعر بھی ہیں۔ میر مستحسن خلیق، میر محسن خلیق، میر احسن خلیق، میر احسان خلیق، میر حسن کے آٹھ شاگرد بھی تحقیق سے معلوم ہوئے۔ جن میں محمد اعظم، راجہ جسونت سنگھ، مروت، فرہاد، مرزا محمد تقی خاں ہوس، جوادعلی احقر، لالہ گنگا سنگھ نادر، میر محمد علی وغیرہ۔

ڈاکٹر وحید قریشی نے میر حسن کے کلام کا جائزہ تین حیثیتوں میں لیا ہے۔

(۱) مطبوعہ کلام کی تعداد، (۲) قلمی نسخوں کا جائزہ، (۳) کلام کی سنہ وار تعین و ترتیب

میر حسن کے مطبوعہ کلام میں مثنوی شادی آصف الدولہ ترتیب کے لحاظ سے پہلے نمبر پر آتی ہے۔ اس میں کل ۹۵ اشعار ہیں۔ پہلا شعر ہے۔

شام کو میں فکر میں بیٹھا تھا کل
یعنی تھی میرے تئیں فکر غزل

آخری شعر یوں ہے۔

زر کی کچھ اس سے نہیں مجھ کو طرف
گر قبول افتد زہے عز و شرف

یہ مثنوی مثنویٔ میر حسن (نمبر مطبوعہ) کے عنوان سے معیار (پٹنہ) مارچ ۱۹۳۶ء میں شائع ہو چکی تھی۔ دوبارہ اسی مثنوی کو "ایک انگریز مستشرق کا سرقہ" کے عنوان سے قاضی عبد الودود صاحب نے پٹنہ سے شائع کرایا۔ میر حسن نے دوسری مثنوی "رموز العارفین" لکھی جو شائع نہ ہوئی۔ ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی کے خیال میں یہ مثنوی کبھی شائع نہ ہوئی تھی۔ برٹش میوزیم کے مائیکرو فلم میں آخری شعر یہ ہے۔

مدعا اس سے نصیحت ہے تمام
اس لیے لکھا یہ قصہ والسلام

مثنوی 'گلزار ارم' نولکشور پریس سے ۱۹۴۵ء میں سحر البیان اور رموز العارفین کے ساتھ چھپی۔

پہلا شعر ہے۔

خداوندا کہوں میں کیا زبانی
کھلا ہے تجھ پہ سب رازِ نہانی

اور آخری شعر ہے۔

ز بس وصفِ گل و گلشن بہم ہے
سو اس کا نام گلزار ارم ہے

"مثنوی در تہنیت عید" کو قاضی عبد الودود نے مرتب کر کے معیار پٹنہ سے مئی ۱۹۳۶ء میں شائع کرایا۔

اس مثنوی میں پہلا شعر یوں ہے۔

؎ فلک کی یہ تھا کج روی سے بعید
کہ دو سال ہو مجھ کو بنگلے میں عید

آخری شعر ہے۔

؎ دعا پر یہ کی مثنوی میں تمام
کہ ہے عید تہنیت کا ہی نام

''مثنوی قصر جواہر'' جریدہ معیار میں دو قسطوں میں شائع ہو چکی ہے۔ اس کا پہلا شعر یوں ہے۔

؎ ثناء پہلے اس خالقِ پاک کو
دیا جس نے رتبہ کفِ خاک کو

ان مثنویوں کے علاوہ 'مثلثاتِ حسن' ترکیب تضمین، تضمین بہ غزل میرؔ، تضمین بہ غزل قائمؔ میں خمسۂ میر حسن مرحوم بر غزلِ قائم کے عنوان سے سات بند شائع ہوئے۔ تبرکات غیر مطبوعہ کے عنوان سے بھی عبد العلیم نے ایک غزل شائع کرائی۔ جس کا مطلع یوں ہے۔

؎ جلوہ گر چہرہ ترا بالوں میں جو شب ہو گیا
مہہ تیرے مکھڑے کے آگے ماہ نخشب ہو گیا

'بادۂ کہنہ' میر حسن کی غزلیات کا مجموعہ ہے جو نولکشوری دیوانِ غزلیات پر مبنی انتخاب حسن مولانا حسرت موہانی نے انتخاب کیا ہے۔ کلام حسن کے زیر عنوان مخزن اپریل ۱۹۱۰ء پر مولانا حبیب الرحمٰن خان حسرت شیروانی نے میر حسن کی چار غزلیں، متفرق اشعار، مثلثات، قطعات وغیرہ کے چند نمونے شائع کیے ہیں۔ میر حسن کے دیوان کے بارے میں ڈاکٹر وحید قریشی لکھتے ہیں۔

''نولکشور پریس کی طرف سے پہلی دفعہ دسمبر ۱۹۱۲ء میں میر حسن کی غزلیات کا ایک مجموعہ ''دیوان میر حسن' کے نام سے شائع ہوا۔ جس میں حسن کی

غزلیات کے دیوان کا تقریباً نصف حصہ موجود ہے۔'' ۲۰

میر حسن کے دیوان کی ایک دوسری اشاعت کا سال ۱۹۴۴ء ہے۔ سرفراز پریس لکھنؤ سے ایک مجموعہ شائع ہوا جس میں ۸۵ غزلوں کے اشعار تھے۔ دیوانِ حسن کا پہلا واضح حوالہ ۱۹۱۰ء میں حبیب الرحمٰن خان شیر وانی کے ہاں ملتا ہے۔ 'سحر البیان' میر حسن کی بے حد ہر دل عزیز اور مقبول مثنوی ہے۔ اس کے ۳۸ مطبوعہ نسخے ہیں۔ تذکرہ شعرائے اردو حبیب الرحمٰن خان شیروانی نے انجمن ترقی اردو سے ۱۹۲۲ء سے شائع کروایا۔ میر حسن کے قلمی نسخے بھی موجود ہیں۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے میر حسن اور ان کا زمانہ میں کلیات و دواوینِ میر حسن کے ۲۳ نسخوں کا ذکر کیا ہے۔ خدا بخش لائبریری پٹنہ میں کلیات میر حسن کا نسخہ موجود ہے۔ اس کے علاوہ لکھنؤ میں کلیاتِ حسن کا ایک نسخہ سید محمد عباس صاحب کے پاس ہے۔ کتاب خانۂ عالیہ رام پور میں نسخۂ کلیات حسن موجود ہے۔ سری رام صاحب خمخانہ جاوید کے پاس قلمی نسخہ دیوانِ حسن کا موجود تھا۔ 'دیوان حسن' میں مختلف طرز کی کئی اور غزلیات موجود ہیں۔ مثلاً ضیاء کے طرزِ کی غزلیں اور سودا، میر، سوز، درد، حسرت وغیرہ کے انداز میں کہیں گئی غزلیات اور دیگر اصناف نظم وغیرہ۔

میر حسن نے دو زبانوں میں لکھا۔ فارسی اور اُردو زبان میں۔ دونوں زبانوں میں ان کے ہاں محاورہ بندی، زبان کی صفائی اور فطری سادگی ملتی ہے۔ فارسی نثر کے اسلوب میں اس قدر سادگی نہیں بلکہ وہاں عبارت پر تصنع، مرصع اور رنگین ہے۔ اگرچہ میر حسن نے دربار سے تعلق بنایا لیکن دہلوی خصوصیات کو اپنائے رکھا۔ ان کی زبان سادہ شیریں اور صاف ہے۔ مثال کے طور پر بے نظیر و بدرِ مُنیر کے قصے میں ان کے بیان کا سحر دلکش اور لاجواب ہے۔ میر حسن کی زبان وہی ہے جو آج کل مستعمل ہے۔ تمام محققین میر حسن کی فارسی دانی کے قائل ہیں۔ دونوں زبانوں میں ان کی مہارت لاجواب ہے۔ ان کی شاعرانہ صلاحیت ان دونوں زبانوں کی مہارت کی بدولت ابھر کر سامنے آتی ہے۔ ان کی مثنوی سحرالبیان نے روز مرے، محاورے اور ضرب الامثال کو بہت متاثر کیا ہے۔ یہ کتاب فصیح و بلیغ تو ہے ہی۔ اس کی کہانی کی دلچسپی نے بھی پڑھنے والوں کو بہت متاثر کیا۔ اس میں ہر طرح کے پڑھنے والوں کی تسکین کا سامان موجود ہے۔

ڈاکٹر وحید قریشی نے زبان دانی کے اصولوں کو سامنے رکھ کر اس دور کے الفاظ ان کی تذکیر و تانیث اور میر حسن کے اشعار میں ان کے استعمال پر بحث کی ہے۔

ناسخ اور ان کے معاصرین کے ہاں تذکیر و تانیث کا استعمال مختلف ہے۔ دریائے لطافت ۱۲۲۱ھ میں انشاء نے تذکیر و تانیث کے اصول و قواعد مرتب کیے۔ ان کی رُو سے حسن کی سحرالبیان کا جائزہ بڑا دلچسپ رہا۔ لیکن آہستہ آہستہ ناسخ کی تحریک نے میر حسن کی زبان کے کچھ حصے مٹا دیے۔ الفاظ بصورت دیگر استعمال ہوئے ہیں۔ اس ضمن میں ڈاکٹر وحید قریشی فرماتے ہیں:

> اس سے بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے کہ تذکیر و تانیث میں عہد بہ عہد فرق پڑتا رہا ہے۔ صفیر بلگرامی تذکرہ جلوہ خضر کی پہلی جلد میں اُردو زبان کی عہد بہ عہد ترقی کا جائزہ لیتے ہوئے تین چارٹ پیش کرتے ہیں۔ چارٹ نمبر ا دلی کی زبان اور میر و مرزا کی تبدیلی، چارٹ نمبر۲ سودا اور میر کی زبان اور ناسخ کی تبدیلیاں، نمبر۳ میر حسن اور ان کے معاصرین کی زبان اور ناسخ کی تبدیلیاں۔ یہ تینوں چارٹ اردو زبان کے لیے بڑے مفید ہیں۔ [۲۱]

میر حسن کا زمانہ وہ ہے جب زبان کے معاملے میں دلّی سے سند لیتے تھے۔ مثلاً کسرۂ اضافت ایسے لفظ کے آخر میں استعمال کرنا جس کے لیے فارسی میں کوئی لفظ نہ ہو۔ 'انہوں کے واسطے' یا 'لیے' اور انہوں کی خاطر غیر فصیح ہے۔ دو ہندی لفظوں یا ایک ہندی اور ایک فارسی کے درمیاں وعطف کا لانا ضروری نہیں۔ 'جوں' بطور حرف تشبیہ دریائے لطافت کی تالیف کے وقت گویا کے معنوں میں اہل اُردو زبان و ادب کے نزدیک ثابت نہیں۔ لیکن میر حسن نے اس کا بہت استعمال کیا ہے۔ میر حسن کے بعد ان کے پوتے میر انیس نے مرثیہ نگاری میں نام پیدا کیا۔ میر حسن کی مثنوی سحرالبیان کا اثر آنے والے ادوار پر بھی پڑا۔ ان کی زبان اپنے دور کے اصول و قواعد اور زبان دانی کے اصولوں کے عین مطابق ہے۔ لکھنؤ کی زبان کے قواعد اور اس کا مزاج متعین کرنے میں میر حسن کی مثنوی اور ان کے گھرانے کا کردار ناقابلِ فراموش ہے۔

میر حسن کے عہد تک فارسی زبان زوال آمادہ ہو چکی تھی۔ مغل حکومت کا اختتام تھا اور ایرانیوں کی آمد دلی اور نواحِ دلی میں رک گئی تھی۔ اب اردو شاعری نے سر اٹھایا اور ترقی کی کئی منازل طے کرلیں۔ مظہر جانِ جاناں اور خان آرزو کی تازہ گوئی نے ایہام گوئی کے اثرات کو مندمل کر دیا۔ ایہام گوئی کی ساکھ نہ رہی۔ اس دور میں میر وسودا کی تحریک نے جنم لیا۔

شعر گوئی میں اردوئے معلیٰ نے اپنے لیے جگہ بنا لی تھی۔ الفاظ و معانی کی بھول بھلیوں کی بجائے سیدھا

سادا تغزل شعرا کا مطمعِ نظر بن گیا۔

مصحفی فارسی کو طاق پہ رکھ
اب ہے اشعار ہندوی کا رواج

مصحفی دوں میں جہاں ریختہ گوئی کو رواج
قدر شیرازی کی ہو واں نہ صفا ہانی کی

سیاسی انتشار کے باعث دلی کے اثرات تہہ و بالا ہو رہے تھے۔ انگریزی اقتدار کا سورج طلوع ہو رہا تھا۔ مغل سلطنت کا زوال ہیئت اجتماعی میں سرایت کر رہا تھا لیکن اردو لسانی لحاظ سے پھل پھول رہی تھی۔ جب یہ دلی سے فیض آباد اور لکھنؤ میں آئی تو مقامی اثرات اس پر پوری طرح اثر انداز ہوئے۔ اس دور کے صوفیانہ اور قلندرانہ رجحانات بھی اردو شاعری پر اثر ڈال رہے تھے۔ میر حسن کے شاعرانہ مزاج پر بھی دردؔ کے کلام کی سنجیدگی، سوز کی طرزِ گفتار اور اورنگزیبی دور کی تمثیل گوئی نے اثر ڈالا۔ ان کے ماحول میں یہ تمام خصوصیات رچی بسی تھیں۔ پھر ان کی اپنی شخصیت اور اندازِ فکر و نظر نے ان کو انفرادیت بخشی تھی۔ ان کی شخصیت میں بذلہ سنجی اور دوست نوازی موجود تھی لیکن یہ خصوصیات ان کے کلام میں لازم و ملزوم نہیں۔ سحر البیان ایک خیالیہ یا Fantasy ہے۔ جو حسن کی دبی ہوئی خواہشات کا پرتو ہے۔ خلوت کے مناظر کی مفصل تصویریں پیش کی گئی ہیں۔ جو ان کی جنسی زندگی اور خواہشات کی آئینہ دار ہیں۔ اسی طرح مال و دولت کے بے محابہ تذکرے ان کے ماحول کی بے اطمینانی کو ظاہر کرتے ہیں۔ ڈاکٹر وحید قریشی میر حسن کے عہد اور ماحول کا تاریخی و سماجی مطالعہ کرنے کے بعد ان کا نفسیاتی تجزیہ بھی کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

> خواب بیداری میں ہر خواہش فوری تسکین کا موقع ڈھونڈتی ہے۔ یہاں حسن کی ہر خواہش جلد پوری ہو جاتی ہے۔ کیا حسن اپنے ماحول سے اکتا کر اپنی خواہشوں کی عدم تکمیل سے گھبرا کر خواب بیداری میں مبتلا نہیں ہیں۔ حسن شغل شعر کو یا تو عاقبت سنوارنے کا ذریعہ سمجھتے ہیں یا دنیا میں اپنا نام باقی رکھنے کا وسیلہ قرار دیتے ہیں۔ شاعری ان کے ہاں غم غلط

کرنے کا سہارا بھی ہے۔ گردوپیش سے گھبرا کر شاعری پناہ گاہ بن جاتی ہے۔۲۲

میر حسن کی غزلیات ان کی قلبی واردات کا حقیقی بیان ہیں۔ جو اپنے اسلوب و انداز کی بدولت منفرد اور یکتا ہیں۔

ے شعر کہنے سے یہ حاصل ہے کہ شاید کوئی
بعد مرنے کے حسنؔ اپنے تئیں یاد کرے

ے یہ عبرت گاہ ہے دنیا حسنؔ مت ذکر کر اس کا
عوض اس کے کوئی تازہ غزل لکھ اپنے دیواں پر

ے حسنؔ جی چاہتا ہے روئیے پڑھ کوئی غزل ایسی
بھرا ہو جس کے ہر مصرع میں سوز و درد و حرماں کو

حسن اپنے اشعار کے بارے میں بلند رائے رکھتے ہیں۔

ے ایک ایک، شعر میرا جواہر کا ہے رقم
کیا کیا سخن کے لعل اگلتی رہی زبان

ے نیرنگ معانی ہیں، غزل میں تو حسن کی
ہے اس کو بجا کہیے اگر افسرِ طاؤس

لیکن حسن مالی پریشانی کی وجہ سے سخن کی ناقدری کا گلہ بھی کرتے رہے۔

ے جوہر شناس کوئی میرا ہو تو سمجھے وہ
کس کس طرح کی دل میں ہے میرے نئی اُمنگ

؎ آئینہ سامنے ہو تو طوطی ہو حرف زن
کیا سر کو اپنے پیٹے کوئی روبروئے سنگ

میر حسن کی شاعری دولت کے خوابوں کے مہیج سے تحریک حاصل کرتی ہے۔ انہیں سحر البیان کا معاوضہ توقع سے کم ملا۔ پھر سالار جنگ کے دربار سے ملنے والا روپیہ بھی ضرورتوں سے کم تھا۔ جب وہ اپنی ضرورتوں اور خواہشات کا براہِ راست اظہار کرتے ہیں تو ان کے کلام میں پھیکا پن پیدا ہو جاتا ہے شعوری سطح پر اپنی خواہشات کا نام لیتے ہیں۔ تو ان کی ذہنی کشمکش ان کی شاعری میں کشمکش کا عنصر پیدا کر دیتی ہے۔ ان کا کلام نارسائیوں کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے۔ عشق میں بے حاصلی دولت و ثروت کی عدم موجودگی لیکن شدید خواہش ان تمام تلخ حقائق نے ان کی شاعری کا مرکز تصور اور خیال کو بنا دیا۔ یہ دو محور ہیں۔ جن کے گرد میر حسن کا کلام گردش کرتا ہے۔

؎ حسنؔ (اَب) خواب میں بھی دیکھتا ہوں چشم گریاں کو
ہوئی ہے مجھ کو رفتہ رفتہ یاں تک الفت گریہ
جو کچھ سے خیال میں دیکھوں ہوں میں ترے
دیکھی نہ ہو گی سیر کسی نے یہ خواب میں
تھے محوِ خیال رات اس سے
باتوں کا دماغ ہم کو کب تھا

ایسے میں ڈاکٹر وحید قریشی کا یہ نفسیاتی تجزیہ ہمیں بڑا اہم معلوم ہوتا ہے:

حسن عمر بھر تخیل کے بل بوتے پر عشق و عاشقی کے ڈرامے تخلیق کرتے رہے۔ تازہ گو، طرزِ ادائیہ کے ماہر شاعروں کی طرح حسن احساسات کے شاعر ہیں۔ وہ اپنے جذبات سے آنکھ مچولی کھیلتے ہیں۔ حواس خمسہ کی کارفرمائیوں کو شاعری میں جگہ دیتے ہیں۔ اپنے جذبات کی رو میں بہتے ہوئے کبھی انہیں محبوبہ کی ذات ضروری معلوم ہوتی ہے کبھی اس سے بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ کبھی تنہائی

کاٹنے کو دوڑتی ہے تو سراپا انتظار ہوتے ہیں۔ کبھی انہیں خیال گزرتا ہے کہ وصال کبھی نصیب میں نہیں ہوا۔ کبھی وصال کا اقرار کرتے ہیں اور اس کے گزر جانے کا انہیں غم ہوتا ہے...... کبھی وصال ناپسند کرتے ہیں۔ کبھی ہجر کی نوحہ خوانی ہوتی ہے اور کبھی یوں معلوم ہوتا ہے، کہ ساری عمر تو وصل ہی رہا، حجاب کی نوبت تو اب آئی۔۲۳

ـ ذوقِ تنہائی میں خلل ڈالا
آ کے مجھ پاس اس گھڑی تو نے
ـ آہ مثل شب جوانی جلد
کیا یہ روزِ وصال جاتا ہے

میر حسن نے اپنی قوتِ متخیلہ کے بل بوتے پر حواس خمسہ پر مبنی شاعری کی ہے۔ وہ عشق کو جاودانی اور مسحور کن کیفیت بتاتے ہیں جو ان کے شب و روز کے رنگ و آہنگ میں جادوئی کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔ ان کا مزاج تصویروں کا شوقین ہے۔ ان کی شاعرانہ معراج کا ثبوت ان کی مثنویوں میں پیش کردہ رنگا رنگ تصویریں ہیں۔ ان کے علاوہ مرثیے، رباعیات اور قصائد ہیں۔ ان سے بہتر قصیدہ گو ان کی وفات کے بعد لکھنؤ میں نہ ملتا تھا۔ انہوں نے اپنے شاعرانہ اسلوب میں اکبری دور کی فارسی کو اپنا راہبر بنایا۔ جس میں تغزل، سادہ گوئی، تصوف اور سوز موجود تھا۔ نیز حسن نے میر تقی میر کی زمین میں غزلیں کہیں اور ان کے اسلوب اور لہجے کو اپنایا۔

ـ کب میں گلشن میں باغ باغ رہا
میں تو جوں لالہ واں بھی داغ رہا
سیر گلشن کریں ہم اس بن کیا
اب نہ وہ دل نہ وہ دماغ رہا

انہوں نے نہ صرف سوداؔ، میر تقی میرؔ، اور میر دردؔ کے اثرات قبول کیے بلکہ نئے دور کے شعرأ کا کلام بھی ان کے پیشِ نظر رہا۔ نئی پود میں میر سوز اور حسرت شامل ہیں۔ میر حسن محاکات نگاری کے شائق ہیں۔

ہجراں میں انتظار بھی اس کا ہے مغتنم
جو ڈوبتا ہے اس کو تو ساحل عزیز ہے

کیونکر بھلا لگے نہ وہ دلدار دور سے
دونی بہار دیوے ہے گلزار دور سے

وہ رعایت لفظی سے اپنے احساسات کی کامیاب ترجمانی کرتے ہیں۔ وہ images کے رسیا ہیں۔ ڈاکٹر وحید قریشی میر حسن کے کلام اور لب و لہجے کا محاکمہ نفسیاتی فنِ شعر، تاریخی اور تہذیبی ہر رُخ سے کرتے ہیں۔ جس کی بدولت اس محاکے میں بڑی تابندگی اور روح پائی جاتی ہے۔ جب دیکھنے والے کی نظر ہر جہت سے آشنا ہو تو مطالعے میں اور عمق اور گہرائی پیدا ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب خود شاعر ہیں اور شاعری کے اسرار و رموز کے پارکھ ہیں۔ اس لیے ان کا ذوق شعری میر حسن کے مطالعے میں ان کا ساتھ دیتا ہے۔ پھر موسیقی اور مصوری کے بنیادی تقاضوں کے شناسا ہیں۔ جس کی وجہ سے میر حسن کے کلام کا صوت و آہنگ اور محاکات سمجھنے اور پھر اس کا تجزیہ کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔

نغمہ و عشق سے ہیں سبحہ و زنار ملے
ایک آواز سے دوساز کے ہیں تار ملے

نیرنگیاں تمام ہیں یہ نغمہ ساز کی
نغمے جو یہ نکلتے ہیں نے سے نئے نئے

مطرب غزل سرائی میں چھیڑا ہے تو نے آہ
سوجھے خیال پھر تری لے سے نئے نئے

ڈاکٹر وحید قریشی میرحسن کے محققانہ تجزیے میں نفسیات کے بنیادی اصولوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ میرحسن کے Images میں روشنی کا تاثر صاف اور واضح ہے۔ حتیٰ کہ تیز روشنی میں جو کپکپاہٹ پنہاں ہوتی ہے۔ حسن اس کا بھی ادراک رکھتے ہیں۔

ے جس طرح گرد ماہ کے ہالہ ہو جلوہ گر
یوں تن پہ خوشنما ترے دامن کا گھر ہے

ے چہرے کا عجب عالم تھا زرد دو شالے میں
ہیرا سا چمکتا تھا کندن سا دمکتا تھا

غزلیات کے علاوہ میرحسن کے ہاں فردیات کا بھی طویل سلسلہ ہے۔ رباعیات کا حصہ طویل ہے۔ اس کے علاوہ قطعات ہیں۔ واسوخت اور قصیدے بھی ہیں۔ تشبیب کا ایک حصہ نقل کیا جاتا ہے۔

ے نظر پڑا ہے اسے کون سا ہلالِ آبرو
ہوا ہے جوں مہ نوروز ناتواں مہتاب
شب چہار دہم اور ہو مے و ساتی
کہ آفتاب ادھر اور ادھر عیاں مہتاب
کون انگڑائیاں لیتا ہے چمن میں مخمور
غنچہ بھر بھر کے گلابی کرے ہے کیوں تقسیم

ڈاکٹر وحید قریشی کی تحقیق میں شبہے اور انکار کی طرز کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ وہ حقائق کو من و عن قبول نہیں کرتے۔ بلکہ سماجی، عصری، صورتحال اور شہادتوں کی مدد حاصل کر کے سچائی کو منصۂ شہود پر لاتے ہیں۔ مثال کے طور پر میرحسن کے لکھنؤ میں قیام اور سالار جنگ کے متوسلین میں شامل ہونے کو دیباچۂ افسوس اور گلزارِ ابراہیم کی مدد سے ثابت کرتے ہیں۔ ورنہ عام شہادتیں ان حقائق کی تصدیق نہیں کرتیں۔ ان کے ماحول اور

ذاتی زندگی کی تہہ تک پہنچ کر پیچیدہ اور گھمبیر واقعات کا جائزہ لیتے ہیں۔

اس دور کے تہذیبی ماحول کو تاریخی تناظر میں دیکھنے کا رجحان ان کا مخصوص تحقیقی انداز ہے۔ جو میر حسن کے زمانے جائزہ لیتے ہوئے ان کے ساتھ ساتھ رہتا ہے۔

ڈاکٹر وحید قریشی کی کتاب ''مقالاتِ تحقیق'' کے عنوان سے مارچ ۱۹۸۸ء میں مغربی پاکستان اُردو اکیڈیمی ۳۰۷ این۔ سمن آباد لاہور سے شائع ہوئی۔ اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد نے بھی مالی وسائل مہیا کیے اور اس کتاب کی اشاعت کو ممکن بنایا۔ اس کتاب کے مضامین تحقیقی ہیں۔ اس تحقیقی جائزے میں جو مضامین شامل ہوئے ان میں مندرجہ ذیل عنوانات شامل ہیں۔

۱۔ پاکستان میں اردو تحقیق کے دس سال ۱۹۵۸ء تا ۱۹۶۸ء پنجاب یونیورسٹی کا ایک تحقیقی مطالعہ۔

۲۔ مثنوی کدم راؤ پدم راؤ

دیوان شوقی ایک جائزہ

۳۔ حالاتِ حسن کے دو ماخذ

سحر البیان کا ایک نادر قلمی نسخہ

میر حسن اور سحر البیان

خوان نعمت۔ ایک محاکمہ

مقدمہ مثنویات میر حسن

مقدمہ دیوان جہاندار شاہ

۴۔ مقدمہ کلام آتش۔ ایک جائزہ

گلستان سخن۔ ایک تجزیہ

۵۔ بنیادی اُردو ایک تجزیہ

حوالہ جات، قانونِ فوجداری پر ایک طائرانہ نظر

مشرق میں فہرست سازی کی روایت

کتابیات تحقیق و تنقید

کتاب نامۂ شبلی پر ایک نظر

۶۔ فن تاریخ گوئی

ان مختلف نوعیت کے مضامین میں بنیادی پہلو ایک ہے اور وہ یہ کہ اردو میں تحقیق و تدوین کی صورتحال کیا ہے اور موجودہ دور میں کن خطوط پر تحقیق کا عمل رواں دواں ہے۔

ڈاکٹر وحید قریشی کا اپنا تحقیقی مطمعٔ نظر کیا ہے اور وہ تحقیق کے کس دبستان کے رکن، بانی یا پیروکار ہیں۔ حافظ محمود شیرانی، مولوی عابد علی عابد، محمد شفیع اور ڈاکٹر سید عبداللہ کے اثرات کے باوجود انہوں نے اپنے لیے جداگانہ اور منفرد راہ نکال لی ہے۔ اس کے علاوہ وہ کثیر المطالعہ محقق اور نقاد ہیں۔ اس مطالعے نے ان کے ذہن کو کشادگی، شعور کو پختگی اور جامعیت عطا کی ہے۔ اس طرح ان کے خیالات کو وسعت ملی ہے۔ مطالعہ کے تنوع کی بدولت وہ یک رخے مطالعے سے دور رہ کر مختلف علوم وفنون اور فکر و فلسفہ کو اپنے نظریات کے اندر سمونے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ ان کے محققانہ اسلوب اور شعور کی بدولت ہماری زبان و ادب میں تسلسل اور ربط پیدا ہوا ہے۔ تنقیدی تحریروں، افکار اور مطالعوں کی بدولت ان کی تحقیق کی بنیادیں راست خطوط پر قائم ہیں اور ان کی تحقیق میں 'توازن' اور اعتدال ہے۔ وہ اپنی پسند کی شخصیات کا تذکرہ کرتے ہوئے بھی مبالغہ آرائی سے گریز کرتے ہیں۔ کہیں بھی ذاتی مغالطے یا عدمِ توازن کا شکار نہیں ہوتے لیکن اس کے باوجود ان کا اپنا ذاتی نقطۂ نظر یا زاویۂ نگاہ موجود ہوتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی تحقیق میں ذہن اور تخیل دونوں کارفرما ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے استخراج نتائج میں تسلسل اور نظم و ضبط موجود ہے۔ ان کی تحقیق میں غور و فکر کے ساتھ ساتھ تجزیے کا عنصر بھی موجود ہے اور یہ عنصر بھی سائنسی اور استدلالی ہے۔ ادب کے استاد ہوتے ہوئے بھی وہ کہیں کہیں ایک محتسب کی طرح اپنے موضوع یا زیرِ تحقیق شخصیت اور اس کے حالات کا جائزہ لیتے ہیں اور ایک بالترتیب طریقۂ استدلال کی روشنی میں اس

موضوع کو پرکھتے ہیں۔ لیکن ان کے موضوعات کو ان کی اسی طرح کی طرزِ تحقیق نے قابل قبول بلکہ لائق صد تحسین بنایا ہے۔

مثلاً 'ہوز' کے استعمال کا مسئلہ زیرِ بحث ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے اس دور کے قلمی نسخوں کی مدد سے یہ ثابت کیا کہ یہ قیاس شدہ متن ہے۔ اس میں کاتب کی غلطی بھی شامل ہوسکتی ہے اور نسخے کی املا گیارہویں صدی کے اوائل میں ہوئی ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ نویں صدی میں اس کا استعمال مشکوک نظر آتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے زبان و بیان کے مسائل کے حل کے لیے لیبارٹری کے قیام پر بھی زور دیا ہے۔ جس کی بدولت متن کے تعین میں مرتب کی دشواریاں کم ہوسکتی ہیں۔ دیوانِ حسن شوقی میں شوقی کی تیس غزلیں اور ایک نظم شامل ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے انجمن ترقی اردو کراچی سے شوقی کا یہ کلام لے کر ترتیب دیا۔ اس کا تجزیہ کرتے ہوئے ڈاکٹر وحید قریشی ڈاکٹر جمیل جالبی کے فنِ تحقیق پر روشنی ڈالتے ہیں۔ جس سے ان کے اصولِ تحقیق کے بارے میں بھی پتہ چلتا ہے کہ تحقیق وتنقید ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں۔

> جمیل جالبی ایک نقاد کی حیثیت سے شہرت رکھتے ہیں۔ اس کتاب سے ان کے مزاج کا دوسرا رخ سامنے آتا ہے۔ تحقیق وتصحیح کا یہ اہتمام جو انہوں نے کیا ہے اس کی توقع کسی نقاد سے نہیں کی جاسکتی۔ اس لیے کہ تحقیق اور تنقید اُردو میں اس طرح الگ الگ خانوں میں بٹ چکے ہیں کہ نقادوں کے نزدیک تحقیق محض میکانکی عمل ہے۔[۲۴]

گویا ڈاکٹر وحید قریشی نے تحقیق کے بارے میں تصورفن کی عکاسی کردی ہے کہ تصحیح میں محنت، ژرف نگاہی، احتیاط اور قدیم متون سے واقفیت ازحد ضروری ہے۔ صحتِ متن کے لیے اگر ان اصولوں کا اہتمام نہ کیا جائے تو کسی بھی نئی دریافت کی لسانی اور ادبی حیثیت کو متعین نہیں کیا جاسکتا۔ ڈاکٹر وحید قریشی 'شعرا اور ادبا' کو ان کے عہد کی روایت سے الگ کرکے دیکھنے کے قائل نہیں۔ وہ ناقابلِ تردید دلائل کے استعمال سے قاری کو حیرت میں ڈالنے اور اس کو اس مقام تک لے جانے کے حامی ہیں جب وہ محقق کا ہمنوا ہو جائے اور یہ اسلوب تحقیق ان کے اپنے محققانہ عمل کو ایک خاص شان اور عمدگی عطا کرتا ہے۔ وہ اپنی تحقیق کے دوران عہد بہ عہد لسانی تجربات اور تبدیلیوں کا تذکرہ بھی کرتے ہیں۔ اس طرح ان کی تحقیق لسانیات کی جامع تاریخ بھی بن جاتی ہے۔ اس کی مثالیں میر حسن اور ان کا زمانہ سے بھی پیش کی گئی تھیں اور اب مقالاتِ تحقیق میں بھی جگہ جگہ

ان کے فن کا یہ پہلو نمایاں ہے۔ مثال کے طور پر دیوانِ شوق کے تجزیے ہیں۔ جو امر ان کے لیے باعثِ مسرت ہے وہ اس کی یہ خصوصیت ہے کہ اس میں املا سے متعلق مباحث کو اہمیت دی گئی ہے۔ اس سے ڈاکٹر وحید قریشی کی اُردو زبان اور لسانیات سے طبعی مناسبت بھی ظاہر ہوتی ہے۔ وہ ان امور میں ڈاکٹر جمیل جالبی سے اپنے اختلاف کا برملا اظہار بھی کرتے ہیں کہ ان الفاظ کا استعمال ان کے پیش کردہ زمانے میں درست نہیں۔ مثال کے طور پر ڈاکٹر وحید قریشی رقم طراز ہیں:

> زیرِ تبصرہ کتاب کی تیسری اہم خصوصیت املا سے متعلق مباحث ہیں۔ مثلاً حرفِ اضافت کی بجائے ''ے'' کا استعمال جیسے منارے عظیم (منارِ عظیم) شہے شیر مرد (شہہ شیر مرد) شہے نامدار (شہہ نامدار) وغیرہ کے عام استعمال کا اقرار کرتے ہوئے ان کا خیال بالکل صحیح ہے کہ یہ اسلوب اس دور میں عام ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بارہویں صدی ہجری کے وسط تک ہمیں اردو کے جو قلمی نسخے ملتے ہیں۔ ان میں حرفِ اضافت کی بجائے ''ے'' کا استعمال جاری ہے اور اس رجحان کی روشنی میں ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ اردو کا بنیادی لسانی مزاج صوتی اعتبار سے ''ے'' اور حرف اضافت کو ایک ہی چیز سمجھتا ہے۔ معلوم نہیں جالبی صاحب اس سے اتفاق کریں گے یا نہیں کہ اگر شمالی ہندوستان میں فارسی کی لسانی روایت زیادہ قوی نہ ہو گئی ہوتی تو حرفِ اضافت کی بجائے ''ے'' کا استعمال آج بھی عام ہوتا۔ [۲۵]

اس کتاب میں ایک مضمون حالاتِ حسن کے دو ماخذوں کے بارے میں ہے۔ جس میں ڈاکٹر وحید قریشی نے ''دیباچہ دیوانِ حسن'' اور ''دیباچہ سحر البیان'' از شیر علی افسوس پر بحث کی ہے۔ دیباچہ 'دیوانِ میر حسن' فارسی زبان میں ہے جس کی مائیکروفلم کے ذریعے ڈاکٹر وحید قریشی نے اس کے ترجمے کے ساتھ اس کا موازنہ کیا ہے۔ مرزا علی حسن کے ترجمے میں ڈاکٹر صاحب نے کئی اغلاط کی تصحیح کی ہے۔

دیباچہ میر حسن کے کئی تراجم ہوئے لیکن برٹش میوزیم کے مائیکروفلم کے متن سے یہ تراجم کیوں مختلف ہیں؟ ڈاکٹر وحید قریشی نے نہایت دقت نظری سے یہ ثابت کیا ہے کہ یہ دیباچہ 'سحر البیان' پہلی بار ۱۸۰۳ء سے کلکتے میں شائع ہوا اور آغاز میں چھپنے والے سحر البیان کے ایڈیشنوں کے شروع میں چھپتا رہا۔ مثال کے طور پر

اورینٹل کالج میگزین اگست سنہ ۱۹۲۶ء کے شمارے میں ڈاکٹر مولوی محمد شفیع صاحب نے ایک قلمی نسخے سے اس کا خاصا حصہ شائع کر دیا۔ ان کے علاوہ احمد اللہ قادری نے ۲۷ رمضان سنہ ۱۳۵۲ھ میں شمس الاسلام پریس حیدر آباد دکن سے مثنوی رموز العارفین کے ساتھ اس کو شائع کر دیا۔ مولانا عبد الباری آسی مرحوم نے مثنویات میر حسن کے ساتھ اسے بھی شائع کرایا۔ ان تمام دیباچوں کی اشاعت کے مطالعے کے بعد جب ڈاکٹر وحید قریشی نے مائیکروفلم برٹش میوزیم سے استفادہ کیا تو اس میں کچھ تبدیلیاں نظر آئیں۔ اس ضمن میں ڈاکٹر وحید قریشی لکھتے ہیں:

> برٹش میوزیم کے نسخے کی مائیکروفلم کو بغور دیکھنے پر معلوم ہوا ہے۔ یہ مطبوعہ متن سے بعض جگہ مختلف ہے اور کچھ عجب نہیں جو مصنف کے اولین مسودے کی نقل ہو۔ اختلافات کو آسی کے ایڈیشن سے فٹ نوٹوں میں پیش کیا جا رہا ہے۔ ۲۶

یہ نسخہ کرنل جارج ہملٹن کی وساطت سے برٹش میوزیم پہنچا۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے اس کے بعض حصوں کا مقابلہ واقعاتِ انیس کے اقتباسات اور کلیات حسن مخزونہ رضا لائبریری رام پور کے اقتباسات سے بھی کیا ہے۔ اس کے علاوہ کلیات حسن (رضا لائبریری) کے اقتباسات انہوں نے بیاضِ فائق (کلب علی خاں) سے حاصل کیے ہیں اور انہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ان کی تصدیق عابد رضا خاں صاحب کے ذریعے کتاب خانہ رام پور سے بھی کی۔ بلکہ نسخۂ رام پور کے سر ورق کی عبادت سے ہی ان کو اندازہ ہوا کہ یہ خاندانی نسخہ ہے۔ برٹش میوزیم کے نسخے کے فرق پر ڈاکٹر صاحب یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ یہ کاتب کی غلطی ہے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر صاحب نے جن ماخذوں سے استفادہ کیا۔ ان میں گلشنِ ہند، تاریخِ اودھ نجم الغنی Later Mughals جلد چہارم، دستور الفصاحت احمد علی یکتا اور آرائشِ محفل، افسوس قابلِ ذکر ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کا اگلا مضمون۔

’’سحر البیان کا ایک نادر قلمی نسخہ‘‘ ہے۔ میر حسن کی مثنوی ’سحر البیان‘ جو اپنے اسلوب کی جدت، زبان و بیاں کی سادگی اور محاورے کی قبولیت کی بدولت بے شمار دفعہ شائع ہوئی۔ اس کے لا تعداد قلمی نسخے دنیا کی بڑی لائبریریوں میں موجود ہیں۔ بلکہ کئی کتب خانوں میں تو اس کے مصور نسخے بھی موجود ہیں۔ اس مثنوی کو ڈرامے کی شکل میں بھی ڈھالا گیا۔ اس کے بارے میں طرح طرح کی باتیں مشہور ہوئیں۔ ڈاکٹر وحید قریشی

فرماتے ہیں:

> افسانہ طرازی کی اس فضا میں سحر البیان کے لاتعداد نسخے رقم ہوئے اور شہر شہر گاؤں گاؤں اس کی شہرت ہوئی اب تک ہزاروں کی تعداد میں مثنوی شائع بھی ہو چکی ہے۔ اس وقت تک راقم الحروف کو اس کی ۴۸ اشاعتوں کا حال معلوم ہے۔ جو کتاب اس کثرت سے قلمی صورت میں اور اس کے بعد مختلف اشاعتوں کے مرحلے سے گزری ہو اس کے متن میں بعض جزئی اختلافات کا پیدا ہو جانا عین ممکن ہے۔ مثنوی کے مستند اور غیر مستند نسخے کثرت سے ملتے ہیں۔ اس لیے متن کی تصحیح میں مرتبین کو خاصی دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔[۲۷]

ڈاکٹر صاحب نے تحقیق کے بعد ان نسخوں میں سے چند مستند اور درست متن والے نسخوں کا انتخاب پیش کیا ہے۔

۱۔ فورٹ ولیم کالج کا نسخہ ۱۸۰۳ء

۲۔ مطبع جعفری بمبئی ۱۲۶۹ھ/۱۸۵۲ء

۳۔ مخزن پریس دہلی کا نسخہ ۱۹۰۸ء

۴۔ نولکشور کا نسخہ مرتبہ آسی ۱۹۴۵ء

۵۔ شمس بریلوی کا مرتبہ نسخہ ۱۹۴۷ء

متن کی صحت اور درستگی کے لحاظ سے فورٹ ولیم کی اشاعت والا نسخہ قابل اعتماد اور درست ہے۔ قدامت کے اعتبار سے ڈاکٹر وحید قریشی نے مندرجہ ذیل نسخوں کے نام پیش کیے ہیں۔

۱۔ ۱۱۹۹ھ کا مکتوبہ نسخہ در کتاب خانہ انجمن اردو کراچی

۲۔ ۱۲۰۸ھ کا مکتوبہ نسخہ در کتاب خانہ نواب سالار جنگ حیدر آباد دکن

۳۔ ۱۲۰۹ھ کا مکتوبہ نسخہ در کتاب خانہ انجمن ترقی اردو کراچی

''سحر البیان کا ایک نادر قلمی نسخہ'' میں ڈاکٹر وحید قریشی نے سحر البیان کے لا تعداد نسخوں اور اس کی ڈرامائی تشکیل دیے جانے والے حصوں کو مد نظر رکھا ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی ''ہندوستانی قصوں سے ماخوذ مثنویاں'' خمسۂ باطن نومبر ۱۹۹۲ء اور کتب خانہ نواب سالار جنگ مرحوم کی اردو قلمی کتابوں کی وضاحتی فہرست کو پیشِ نظر رکھا ہے۔ اس قدر مستند ماخذوں تک رسائی ان کے اصولِ تحقیق کی ایک نمایاں خصوصیت ہے۔ جس نادر قلمی نسخے کا یہاں تذکرہ کیا گیا ہے۔ اس کے بارے میں ڈاکٹر وحید قریشی فرماتے ہیں:

> سحر البیان کے ایک قلمی نسخے کا تعارف ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔ جو سب سے زیادہ قدیم اور راقم کی رائے میں میر حسن کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ اس پر میر حسن کے دستخط نہیں ہیں اور ہمارے پاس حسن کی تحریر کا کوئی دوسرا نمونہ بھی نہیں ہے جس سے ان کے خط کا اندازہ کیا جا سکے۔ اشپرنگر کی اودھ کٹالاگ میں دیوانِ حسن کے ایک نسخے کا حال درج ہے جس پر تحریر مصنف کا گمان ہو سکتا ہے۔ موتی محل (لکھنؤ) کی لائبریری میں دیوانِ حسن کے دو نسخے موجود تھے جن کا حال اشپرنگر نے دیا ہے۔ ان میں ایک کے بارے میں یہ اندراج ملتا ہے۔
>
> "An other copy in the same collection, without preface, written in a bad hand, with many crasures and correction is apparently an autograph. At the end is written in red ink, but it is not certain whether in the same hand."

اس نسخے کے سرورق یا پہلے صفحے پر قصہ فیروز شاہ قلمی، لکھا ہوا موجود ہے۔ یہ نسخہ کرم خوردہ اور بوسیدہ نسخہ ہے۔ اس نسخے میں ہمیں چار مثنویات ملتی ہیں۔ سحر البیان، مثنوی لال و گوہر، قصہ سوداگراں، قصہ پٹھان اور باہمنی۔ سحر البیان کا متن ڈاکٹر وحید قریشی کے خیال میں جسے انہوں نے بعد میں داخلی شواہد سے ثابت بھی کیا ہے میر حسن کا ذاتی مسودہ ہے جس پر مصنف نے ترمیم و اصلاح کی ہے۔ یہ شواہد ڈاکٹر وحید قریشی نے میر حسن

کی سحر البیان کے دیگر نسخوں کو سامنے رکھ کر تیار کیے ہیں۔ اس قلمی نسخے میں جو ڈاکٹر صاحب کے پیشِ نظر رہے ہیں۔ بعض اشعار مصنف نے متن سے خارج کر دیے ہیں اور وہ اشعار اب دیگر نسخوں میں موجود نہیں ہیں۔

بعض اشعار میں ترمیم و اصلاح مصنف نے خود کی ہے اور بعض اشعار کے قافیئے بدل دیے گئے ہیں۔ بعض اشعار حاشیے میں بڑھا کر لکھ دیے گئے ہیں۔ ان بنیادی تبدیلیوں کے بعد اشعار کو درست کر کے اس قلمی نسخے میں لکھا گیا ہے۔ اس کے علاوہ بعض اشعار ایسے بھی ہیں جو اس نسخے میں تو موجود ہیں۔ لیکن دیگر کئی نسخوں میں نہیں پائے جاتے۔ اکثر اشعار میں شاعر نے مصرعوں میں ترمیم کر کے بندشوں کو رواں اور چست بنایا ہے۔

ڈاکٹر وحید قریشی نے چند مثالیں پیش کی ہیں۔

ے ہوئی شب لیا مہ نے جامِ شراب
گیا سجدہ میں شکر کر آفتاب

ترمیم کے بعد:

ے ہوئی شب لیا مہ نے جام شراب
گیا سجدۂ شکر میں آفتاب

ڈاکٹر وحید قریشی نے چند ایک مثالیں ایسی پیش کی ہیں۔ جن میں قوافی بھی بدل گئے ہیں۔

ے رہ حمد میں تیری عز و شرف
تجھے سجدہ کرتا چلوں سر ہدف

تبدیلی کے بعد:

ے رہِ حمد میں تیری اے عزوجل
تجھے سجدہ کرتا چلوں سر کے بل

کئی اشعار میں اندرونی مطالب میں بھی بنیادی تبدیلیاں موجود ہیں۔ لیکن ایسی تبدیلیاں ہیں۔ جو

مصنف ہی کیا کرتے ہیں۔ یہ تمام قرائن و شواہد یہ ثابت کرتے ہیں۔ کہ سحر البیان کا مذکورہ بالا نسخہ مصنف ہی کا مسودہ ہے۔ سحر البیان کے علاوہ بھی تین مثنویاں اس نسخے میں موجود ہیں۔ جو میر حسن کی وفات سے قبل تصنیف ہو چکی تھیں۔ اس سے یہ بھی ثابت ہو جاتا ہے کہ یہ نسخہ میر حسن کا حتمی نسخہ ہے۔

مقالاتِ تحقیق کا اگلا مضمون ''میر حسن اور سحر البیان'' ہے۔ اس مضمون میں میر حسن کے فن پر بحث کے ساتھ ساتھ سحر البیان کی معنوی و لفظی خوبیوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مضمون کا آغاز ڈاکٹر وحید قریشی نے عہد حسن کے خاندانی پس منظر اور تعلیم عقائد سے کیا ہے۔ ان کی ابتدائی شعری تربیت میں خواجہ میر دردؔ کا ہاتھ ہے۔ پھر میر ضیاء الدین ضیاء سے کسب فیض کیا۔ میر حسن کے دیگر حالات مختصراً بیان کیے ہیں اور یہ ایسی تفصیل کا اجمال ہے جو ''میر حسن اور ان کا زمانہ'' میں بھی موجود ہے۔ مثنوی نگاری میں میر حسن کا فن کن کن مراحل سے گزرا۔ ان کے لب و لہجے میں ہمواری کس طرح پیدا ہوئی اور پھر ان کے تجربات میں وسعت اور تنوع کیونکر پیدا ہوئے۔ ان کے ہاں بول چال کا انداز اور ڈرامائی اشارات پائے جاتے ہیں۔ میر حسن کے ہاں مادی زندگی سے گہرا لگاؤ بھی موجود ہے۔ اس کی ایک وجہ شاید سالار جنگ سے قلیل تنخواہ کا ملنا اور پھر اس کے نتیجے میں پائی جانے والی مشکلات کا تذکرہ بھی موجود ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے میر حسن کی شاعری کو تین ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ ان میں تیسرا دور ہی زیادہ تنوع اور مہارت کا حامل ہے اور اسی دور میں انہوں نے سحر البیان تصنیف کی جس میں ان کا تصویر کاری کا رجحان زیادہ زیادہ کھل کر سامنے آتا ہے۔ سحر البیان ایک خیالیہ ہے۔ اس میں تدریسی رجحان بھی موجود ہے لیکن اصل میں میر حسن نے اپنی نا تمام خواہشات کے نکاس کے لیے بھی ''سحر البیان'' کو ایک وسیلہ بنایا ہے۔ اس داستان میں محیر العقول کارنامے بھی ہیں اور زندگی کا ہر پہلو اصل سے زیادہ خوبصورت ہے۔ کیونکہ یہ صرف ایک طبقے کی طرزِ زندگی کا آئینہ ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے اس مضمون کی تکمیل کے لیے سید احتشام حسین کے 'تنقیدی جائزے' مثنوی سحر البیان ایک تہذیبی مطالعہ از رضیہ سلطانہ، مقالہ سحر البیان تنقیدی از گوپی چند نارنگ جلد دوم اور دیگر مقالوں کو سامنے رکھتے ہوئے اپنا تحقیقی نقطۂ نظر مرتب کیا ہے۔ اس سے ڈاکٹر صاحب کا اصولِ تحقیق پتہ چلتا ہے کہ وہ تحقیق میں نئے راستے اور انفرادیت کے حامی ہیں۔ ان کے مقالات میں یہ خصوصیت صاف جھلکتی ہے۔ وہ کسی بھی فن پارے کی تکنیکی باریکیاں سلجھاتے ہوئے اسے زندگی کی بنیادی قدروں سے ہم آہنگ کر دیتے ہیں۔ وہ کثیر المطالعہ محقق ہیں۔ اس لیے ان کی تحقیق میں کوئی

پہلو تشنہ نہیں رہتا۔ وہ بندھے ٹکے اصولوں کے پیروکار نہیں بنتے بلکہ اپنی جودت طبع اور اپج کی بدولت ایک نئی راہ متعین کرتے ہیں۔ جو آنے والے محققین کے لیے بھی سنگِ میل کا درجہ رکھتی ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی کا اگلا مضمون ''خوانِ نعمت'' ایک محاکمہ ہے جس میں ڈاکٹر صاحب نے ''ماہِ نو'' اکتوبر ۱۹۶۴ء کے شمارے میں جناب عبادت بریلوی کی شائع کردہ مثنوی 'خوانِ نعمت از میر حسن' پر تبصرہ کیا ہے۔ یہ مضمون ڈاکٹر وحید قریشی کے اسلوبِ تحقیق اور اندازِ تحقیق کا آئینہ ہے۔ اس اس میں ہم ڈاکٹر صاحب کے اصول وضوابط کا عکس شفاف انداز میں دیکھ سکتے ہیں۔ یہ اصول وضوابط وہ نہ صرف دوسروں کے لیے، آنے والے نقادوں اور محققین کے لیے بلکہ اپنے لیے بھی تجویز فرماتے ہیں۔ وہ تحقیق کے فن میں دقّت نظری کے قائل ہیں۔ اس کام میں دشوار ترین مرحلہ وہ ہے جب ایک ہی متن کے کئی نسخے موجود ہوں اور ان میں مستند اور غیر مستند کا فیصلہ کرنا باقی ہو۔ اسی طرح کوئی بھی متن ترتیب دیتے وقت قلمی نسخوں کی عبارتوں پر مناسب توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ مطبوعہ نسخوں میں بھی مرتب کی غلطیوں کی طرف توجہ لازم ہے۔ اسی طرح تحقیق کی بنیاد قیاس پر نہیں رکھی جا سکتی۔ قیاس میں شک وشبے کا عنصر پایا جاتا ہے۔ جو تحقیق کی صداقت واقعیت اور شان کے خلاف ہے۔ میر حسن کے وہ کلیات جن پر ڈاکٹر عبادت بریلوی نے تمہید لکھی اور ایک مثنوی کو شائع کیا اس میں بھی بہت سے حقائق سامنے نہیں آتے۔ یا اس شکل میں نہیں آتے۔ جو ڈاکٹر صاحب بیان فرماتے ہیں۔ مثلاً میر حسن کی فارسی میں مہارت، میر ضاحک کی فارسی شاعری کی مقبولیت، میر حسن کا ثقاہت کو ہاتھ سے جانے نہ دینا۔ میر حسن کا اپنے کلام اور قلب ونظر میں درود وگداز رکھنا، یہ تمام امور ایسے ہیں۔ جن کے لیے میر حسن کا کلام واضح ٹھوس شہادت پیش نہیں کرتا۔ اسی طرح ڈاکٹر وحید قریشی نے تحقیقی زاویے سے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ برٹش میوزیم میں پایا جانے والا سحر البیان کا قلمی نسخہ وہی ہے جو شاہان اودھ کے پاس رہا۔ انہوں نے اس مقصد کے لیے برٹش میوزیم کا مائیکروفلم حاصل کیا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مذکورہ نسخہ جارج ہملٹن کے پاس تھا اور یہ ۱۲۵۹ھ میں نقل ہوا۔ الفاظ وبیان میں ڈاکٹر وحید قریشی کا مطالعہ گہرائی کا حامل ہے۔ انہوں نے جہاں عبادت بریلوی کے مقدمے پر اعتراضات وارد کیے ہیں۔ وہاں انہوں نے مثنوی کے متن میں پائی جانے والی اغلاط کی نشاندہی بڑی تفصیل سے کر دی ہے۔ مثلاً مثنوی کا متن درست طور پر شائع نہیں ہوا۔ بلکہ شائع ہونے سے قبل درست مرتب بھی نہیں ہوا۔ بعض مقامات پر سوالیہ نشان بھی ہیں اور کہیں کہیں سوالیہ نشان نہیں ہیں لیکن غلطیاں موجود ہیں۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے ان غلطیوں کی تصحیح کے لیے ''مثنویات میر حسن'' کے حواشی کی طرف رجوع کرنے کی تاکید کی ہے۔

یائے معروف اور یائے مجہول کے استعمال کے بارے میں بھی ہدایات دی ہیں۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے ایک طرف اشعار کی درست صورت اور اس کے سامنے ڈاکٹر عبادت بریلوی کی اغلاط کی نشاندہی کی ہے۔

ایک مضمون کا عنوان ''مقدمہ مثنویاتِ میر حسن'' ہے جس میں ڈاکٹر وحید قریشی نے میر حسن کے دہلی چھوڑنے اور فیض آباد میں جا کر رہائش پذیر ہونے کا احوال رقم کیا ہے۔ اس میں سنہ اور تاریخ کی صحت کے لیے کئی معاصر شہادتوں کے علاوہ خود میر حسن کے احوال کا حوالہ بھی دیا ہے لیکن ان شہادتوں میں ڈاکٹر وحید قریشی نے اس امر کا التزام کیا ہے کہ کہیں بھی واقعات کا تاریخی تسلسل ٹوٹنے نہ پائے اور پھر سنین کو بھی انہوں نے اس دور کے تذکروں میں تلاش کیا ہے۔

ڈاکٹر وحید قریشی نے میر حسن کے فن کی مختلف جہتوں کو مدلل انداز میں پیش کیا ہے اور ان کو مختلف ادوار میں تقسیم کر کے ان کے فنی وفکری ارتقاً کا جائزہ لیا ہے میر حسن کی غزلیات کا دیوان، دیگر اصنافِ شعری اور مثنویات گویا ان کے فن کا ہر پہلو دل پذیر وخوش آہنگ ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر وحید قریشی نے اس حقیقت کو بھی پیش کیا ہے کہ ''سحر البیان'' میر حسن کی آخری تصنیف ہے جس کی انہوں نے طویل مدت صرف کر کے تشکیل وتعمیر کی۔ حسن خود لکھتے ہیں۔

زبس عمر کی اس کہانی میں صرف
تب ایسے یہ نکلے ہیں موتی سے حرف
جوانی میں جب ہو گیا ہوں میں پیر
تب ایسے ہوئے ہیں سخن دل پذیر

اس مثنوی کی تکمیل کی تاریخ ڈاکٹر وحید قریشی نے ایک بڑی ٹھوس معاصر شہادت سے لی ہے۔ یعنی سودا کا بیان اور سودا کی وفات کا سن رجب ۱۱۹۵ء ہے۔ اس اعتبار سے مثنوی ۱۱۹۵ء تک مکمل ہو چکی تھی۔ لیکن یہ ایک تذکرہ نگار کا بیان ہے اور اس کو ڈاکٹر صاحب اس قدر مستند بھی تصور نہیں کرتے۔

شک کا یہ رجحان ان کی تحقیق میں صداقت کی تلاش کے عمل کو اور بھی طویل اور دشوار تر کرتا ہے لیکن اس کے لیے کتب خانہ لکھنؤ یونیورسٹی، کے پانچ قلمی نسخوں کا تذکرہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر صاحب کی تحقیق

کے مطابق اس مثنوی کے ۵۳ قلمی نسخے ہیں۔ اس مضمون میں ان مخطوطات کے رسم الخط کے بارے میں فرداً فرداً بیان کیا ہے۔ ان نسخوں میں کتنے اوراق ہیں اور ان نسخوں کے کاتب اور مرتب کون کون ہیں۔ یہ نسخے کہاں کہاں موجود ہیں۔ان کتب خانوں کے پتوں کی فہرست بھی مہیا کی گئی ہے۔

اگلا مضمون ''جہاندار شاہ'' کے عنوان سے ہے۔ اسی تحقیقی مضمون میں ڈاکٹر وحید قریشی نے خانوادۂ تیموری کے شہزادہ جواں بخت جہاندار شاہ کے حالات پر روشنی ڈالی ہے۔ یہ علم و ادب کی سرپرستی کرنے والا خاندان تھا۔ اس کے علاوہ رزم و بزم دونوں میدانوں میں کمالات دکھانے والا یہ خانوادہ شعری ذوق سے بھی مالا مال تھا۔ اس سلسلے میں بابر کی توزک اور ترکی دیوان، ہمایوں کی ریاضی و نجوم پر دسترس اور فارسی علم و ادب کے گوشوں پر عبور، شہزادہ کامران کا فارسی دیوان اور گلبدن بیگم کا ہمایوں نامہ ادب میں آج بھی یادگار ہیں۔ اس کے علاوہ داراشکوہ کی 'سرِ اکبر' 'سفینۃ الاولیا'، اور سکینۃ الاولیاؑ کے علاوہ منظوم فارسی کلام بھی ادب میں بے مثال اور یادگار ہیں۔ اس کے علاوہ جہاں آراؑ بیگم کی مونس الارواح اور اورنگزیب کے خطوط بہترین فارسی نثر کے آئینہ دار ہیں۔ اس مضمون میں ڈاکٹر وحید قریشی نے صرف جہاندار شاہ کی تاریخ پیدائش اور دیگر احوال کا درست سنین کے حوالے سے تعین کیا ہے۔ فرینکلن نے History of Shah Aulum (1798) میں جہاندار شاہ کی تاریخ پیدائش ۱۷۴۰ء کے لگ بھگ قرار دی ہے لیکن 'واقعات اظفری' میں اظفری ۱۱۶۶ھ جب کہ امتیاز علی خان عرشی نے ''نادرات شاہی'' میں ۱۷۴۹ء قرار دی تھی۔ 'طبقات الشعرا' میں جہاندار شاہ کی جواں مرگی کا تذکرہ کیا گیا ہے جس سے ان کی عمر کا تعین بھی ہو جاتا ہے جو بہرحال ۴۰ سال سے کم رہی ہوگی۔ اس کے علاوہ دیگر شہادتوں کی روشنی میں ڈاکٹر وحید قریشی نے جہاندار شاہ کا شجرۂ نصب بھی متعین کیا ہے۔ بعد ازاں انگریزوں کی حکمرانی، مغل زوال اور خود جہاندار شاہ کا حکومت سے الگ ہو کر اطمینان کی زندگی گزارنا وغیرہ یہ تمام واقعات ڈاکٹر صاحب نے 'جہانداد شاہ' پر تحقیقی مضمون میں جمع کر دیے ہیں۔ جہاندار کی آل اولاد اور صاحبزادوں کے کارناموں پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

اگلا مضمون ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی کے مقدمہ کلام آتش کا تحقیقی جائزہ ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی اس مقدمے میں ڈاکٹر صاحب کے دریافت کردہ نئے زاویۂ تحقیق کے بارے میں فرماتے ہیں کہ کلام آتش کے مطالعے کا نیا انداز ڈاکٹر خلیل الرحمٰن نے دریافت کیا۔ اسی مقدمۂ کلامِ آتش کے دیباچے میں پروفیسر آل احمد

سرور کا تحریر کردہ دیباچہ بھی ہے جو ان کے پُر جوش اندازِ تحقیق کا ایک نمونہ ہے۔ اعظمی صاحب کا انداز ایک محقق کا نہیں بلکہ نقاد کا ہے۔ جو بلند بانگ دعوے کسی دلیل کے بغیر کر جاتا ہے۔ بہرحال ان کا اسلوب بیان دلکش ہے۔ مقدمۂ کلام آتش کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر وحید قریشی فرماتے ہیں:

> ڈاکٹر خلیل الرحمٰن نے کتاب کو نو ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے باب میں آتش کے حالاتِ زندگی ترتیب دیے گئے ہیں۔ دوسرے باب میں آتش کے بارے میں نقادوں نے جو کچھ کہا ہے اس کا خلاصہ درج ہے۔ تین ابواب میں آتش کے فن کا بھرپور جائزہ لیا گیا ہے۔ چھٹے باب میں آتش کی عشقیہ شاعری، ساتویں میں خمریات، آٹھویں میں تصوف اور نویں میں مسائلِ حیات کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ۲۸

اس مقدمے کے جائزے کے دوران ڈاکٹر وحید قریشی ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی کے جن تحقیقی اصولوں کو سراہتے ہیں ان میں خود ڈاکٹر وحید کا اسلوب تحقیق کا معیار بھی جھلکتا ہے۔ وہ ڈاکٹر اعظمی کی علمیت کے قائل ہیں۔ وہ ان کے اس انداز کے مداح ہیں کہ وہ کسی بھی شخصیت کے کلام اور تخلیقات کا جائزہ اس کے حالات اور ماحول کی روشنی میں لگاتے ہیں اور اس دوران حالات و واقعات اور مذکورہ شخصیت کی تخلیقات میں ربط قائم رکھتے ہوئے بنیادی مباحث تک رسائی حاصل کر لیتے ہیں لیکن اس کے بعد ڈاکٹر وحید قریشی اپنی دقت نظری کے سبب ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی کی کئی فروگزاشتوں کا جائزہ بھی لیتے ہیں جو تحقیق کے دوران ان سے سرزد ہوئیں۔ مثلاً آتش کے سن پیدائش اور مصحفی کا ''ریاض الفصحا'' میں لکھنا کہ نواب آصف الدولہ بہادر کی شادی کی پہل ۱۸۷۶ء اور خواجہ علی بخش کے گھر میں حیدر علی آتش کا جنم لینا۔ پھر فیض آباد میں نواب محمد تقی خان کے ہاں آتش کی ملازمت اور ان کی شاعرانہ صلاحیتوں پر فخر۔ ڈاکٹر وحید قریشی کی تحقیق کے مطابق نواب محمد تقی خان کے حالات قیصر التواریخ، تاریخِ اودھ (نجم الغنی) اور تاریخِ فرح بخش میں پائے جاتے ہیں جن کے مطابق ۱۲۳۰ھ وہ زمانہ ہے جب آتش مصحفی کے شاگرد ہوئے۔ لیکن یہاں ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی کے استدلال کو غلط قرار دیتے ہوئے ڈاکٹر وحید قریشی نے مصحفی کے بیان کردہ احوال آتش کا حوالہ دیا ہے۔ جس میں ۱۲۳۰ھ سے ۱۲۳۶ھ کے مابین کا زمانہ درج ہے۔

بہرحال ڈاکٹر وحید قریشی نے ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی کے البیلے اور انوکھے اندازِ تنقید اور تحقیقی بصیرت

کو خراج تحسین پیش کیا ہے اور ان کا یہ کہنا کہ ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی کے بیانات کی صداقت پر ایمان لانا ہی پڑتا ہے۔ اس امر کا غماز ہے کہ وہ ڈاکٹر صاحب کی تنقیدی و تحقیقی بصیرت کے پوری طرح قائل ہیں۔ ڈاکٹر خلیل الرحمٰن کے اس تجزیے میں آتش کی جمالیات، صوفیانہ تصورات، تشبیہ، استعارہ، اور تاثرات پر گرفت کے مداح ہیں۔ ڈاکٹر وحید قریشی کے مطابق ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی نے آتش کے کلام کے مطالعے سے بعض بنیادی رجحانات کا تجزیہ کیا ہے۔

اگلا مضمون ''گلستانِ سخن ایک تجزیہ'' ہے۔ جس میں ڈاکٹر وحید قریشی نے شہزادہ قادر بخش صابر کے دیوان ریاضِ صابر کا جائزہ لیا ہے۔ گلستانِ سخن میں بھی اس کے حالات اور اس کی شعرگوئی کے تجزیے کے متعلق تذکرہ لکھا گیا ہے۔ لیکن صابر کے معاصر تذکرہ نگار ُریاض صابر' کو صابر کی تصنیف نہیں مانتے اور جن کا نام پیش کرتے ہیں وہ مختلف مصنفین ہیں۔ اکثریت اسے امام بخش صہبائی کی تصنیف سمجھتی ہے۔ عبد الغفور نساخ گلستانِ سخن کو صہبائی کی تصنیف قرار دیتے ہیں۔ دور حاضر میں بھی یہ اختلاف موجود ہے۔ قاضی عبد الودود رسالہ معاصر میں گلستانِ سخن کے ضمن میں مفصل رائے دیتے ہوئے گلستانِ سخن کا ایک نام آثار المعاصرین بتاتے ہیں اور اس کے مصنف کا نام قادر بخش صابر اور اس کی عبارات کو صہبائی کا مرہونِ منت بتاتے ہیں لیکن فرمان فتحپوری اس رائے کو تسلیم نہیں کرتے اور قاضی عبد الودود پر تنقید کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ گلستانِ سخن صابر کی تخلیق ہے۔ لیکن ڈاکٹر وحید قریشی مذکورہ بالا تمام اصحاب پر تنقید کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> معاصر شہادتوں کی موجودگی میں فرمان فتحپوری کی رائے قابلِ تسلیم نہیں گلستانِ سخن کے ابتدائی ۲۰۳ صفحات میں جو بحثیں اُٹھائی گئی ہیں۔ وہ صہبائی کے سوا کوئی دوسرا نہیں کر سکتا۔ صہبائی کی اپنی تحریریں موجود ہیں اس لیے یہ بحث محض دلائل کی حد سے گزر کر واقعات اور عبارات کی مدد سے طے پا سکتی ہے۔ ۲۹

صابر نے امام بخش صہبائی سے تلمذ ضرور کیا لیکن ان کا تذکرہ خود اپنا لکھا ہوا ہے۔ جس میں اُنہوں نے زبان کے ارتقاء اور علم عروض و قافیہ اور اقسام نظم کا مفصل جائزہ لیا ہے۔ گلستانِ سخن میں ۵۴۰ شعراء کے مستقل تراجم موجود ہیں۔ فارسی اور اُردو شعرا کے اشعار ہیں۔

بیرونی مشاہیر کو کثرت سے نظر انداز کیا گیا ہے۔ بلکہ دہلی کے بھی اکثر شعرا کو گلستانِ سخن میں داخل

نہیں کیا گیا۔ شاعروں کے تراجم کے ساتھ ساتھ جو اشعار ہیں ان کی تعداد فارسی میں ۹۲۹ ہے۔ اُردو ۳۶۱۴ اور مخمس کے ۲۶ بند ہیں۔ اس کے علاوہ کسی دوسرے شاعر کے اشعار کسی اور شاعر سے منسوب کیے گئے ہیں لیکن عبارت میں رواں اردو کہیں نہیں۔ نا مانوس عربی و فارسی مفردات اور مرکبات موجود ہیں۔ شاعروں کے حالات پر بھی صابر نے زیادہ روشنی نہیں ڈالی اور ان کے دور کے نمایاں رجحان یعنی الفاظ پر خیالات کی فوقیت کا مزاج یہاں بھی جھلکتا ہے۔

''مقالات تحقیق'' میں ایک مضمون ''بنیادی اُردو ایک تجزیہ'' ہے جس میں ڈاکٹر وحید قریشی نے ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کی تیار کردہ بنیادی اُردو جو کہ مرکزی بورڈ کی تجویز کے مطابق تیار کی گئی ہے، کو پیش کیا ہے۔ یہ ان بنیادی الفاظ کی فہرست ہے جو روز مرہ بول چال میں استعمال ہوتے ہیں لیکن یہ الفاظ شاید صرف ان لوگوں کے لیے ہیں جن کی مادری زبان اردو نہیں اسی لیے اس فہرست کو انگریزی کی طرز پر ترتیب دیا گیا ہے۔ اس مضمون کے تجزیے میں ڈاکٹر وحید قریشی نے ان بنیادی طریقوں کی نشاندہی کی ہے جو کسی لغت کو ترتیب دینے کے لیے بروئے کار لائے جانے چاہئیں لیکن جن کا استعمال اس لغت کی ترتیب میں مدنظر نہیں رکھا گیا ہے۔ مثلاً ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ کتاب کو مرتب کرنے والے لوگ لسانیات کے اصولوں سے واقف ہیں یا نہیں؟ ذخیرۂ الفاظ کے انتخاب میں وسیع ترین طریقہ کار بروئے کار لایا جانا چاہیے۔ ایک بند کمرے میں بیٹھ کر الفاظ کی کانٹ چھانٹ نہیں کرنی چاہیے بلکہ معاشرتی زندگی کے ہر طبقے سے الفاظ کو چُن لینا چاہئے پھر ان میں نمائندہ الفاظ کو منتخب کر کے ترتیب دے لینا چاہئے۔ ان لفظوں کا تعلق ہر شعبۂ حیات سے ہونا چاہیے اور بنیادی ذخیرہ عوامی زندگی سے لیا جائے۔ پھر غیر ملکیوں کی ضرورتوں کو مدنظر رکھ کر فہرست تیار کی جائے۔ ہمیں بنیادی اردو کو سائنٹفک خطوط پر مرتب کرنے کی ضرورت ہے اس ضمن میں ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں:

> اردو پاکستان کی قومی زبان ہے اس کے زندہ اور متحرک الفاظ وہ ہیں جو یہاں کی شہری اور دیہاتی زندگی کے کاروباری، نجی، ادبی اور فکری ستونوں کے ساتھ براہِ راست ہم آہنگ ہیں۔ وہ الفاظ روز مرہ اور محاورات نسبتاً غیر متحرک اور جامد ہیں جو یہاں کے رسم و رواج، عام رہن سہن عمومی ضروریات اور مذہبی و معاشرتی، اقتصادی اور سیاسی حالات اور

> معتقدات سے صرف دور کا علاقہ رکھتے ہیں...... ذخیرہ الفاظ کی اس کمی بیشی سے اندازہ ہوتا ہے کہ یا تو مرتبین بول چال کی اُردو اور معیاری ادبی اردو میں کوئی فرق نہیں کر پائے۔ یا پھر ان کے سامنے بول چال کا وہ پیمانہ ہے جو شہری زندگی کے صرف ایک طبقے کے خیالات و احساسات کا ترجمان ہے اور اس کا پاکستان پر اطلاق ممکن نہیں۔ یا پھر انہوں نے کسی لغت سے اپنی پسند کے الفاظ چھانٹ لیئے ہیں اور اسے اعلیٰ بنیادی اردو کا نام دے رہا ہے۔[۳۰]

مقالاتِ تحقیق میں ایک اور مضمون 'حوالہ جات قانون فوجداری' ہے۔ جو اردو کے عدالتی ادب میں ایک اضافہ ہے یہ کتاب محبوب عالم شیخ کی ہے۔ یہ ایک امدادی کتاب ہے۔ ماتحت عدالتوں کے عملے کو ایسی کتاب بہت فائدہ پہنچایا کرتی ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی اس کتاب کی اس خوبی کے معترف ہیں کہ ٹیکنیکل کتاب ہونے کے باوجود اس میں کہیں بھی پیچیدگی پیدا نہیں ہوئی اور علمی لحاظ سے بھی اس کتاب میں جان ہے کیونکہ اس کی نثر علمی اور قانونی نثر ہے۔ اگلے مضمون 'مشرق میں فہرست سازی کی روایت' میں ڈاکٹر وحید قریشی نے فہرست سازی کی روایت کا جائزہ لیا ہے اور اس مضمون میں کوزے میں دریا کو بند کر دیا۔ اس کی جامعیت اس امر سے ثابت ہے کہ ابتدا سے آج تک فہرست سازی کے جو اصول رائج چلے آ رہے ہیں ان کا جائزہ لیا گیا ہے۔

قلمی کتب کی فہرستوں میں جو نام نمایاں تاریخی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان میں حاجی حنیفہ اور ابنِ ندیم کے نام اہم ہیں۔ برصغیر پاک و ہند میں بھی فہرست سازی کا رواج ازمنۂ قدیم سے ہی چلا آ رہا ہے۔ خطی نسخوں کی فہرست سازی ایک اہم شعبہ رہی ہے۔ اس ضمن میں برصغیر میں حیدر آباد دکن، کتاب خانہ رام پور، اسلامیہ کالج پشاور کی فہرستوں کو کتابوں کے ذخائر کے سلسلے میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔ فہرست سازی کا یہ عمل اور کتاب داری کی بدولت زیادہ سائنٹفک ہو گیا ہے۔ یورپ کے جن محققین نے شعبۂ فہرست سازی میں نام پیدا کیا ان میں براؤن، آر بری، ایتھے، بلوم ہارٹ اور بلوشے کے نام نمایاں ہیں۔ دور حاضر کے اردو محققین میں ڈاکٹر سید عبد اللہ اور مولانا امتیاز علی عرشی کے نام مشرق و مغرب میں نمایاں احترام کے حامل ہیں۔

مشفق خواجہ نے خود کو اردو مخطوطات تک محدود رکھا ہے کتابیات کے فن میں لاہور کے قلمی خزائن کے بارے میں ڈاکٹر سید عبد اللہ نے معلومات مہیا کی ہیں۔

یہ تمام حوالے درحقیقت نئے محققین کے لیے راہبر و راہنما ہیں۔ ''اردو کی کتابیات تحقیق وتنقید پر ایک نظر'' مقالاتِ تحقیق کا اگلا تحقیقی مضمون ہے۔ جس میں ڈاکٹر وحید قریشی نے کہا ہے کہ اردو میں کتابیات کا رجحان اور فہرست سازی کا عمل زیادہ پرانا نہیں۔ لیکن ڈاکٹر وحید قریشی کے مطابق ڈاکٹر سلیم اختر نے اردو تنقید و تحقیق سے متعلق کتب کی فہرست بنانے کی ابتداً کی ہے۔ اس میں پہلی بار لائبریری سائنس کے اصولوں کو پیش کیا گیا ہے اور پاکستان میں شائع ہونے والی ہر اہم کتاب کو پیش کیا گیا ہے۔

اگلا مضمون ''کتاب نامۂ شبلی'' پر ہے۔ اس کے مرتب اختر راہی ہیں۔ یہ کتابچہ ۶۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں علامہ شبلی کے بارے میں کتابیات کو پیش کیا گیا ہے۔ یہ معلومات کے لحاظ سے مفصل کتاب ہے۔ لیکن ڈاکٹر وحید قریشی اس کو مزید جامع بنانے اور اس کی غلطیوں کو دور کرنے پر زور دیتے ہیں۔

ڈاکٹر وحید قریشی کا ایک پسندیدہ شعبہ تاریخ بھی ہے۔ جو ان کی تمام تخلیقات میں جاری و ساری ہے اور تاریخی شعور کی بدولت ہی انہوں نے بہت سی شخصیات سے درست حالات و کوائف بیان کیے ہیں۔ فنِ تاریخ گوئی پر کیپٹن منظور حسین نے جو معلومات دی ہیں۔ ان میں حساب الجمل حروف کے بامعنی مرکبات کی عددی قیمتوں کو محفوظ کرنے کا طریق کار ہے۔ فنِ تاریخ گوئی نے ایران میں بڑی مقبولیت حاصل کی۔

تاریخ گوئی برصغیر پاک و ہند میں دور ہمایوں میں عروج پر تھی۔ بعد میں دیگر مغل بادشاہوں کے دور میں بھی تاریخی واقعات کے بارے میں قطعات تاریخ بکثرت رقم کیے گئے۔ فنِ تاریخ گوئی ایک پیچیدہ فن ہے جن کتابوں کا حوالہٗ ڈاکٹر وحید قریشی نے دیا ہے ان میں مفتاح التواریخ، گنج تاریخ، مقیاس الاشعار، افادۂ تاریخ، ملخص تسلیم از تسلیم سہوانی، عدد التاریخ، گلبن تاریخ وغیرہ۔

تحقیق کے حوالے سے ڈاکٹر وحید قریشی کی کتاب ''کلاسیکی ادب کا تحقیقی مطالعہ'' بڑی اہم کتاب ہے۔ جو مکتبہ ادب جدید پٹیالہ اردو لاہور نے ۱۹۶۵ء میں شائع کی۔ اس کے دیباچے ''سخن ہائے گفتنی'' میں ڈاکٹر وحید قریشی نے تحقیق کی روایت پر روشنی ڈالی ہے۔ خاص طور پر پہلی جنگِ عظیم کے بعد جب ترکِ

موالات اور خلافت کی تحریکیں اٹھ رہی تھیں تو شعر و ادب میں تنقید کے مقابلے میں تحقیق نے زور پکڑا۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور، عبد السلام ندوی، حافظ محمود شیرانی اور ڈاکٹر مولوی محمد شفیع کے نام اردو تحقیق میں اساتذہ فن کے کا درجہ رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اس مضمون میں تحقیقی عمل کے حوالے سے ارتقاً پر روشنی ڈالی ہے اور تحقیق کے مختلف دبستانوں کا تذکرہ کیا ہے۔ اس کتاب میں شائع ہوئے مقالات مختلف وقتوں میں مختلف رسالوں میں شائع ہوتے رہے۔ ان تحقیقی مضامین کی فہرست کچھ یوں ہے:

۱۔ مثنوی چندر بدن مہیار

۲۔ لکھنؤ کا دبستان شاعری

۳۔ مصحفی اور اس کا کلام

۴۔ میر شیر علی افسوس

۵۔ سید حیدر بخش حیدری

۶۔ میر بہادر علی حسینی

۷۔ قاضی سراج الدین احمد

۸۔ یادگار غالب

۹۔ علامہ اقبال کی تعلیمی زندگی کی بعض تفصیلات

۱۰۔ علامہ اقبال اور اسلامیہ کالج

ان مقالات میں ڈاکٹر وحید قریشی نے تاریخ، فارسی ادب اور اُردو ادب کو یکجا کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ مقالات اردو ادب کے مختلف ادوار سے متعلق ہیں۔ لیکن انہیں زمانی ترتیب کے لحاظ سے یکجا کیا گیا ہے۔ تاکہ تاریخی واقعات کا ارتقاء تسلسل کے ساتھ پیش کیا جا سکے۔ دیباچے میں ڈاکٹر صاحب نے بالخصوص تحقیق کے دبستانِ لاہور کا تذکرہ کیا ہے۔ ان مقاموں میں انہوں نے بنیادی اور ثانوی دونوں ماخذوں سے استفادہ کیا ہے۔ لیکن بنیادی طور پر ان کے پیش نظر قلمی نسخے اور مخطوطات رہے ہیں۔ ان شخصیات یا مصنفین کی کتابیں ہر

مقالے کے آخر میں مصادر بھی موجود ہیں جو ڈاکٹر صاحب کی تحقیقی بصیرت کو ظاہر کرتے ہیں۔

پہلا مضمون ''مثنوی چندر بدن مہیار'' پر ہے۔ جو قدیم ترین مثنوی ہے۔ اسے اردو میں نظم کرنے والا پہلا شاعر مقیمی ہے۔ نصیر الدین ہاشمی کے مقالے قصہ'' چندر بدن مہیار'' کا حوالہ دیتے ہوئے ڈاکٹر وحید قریشی یہ ثابت کرتے ہیں کہ بلوم ہارٹ اور اشپرنگر نے غلطی سے اس قصے کو عزیز سے منسوب کر دیا ہے۔ نصیر الدین ہاشمی اور محی الدین قادری زور نے اس حقیقت کو ثابت کیا ہے کہ انڈیا آفس کے جس نسخے کا ذکر بلوم ہارٹ نے کیا ہے اس کا مصنف مقیمی ہے۔ 'خطبات گارساں دتاسی' کے اردو ترجمے میں اس مثنوی کا ذکر موجود ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی کے پیش نظر مثنوی چندر بدن مہیار کا نامکمل نسخہ یا مخطوطہ موجود تھا لیکن پہلے اور آخری اوراق نہ ہونے کی وجہ سے کاتب کا نام اور مثنوی کا عنوان نہیں مل سکا۔ ڈاکٹر صاحب نے جو کہ مخطوط شناسی کے بھی ماہر ہیں بیان کرتے ہیں کہ یہ نسخہ کہیں کہیں سے کرم خوردہ اور آب زدہ بھی ہے۔ مصنف کا حال دیگر تذکروں میں کہیں معلوم نہ ہو سکا۔ نسخے کی کتابت معمولی اور اغلاط سے بھری ہوئی ہے۔ املا کے بنیادی اصولوں کو نہیں برتا گیا۔ ہر جگہ کتابت کی غلطیاں دکھائی دیتی ہیں۔ پھر ردیف و قافیہ کی بھی پرواہ نہیں کی جاتی ہے۔

اس مثنوی کا سنہ تصنیف بھی اس نسخے میں درج نہیں مغلیہ حکمرانوں کا تذکرہ اس مثنوی میں موجود ہے۔ ان کے عہد حکومت سے لے کر اس مثنوی کے عہد کو جانا اور سمجھا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر وحید قریشی فرماتے ہیں کہ:

> مغلیہ حکمرانوں میں عالی گوہر، شاہ عالم ثانی کا خاندانی نام ہے۔ شاہ عالم ثانی کا زمانہ حکومت ۲۴ دسمبر ۱۷۵۹ء سے ۱۹ نومبر ۱۸۰۶ء تک ہے۔ لیکن اس میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ 'فرعونِ مردود' نے اس پر ظلم کیا اور یعقوبؑ کی طرح اس کی آنکھوں سے نور جاتا رہا۔ شاہ عالم ثانی کی آنکھیں غلام قادر روہیلہ نے ذی قعدہ ۱۲۰۲ھ میں نکالیں روہیلہ ربیع الاول ۱۲۰۳ھ (دسمبر ۱۷۸۸ء) میں گرفتار ہوا اور اس حساب سے مثنوی چندر بدن مہیار ذی قعدہ ۱۲۰۲ھ اور ۷ رمضان ۱۲۲۱ھ کے درمیان میں لکھی گئی۔ ''نظر کر بحالِ شہنشاہ کبھی'' سے تو یہ خیال ہوتا ہے کہ روہیلہ ابھی گرفتار نہیں ہوا۔ اس لیے مثنوی کا سن تصنیف ۷ ذی قعدہ ۱۲۰۲ھ اور ربیع الاول ۱۲۰۳ھ کے درمیان قرار پاتا ہے۔''[۳۱]

یہ مثنوی اپنے لہجے اور تلفظ کے اعتبار سے پٹنہ اور اس کے گرد و نواح سے تعلق رکھتی ہے۔ مقیمی نے چندر بدن کے شہر کا نام سندر پٹن رکھا ہے۔ اس کتاب کی اہمیت ادب سے زیادہ لسانی اور تاریخی ہے۔ مثنوی چندر بدن کے بعد اگلا مقالہ لکھنؤ کا دبستانِ شاعری'' ۔۔۔ ایک تحقیقی مقالہ ہے۔ ڈاکٹر ابواللیث الصدیقی نے اس مقالے پر پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ اس مقالے کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر وحید قریشی نے اس کے تاریخی، عمرانی، لسانی حوالوں کا جائزہ لیا ہے۔ لیکن ان حوالوں کے ساتھ ساتھ تحقیق میں خامیاں تلاش کی گئی ہیں۔ مثال کے طور پر ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے حوالے کے طور پر جو کتابیں گنوائی ہیں۔ ان کا تذکرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر وحید قریشی فرماتے ہیں کہ حوالوں کی واضح صورتیں موجود نہیں اور صراحت کا نہ ہونا اس امر کا غماز ہے۔ کہ تمام حوالوں کو مد نظر نہیں رکھا گیا۔ بلکہ ان میں سے صرف چند ایک پر اکتفا کیا گیا ہے۔

اور ان میں بھی معتبر اور غیر معتبر ماخذ کا خیال نہیں رکھا گیا۔ اس لیے بیشتر بیانات قابلِ اعتبار نہیں ہیں۔ مثال کے طور پر دہلی میں سادات بارہہ کا زور، بادشاہ اور رعیت پر ہونے والے ظلم، مخالف پارٹی کے لیڈر محمد امین خان اور خان اعتماد الدولہ وغیرہ یہاں آ کر ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے محمد امین اور خان اعتماد الدولہ کو ایک ہی آدمی سمجھ کر یہ کہہ دیا ہے کہ میر محمد امین نے حسین علی خان کے قتل کی سازش کی۔ یہاں واقعات کے رد و بدل اور دو مختلف حوالوں کو یکجا کر دینے سے ان کی صداقت میں کمزوری پیدا ہو گئی ہے۔ تاریخی معلومات میں کجی کے ساتھ ساتھ شعرأ کے حالات بھی تحقیق و توثیق کے بعد پیش نہیں کیے اور نامکمل معلومات پر بھروسہ کر لیا گیا ہے۔

ڈاکٹر وحید قریشی '' لکھنؤ کا دبستانِ شاعری' سے خان آرزو، سودا، میر حسن، حسرت، میر تقی میر انشا اور جرأت کے حالاتِ زندگی پر تنقید کرتے ہیں۔ مصحفی کے حالات ''لکھنؤ کا دبستانِ شاعری'' میں بھی غلط بیان کیے تھے۔ لیکن جب ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی کی کتاب 'مصحفی اور اس کا کلام' چھپی تو اس میں گذشتہ اغلاط دوہرائی گئیں۔ لکھنؤ کے دبستانِ شاعری کے جائزے میں ڈاکٹر وحید قریشی نے گذشتہ لکھنؤ، عماد السعادت، تاریخِ اودھ، مجموعہ نغز دستور الفصاحت، سرو آزاد، عقد ثریا، تذکرہ بے نظیر، اُردو انسائیکلو پیڈیا آف اسلام اور رام بابو سکینہ کی تاریخِ ادب اُردو کو پیشِ نظر رکھا ہے۔

ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی کی کتاب ''مصحفی اور اس کا کلام'' کا جائزہ ڈاکٹر وحید قریشی نے اگلے مضمون میں پیش کیا ہے۔ جس میں انہوں نے ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کی تحقیقی اغلاط پر تنقید کی ہے۔ کیونکہ ان کی تحقیق کے

بنیادی ماخذوں میں مصحفی کی نظم و نثر کے سب مطبوعہ نسخوں کا ذکر نہیں کیا گیا۔ جب کہ مصحفی کے کلام کے جائزے کے لیے ایک نقطۂ نظر وضع کرنے کی ضرورت ہے اور یہ نقطۂ نظر اسی وقت وضع ہو سکتا ہے جب کہ مصنف کے نظم و نثر کے ہر پہلو پر حاوی ہو کر لکھا اور سوچا جائے۔ پھر اس کے مطالعے کے مختلف زاویوں کو بھی اپنے نقطۂ نظر کا حصہ بنایا جائے۔ حالاتِ مصحفی کے حوالے سے ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی کی رائے کو ڈاکٹر وحید قریشی نے مستند نہیں مانا بلکہ قیاسی باتوں کو حتمی قرار دینے کی روش پر مضمون کے بقیہ حصے میں بھی تنقید کی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ مصحفی کے کلام کے پس پردہ کارفرما محرکات کا جائزہ گہرائی سے نہیں لیا گیا خواہ یہ محرکات نفسیاتی تھے یا سماجی۔ صرف ان الجھنوں کا تذکرہ کر دینا کافی نہیں بلکہ تحقیق حقائق کے بیان کے بعد ان حقائق کے اصل محرکات اور وجوہات کا سراغ لگاتی ہے۔ کلام کا انتخاب قلمی نسخے سے کیا گیا ہے لیکن اس میں ایک سے زائد قلمی نسخوں کی مدد لینے کی بجائے صرف ایک نسخے پر اکتفا کر لیا گیا ہے جو تحقیقی مشکل پسندی اور محققانہ مزاج کے خلاف ہے۔ صرف ایک قلمی نسخے پر اکتفا کرنے کا نقصان یہ ہوا کہ صدیقی صاحب نے صرف ایک شعر، ایک مصرعے یا ایک چوتھائی مصرعے پر بھی اکتفا کر لیا ہے اور وزن سے عاری اشعار کو بھی اس انتخاب میں شامل کر لیا ہے۔ اس طرح یہ تحقیقی مقالہ محض ایک تنقیدی مقالہ بن کر رہ گیا ہے۔

اس کتاب کا اگلا مضمون میر شیر علی افسوس کے بارے میں ہے جس میں ڈاکٹر صاحب نے میر شیر علی افسوس کے احوال اور دیگر تخلیقات پر روشنی ڈالی ہے۔ میر شیر علی افسوس جو کہ فورٹ ولیم کالج کے منشیوں میں شامل تھے۔ ان کی شہرت باغِ اُردو (ترجمہ گلستان) کی وجہ سے ہوئی اور بعد میں ان کی شہرت کی وجہ ''آرائش محفل'' بن گئی۔ ان کے حالاتِ زندگی مفصل طور پر نہیں ملتے۔ نہ تاریخِ ولادت درست معلوم ہو سکی اور نہ ہی ان کی رہائش کے بارے میں معلومات مل سکی ہیں۔ باغِ اُردو جو کہ گلستاں کا ترجمہ ہے کے مطبوعہ نسخے کے دیباچے سے ان کے اپنے تحریر کردہ احوال پر روشنی پڑتی ہے۔ افسوؔس کے معاصرین کے بیانات بھی میر شیر علی افسوس کے حالات پر روشنی ڈالتے ہیں۔ ان بیانات کا تجزیہ ڈاکٹر وحید قریشی نے دیگر تذکرہ نگاروں کے بیانات سے کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب تحقیق میں حاشیہ آرائی کے قائل نہیں وہ حشو و زوائد سے پاک سچائی اور واقعیت پر زور دیتے ہیں اور ان اصولوں کو اپنی تحقیق میں بھی برت کر پیش کرتے ہیں۔ وہ ان تمام بنیادی حوالوں کا ذکر کرتے ہیں جو انہوں نے کسی بھی موضوع پر تحقیق کے دوران پیشِ نظر رکھے۔ ان کا نظامِ تحقیق اس اصول پر مبنی ہے کہ کسی

مصنف کی تخلیقات کا جائزہ محض علم بیان، علم عروض اور دیگر فنی معاییر کی روشنی میں نہ لیا جائے بلکہ کسی علاقے یا شہر میں اس کے قیام، گرد و نواح کے حالات، سیاسی و سماجی صورتحال، مصنف کی نفسیاتی الجھنیں، ان کا تجزیہ یہ تمام مسائل ایسے ہیں جن کو مدنظر رکھتے ہوئے ڈاکٹر وحید قریشی اپنی تحقیق کی بنیاد ٹھوس بنیادوں پر قائم کرتے ہیں۔

''کلاسیکی ادب کا تحقیقی مطالعہ'' میں اگلا مضمون سید حیدر بخش حیدری کے بارے میں ہے۔ جس میں ڈاکٹر صاحب نے حیدر بخش حیدری کی تصنیف 'تو تا کہانی' کو بنیاد بنا کر ان کے حالات کا سراغ لگانے کی کوشش کی ہے۔ حیدر بخش حیدری نے 'تو تا کہانی' کے دیباچے میں اپنے احوال کا مختصر سا تذکرہ کیا ہے۔ یہ دیباچہ ہی ان کے بارے میں ماخذ کا کام دے سکتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے حالات کے دیگر ماخذوں میں نسخہ دلکشا از جنم جیے، اشپرنگر کی شاہان اودھ کے کتب خانوں کی کیٹلاگ اور گارساں دتاسی کی تاریخ ادب ہندی و ہندوستانی (فرانسیسی) ہے۔ حیدر بخش حیدری دہلی کے رہنے والے تھے۔ رسمی تعلیم کم تھی۔ مگر کردار اور اخلاق کے اوصاف زیادہ تھے۔ گارساں دتاسی نے اپنی کتاب "Histoire de La Literature" میں حیدر بخش حیدری کے مفصل احوال دیے ہیں۔ جن کا خلاصہ کریم الدین نے کیا اور اس میں حیدر بخش کی تصنیفات کا مفصل بیان موجود ہے۔ حسن کی فہرست گارساں و تاسی نے بھی اپنے مضمون کے اختتام پر دی ہے۔ مثلاً 'تو تا کہانی' 'گل مغفرت' گلزار دانش' 'تاریخِ نادری' 'قصہ مہر و ماہ' 'مختصر شاہنامہ اُردو' 'قصہ بہرام وگل اندام'۔

حیدر بخش حیدری فورٹ ولیم کالج کے مصنفین میں سے سب سے زیادہ کتابوں کے مؤلف تھے۔ منشی بینی نرائن نے حیدر بخش حیدری کے کلام کا بھی طویل انتخاب دیا ہے:

ے برابری کا تری گل نے جب خیال کیا
صبا نے مارے طمانچے منہ اس کا لال کیا
گرا تھا کٹ کے زمیں پر کبھی ترا ناخن
فلک نے اس کو اٹھا کر وہیں ہلال کیا

ے جلوہ گر دیکھے اگر تیرا سنہرا تعویذ

کرے خورشید اسے اپنے گلے کا تعویذ
اس کی آنکھوں کے نہ دیکھے کبھی بیمار محال
آبی و آتشی کو لکھ کے پلایا تعویذ
رکھ لختِ جگر ہاتھوں پہ بادیدۂ خونبار

اے وائے ترے کوچے سے مایوس چلے ہم
دل سوزی نہ کی تو نے کبھی آن کے اک دن
جوں شمع ترے غم میں ہر اک رات جلے ہم

اس بے وفا کے عشق میں گرچہ وفا نہیں
پر کیا کروں میں دل تو مرا بوجھتا نہیں
اے دل سمجھ کے رکھیو قدم کوئے عشق میں
جیتا تو اب تلک کوئی واں سے پھرا نہیں
مت اس کی دوستی کا تجسس کر حیدری
یہ چرخ کینہ جو کسی کا آشنا نہیں

ظلمت کدے میں اپنے ہے یوں روشنی داغ
جگنو کی چمک جیسے اندھیرے میں کہیں ہو
کیا پوچھتے ہوا اس کے دم سرد کی یارو
جو سوختۂ آتشِ دوری ہو، حزیں ہو

ڈاکٹر وحید قریشی نے حیدری کے حالات، ان کی تالیفات کے دیباچوں، فورٹ ولیم کالج کی رپورٹوں

اور محمد عتیق صدیقی کی گِل کرسٹ اور اس کا عہد، میں فورٹ ولیم کالج کی روداودں کی مدد سے فراہم کیے ہیں۔

اگلا مضمون ''میر بہادر علی حسینی'' کے بارے میں ہے جس میں ڈاکٹر وحید قریشی نے سید محمد جو کہ 'ارباب نثر اردوٗ کے مؤلف ہیں کے بیان کے مطابق میر بہادر علی حسینی کے احوال کا جائزہ لیا ہے۔ فورٹ ولیم کالج کے ریکارڈ کے جائزے سے بھی پتہ چلتا ہے کہ میر بہادر علی حسینی ۴ مئی ۱۸۰۱ء کو فورٹ ولیم کالج میں ملازم ہوئے۔ معاصر تذکرہ نگاروں کے ہاں حسینی کا ذکر نہیں ملتا البتہ قریبی زمانے کے دو ماخذ ایسے ہیں۔ جن میں حسینی کا ذکر موجود ہے۔ ایک گارساں دتاسی کی تاریخ ادب ہندی و ہندوستانی، اور دوسرے اس کی اضافہ شدہ تلخیص 'طبقات شعراء ہندٗ از کریم الدین بعد کے تذکرہ نگاروں میں یحیٰی تنہا (میر المصنفین) رام بابو سکینہ (تاریخ ادب اُردو) موہن سنگھ دیوانہ (تاریخِ ادب اُردو) حامد حسن قادری (داستان تاریخِ اُردو) فہیم قریشی (اُردو ادب کی مختصر تاریخ) وغیرہ میں حسینی کے حالات کا کچھ حصہ ملتا ہے۔ بہادر علی حسینی میر حسن کی مثنوی سحرالبیان کی نثری تلخیص نثر بے نظیر کے مصنف ہیں۔ جس میں اشعار کی ملاوٹ موجود ہے۔ ہندوستانی گرامر پر ایک رسالے کے مصنف بھی ہیں۔ اس کے علاوہ ھتو پدیش Hitopadeca کے ہندوستانی ترجمے کے مصنف بھی ہیں۔ حسینی آسام کی تاریخ کے مصنف بھی ہیں۔ اوینٹل فیبولسٹ کے مصنف بھی ہیں۔ حسینی نے قرآن پاک کے ترجمے میں بھی حصہ لیا۔ جس میں دیگر مصنفین فورٹ ولیم بھی شامل رہے۔ ''نثرِ بے نظیر'' روز مرہ اور محاورے دونوں لحاظ سے خوبصورت بول چال کی زبان کا مرقع ہے۔ یہ کتاب اُردو دانی کے اعلیٰ نصاب میں شامل رہی تھی۔ 'اخلاق ہندی' سنسکرت حکایتوں کا ترجمہ ہے۔ حسینی ایک زبان دان مصنف تھے۔ انہوں نے ڈاکٹر گل کرسٹ کی ''ہندوستانی زبان کے قواعد'' کی تلخیص اُردو زبان میں شائع کی۔

کلاسیکی ادب اور ان کے مصنفین و مؤلفین کے تذکرے کے بعد ڈاکٹر وحید قریشی کا اگلا مضمون قاضی سراج الدین احمد پر ہے۔ جو سرسید احمد خان کے دوستوں میں سے تھے۔ سرسید کے ساتھیوں اور تحریک علی گڑھ کے سارے اراکین کا ذکر بار بار کیا گیا ہے ان پر بے شمار کتابیں موجود ہیں۔ لیکن مولوی چراغ علی جنہیں علی گڑھ تحریک کا دماغ کہا جا سکتا ہے اور قاضی سراج الدین احمد کا ذکر کہیں موجود نہیں۔ حالات و واقعات نے ان کے تحریری سرمائے کو بھی اوجھل کر دیا ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے قاضی سراج الدین احمد کے علمی مرتبے، تصنیفات اور قابلیت کو اس مضمون میں پیش کر کے ان کی شخصیت کو دوبارہ ایک نئی زندگی دی ہے۔ جو وقت کے

گمنام گوشے میں پوشیدہ تھی۔ فرماتے ہیں:

> قاضی سراج الدین کے حالات کے ماخذ مذکورہ بالا کتابوں کے علاوہ یادِ رَفتگاں کا قلمی نسخہ، راولپنڈی کے ڈپٹی کمشنر کی رپورٹ اور قاضی صاحب کے پوتے اعجاز فاروقی کی مہیا کردہ زبانی روایات اور کچھ تحریری یاداشتیں ہیں۔

ان تمام مآخذ سے استفادہ کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے نتیجہ اخذ کیا کہ قاضی سراج الدین احمد ۱۸۶۶ء یا ۱۸۶۷ء میں بصرہ میں پیدا ہوئے۔ البتہ ان کی ابتدائی زندگی کی تفاصیل زیادہ نہیں ملتیں۔ سرمور گزٹ میں البتہ ان کا شائع کردہ سلسلہ مضامین موجود تھا۔ جس میں قاضی صاحب نے بچوں کی ابتدائی تعلیم کے بارے میں بنیادی مسائل پر بحث کی ہے۔ ان کی ایک تصنیف سیرۃ الفاروق بھی ہے۔''

اگلا مضمون ''یادگارِ غالب ایک تحقیقی جائزہ'' ہے۔ جس کا مفصل ذکر وحید قریشی بحیثیت غالب شناس میں ہو چکا ہے۔

آخری دو مضامین ''علامہ اقبال کی تعلیمی زندگی کی بعض تفصیلات'' اور ''علامہ اقبال اور اسلامیہ کالج'' ہیں۔ حیاتِ اقبال کے ضمن میں یہ دونوں مضامین عملی افادیت رکھتے ہیں۔ جن میں حیاتِ اقبال کے بعض اہم گوشوں کی نقاب کشائی کی گئی ہے ان مضامین کا ذکر ''ڈاکٹر وحید قریشی بحیثیت اقبال شناس'' میں موجود ہے۔''

☆☆☆

حوالہ جات (باب سوم)

۱ وحید قریشی ڈاکٹر، مطالعہ حالی، دارالادب، چوک انارکلی، لاہور، ۱۹۶۱، صفحہ نمبر ۱۸ تا صفحہ ۱۹۔

۲ گوہر نوشاہی ڈاکٹر، ڈاکٹر وحید قریشی شخصیت اور فن، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۰۶ء صفحہ ۳۲۔

۳ وحید قریشی ڈاکٹر، شبلی کی حیاتِ معاشقہ، مکتبہ جدید، لاہور، ۱۹۵۰ء، صفحہ ۹۔

۴ وحید قریشی ڈاکٹر، شبلی کی حیاتِ معاشقہ، صفحہ ۴۱۔

۵ وحید قریشی ڈاکٹر، شبلی کی حیاتِ معاشقہ، صفحہ ۷۹ تا ۸۰۔

۶ وحید قریشی ڈاکٹر، باغ و بہار ایک تجزیہ، سنگ میل پبلی کیشنز، چوک اُردو بازار، لاہور۔ ۱۹۶۸ء، صفحہ ۱۱۔

۷ وحید قریشی ڈاکٹر، باغ و بہار ایک تجزیہ، صفحہ ۱۳۔

۸ وحید قریشی ڈاکٹر، باغ و بہار ایک تجزیہ، صفحہ ۲۵۔

۹ وحید قریشی ڈاکٹر، باغ و بہار کا تجزیہ، صفحہ ۲۵۔

۱۰ وحید قریشی ڈاکٹر، باغ و بہار ایک تجزیہ، صفحہ ۳۱۔

۱۱ وحید قریشی ڈاکٹر، باغ و بہار ایک تجزیہ، صفحہ ۳۴۔

۱۲ وحید قریشی ڈاکٹر، باغ و بہار ایک تجزیہ، صفحہ ۷۵۔

۱۳ وحید قریشی ڈاکٹر، میر حسن اور ان کا زمانہ، استقلال پریس، لاہور، ۱۹۵۹ء، صفحہ ۱۰۔

۱۴ وحید قریشی ڈاکٹر، میر حسن اور کا ان کا زمانہ، صفحہ ۱۰۷۔

۱۵ وحید قریشی ڈاکٹر، میر حسن اور ان کا زمانہ، صفحہ ۲۲۷ تا ۲۲۹۔

۱۶ وحید قریشی ڈاکٹر۔ میر حسن اور ان کا زمانہ، صفحہ ۳۲۹۔

۱۷ وحید قریشی ڈاکٹر۔ میر حسن اور ان کا زمانہ، صفحہ ۳۹۱۔

۱۸ وحید قریشی ڈاکٹر، میر حسن کا ان کا زمانہ، صفحہ ۴۱۵۔

۱۹ وحید قریشی ڈاکٹر، میر حسن اور ان کا زمانہ، صفحہ ۴۲۰۔

۲۰ وحید قریشی ڈاکٹر، مقالاتِ تحقیق، مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی لاہور، ۱۹۸۸ء، صفحہ ۳۹۔

۲۱ وحید قریشی ڈاکٹر، مقالاتِ تحقیق، صفحہ ۴۲۔

۲۲ وحید قریشی ڈاکٹر، مقالاتِ تحقیق، صفحہ ۵۳۔

۲۳ وحید قریشی ڈاکٹر، مقالاتِ تحقیق، صفحہ ۵۳ تا ۵۴۔

۲۴ وحید قریشی ڈاکٹر، مقالاتِ تحقیق، صفحہ ۶۶۔

۲۵ وحید قریشی ڈاکٹر، مقالاتِ تحقیق، صفحہ ۶۷۔

۲۶ وحید قریشی ڈاکٹر، مقالاتِ تحقیق، صفحہ ۱۷۳ تا ۱۷۴۔

۲۷ وحید قریشی ڈاکٹر، مقالاتِ تحقیق، صفحہ ۱۸۷۔

۲۸ وحید قریشی ڈاکٹر، مقالاتِ تحقیق، صفحہ ۲۳۸۔

۲۹ وحید قریشی ڈاکٹر، کلاسیکی ادب کا تحقیقی مطالعہ، مکتبہ ادب جدید میکلورڈ روڈ لاہور، ۱۹۶۵ء، صفحہ ۲۸۔

۳۰ وحید قریشی ڈاکٹر، کلاسیکی ادب کا تحقیقی مطالعہ، صفحہ ۲۲۵۔

☆☆☆

باب چہارم

ڈاکٹر وحید قریشی بحیثیت غالب شناس

ڈاکٹر وحید قریشی نقاد بھی ہیں اور محقق بھی۔ بہترین محقق اپنے اسلوب میں تنقیدی شان بھی رکھتا ہے اور تحقیقی روّیوں کی عظمت بھی۔ ڈاکٹر صاحب نے اقبال شناسی کی ایک نئی اور زرّیں روایت قائم کی۔ ان کے اِسی اندازِ نظر کا ایک اور پہلو اِن کی غالب شناسی ہے۔ جس میں انفرادیت بھی ہے اور ندرت بھی۔ غالب باکمال شاعر اور صاحب طرز نثر نگار تھے۔ ان کے کلام کو ہر دور میں نئے رُخ سے دیکھا گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے اسلوب کے نئے طرزِ ادا کو مدِ نظر رکھا ہے۔ ان کے مقالات اور ''نذرِ غالبؔ'' دونوں اس امر کے شاہد ہیں کہ انہوں نے غالب شناسی کی نئی طرح ڈالی۔ غالبؔ کو ایک مفکر، نثر نگار اور شاعر کی حیثیت سے تو ہر دور میں پرکھا اور سراہا گیا لیکن ان کی عظمت کے دیگر خفتہ پہلوؤں کو نہیں دیکھا گیا۔ یا انہیں قصداً نظرانداز کیا گیا۔ غالبؔ کے ہاں منفرد اسالیب اور نئے موضوعات تو ملتے ہیں لیکن ابلاغ کی نئی راہیں بھی غالب ہی کے حوالے سے کھلتی ہیں۔ ہر صنف میں ایک نئی طرز اور روش کا موجد خود بے مہریٔ ایام کا شاکی ہی رہا۔ غالبؔ نے ۱۸۶۹ء میں وفات پائی۔ ان کا عہد ساز تفکر ایک صدی پر نہیں بلکہ آنے والی ہر صدی پر محیط ہے۔ انہوں نے فلسفہ وتفکر کو شاعری کا پیرہن عطا کیا اور بلاشبہ ایک جدید روش کی بنیاد رکھی۔ سادہ گوئی اور حقیقت پسندی ان کے اسلوب نثر کی اہم خصوصیات ہیں جبکہ شاعری میں ان کی مشکل پسندی ہی ان کی سب سے خاص خوبی اور وصف ہے۔ انہوں نے جس طرزِ خاص کی بنیاد رکھی وہ ان کے عہد کا سب سے اہم تقاضا تھی۔ فارسی جو سرکاری اور علمی زبان تھی۔ بادشاہ کے دربار سے عوام کی گلیوں تک نہ اتر سکی تھی۔ وہ طبقۂ اشرافیہ کی زبان ہی رہی۔ جبکہ اُردو شمالی جنوبی و ہند کا سفر طے کرتی اب ہر جگہ بار پا چکی تھی اور

ع چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی

کے مصداق زمانے کا دن رات اشارہ یہی تھا کہ بادِ صبا جس رُخ جائے دامنِ اُردو تھام کر ادھر ہی جانا چاہئے۔ غالب نے مشکل گوئی ترک کی۔ القاب و آداب کو خیر آباد کہا۔ سنگلاخ راہوں کو ترک کر کے آسان

گوئی کے گلزاروں پر قدم رکھا۔

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھیے
جو لفظ کہ غالبؔ میرے اشعار میں آوے

غالبؔ کی شخصیت اور فن پر بے شمار نقادوں نے قلم اٹھایا۔ غالبؔ کا عہد سماجی اور معاشی لحاظ سے ناسازگار سہی لیکن ادبی لحاظ سے اُردو کا عہد زریں کہا جاتا ہے۔ اُردو ادب کا وہ کلاسیکی اور درخشاں دور جس میں میرؔ و سوداؔ، میر درد اور آتش و ناسخ کے ساتھ غالب اور مومن غزل کی تان بلند کرنے میں مصروف تھے۔ غالب نے اپنے عہد کے آشوب کو دامنِ غزل میں پناہ دی۔ انہوں نے اس دور کے تمام کمزور عناصر کو سامنے رکھتے ہوئے ایک طاقتور عہد کی پیشین گوئی کی۔ غالب شناسی کا موضوع غالب کے عہد میں ہی رواج پا چکا تھا۔ ان تحریروں کی ابتدائی شکل تو تذکرے تھے۔ جن میں سب سے پہلے ۱۸۳۵ء میں نواب مصطفیٰ خان شیفتہ کا تذکرہ ''گلشنِ بے خار'' منظر عام پر آیا۔ گلشنِ بے خار میں شیفتہ نے غالبؔ کا تعارف، ان کی خصوصیاتِ کلام اور غالب کے ۸۴ اشعار کا انتخاب شامل کیا ہے۔ شیفتہ نے ان کے کلام پر اپنی رائے دیتے ہوئے ان کے فن کے مرکزی خصائص اور خوبیوں کا ذکر کیا ہے۔ کلامِ غالبؔ کی ندرت اور کلام کا عمق دونوں ان کے پیشِ نظر رہے۔ شیفتہ نقاد ہی نہ تھے خود بھی اعلیٰ ذوق رکھنے والے ادیب اور شاعر تھے۔ محمد حسین آزادؔ نے ان کی علمیت کا اعتراف ''آبِ حیات'' میں کیا ہے۔ شیفتہ کی نظر فارسی دُنیا کے بلند پایہ شعراء پر تھی۔ انہوں نے بیدل، عرفی اور نظیری جیسے شعراء سے غالب کے کلام کا موازنہ کر کے غالب کو بہتر ثابت کیا ہے۔ غالبؔ کے موجودہ دیوان تک پہنچنے اور اشعار کے حذف کرنے کے بارے میں بھی پہلی بار شیفتہ کے تذکرے سے پتہ چلا۔ دیگر تذکروں میں مولوی کریم الدین کا ''نازنیناں'' ۱۸۴۵ء میں حکیم قطب الدین باطن کا تذکرہ ''گلشنِ بے خزاں'' منظرِ عام پر آیا۔ یہ تذکرہ بنیادی طور پر شیفتہ کے تذکرے کا جواب تھا۔ ۱۸۴۶ء میں طبقات الشعراء کے نام سے منشی کریم الدین کا تذکرہ منظرِ عام پر آیا۔ سر سید احمد خان نے ''آثار الصنادید'' کے چوتھے باب میں دہلی کے ایک سو بیس مشاہیر کا تذکرہ کیا۔ ان میں غالبؔ کا تذکرہ سترہ صفحات پر مشتمل ہے۔ لیکن جب سر سیّد نے ''آثار الصنادید'' کا دوسرا ایڈیشن مرتب کیا تو اس قابلِ قدر باب کو نکال دیا۔ سر سیّد نے غالبؔ کے خوبصورت انداز کو بذریعہ تشبیہات اجاگر کیا ہے۔ ''گلستانِ سخن'' کے نام سے مرزا قادر بخش صابر کا تذکرہ ۱۸۵۵ء میں منظرِ عام پر آیا۔

۱۸۶۶ء میں بحرِ زخار کے نام سے شیخ صادق حسین وصفی کا تذکرہ سامنے آیا۔ ۱۸۷۶ء میں سیّد محمد صدیق حسن خان کا تذکرہ منظرِ عام پر آیا۔ اس تذکرے میں صدیق حسن خان نے غالب کو ایک بیباک شاعر کا درجہ دیا۔ ۱۸۷۹ء میں انتخاب یادگار کے نام سے امیر مینائی تذکرہ شائع ہوا جس میں غالبؔ کا احوال موجود ہے۔ سیّد نورالحسن خان کا تذکرہ ۱۸۷۸ء میں ''طورِ کلیم'' کے نام سے شائع ہوا۔ سیّد فرزند احمد صفیر بلگرامی کا تذکرہ ''جلوۂ خضر'' ۱۸۸۴ء میں شائع ہوا۔ اس میں غالبؔ کے نظم و نثر دونوں کو موضوع تحریر بنایا گیا۔ محمد حسین آزاد کے تذکرے ''آبِ حیات'' مطبوعہ ۱۸۸۰ء میں غالبؔ کی فارسی شاعری کو موضوع بنایا۔ ''بہارستانِ سخن'' مطبوعہ ۱۸۹۷ء میں تذکرہ نگار سیّد امداد امام اثر نے غالب کے فارسی اور اُردو کلام پر مفصل تبصرہ کیا۔ حالؔی کی یادگارِ غالب نے اس دور میں غالبؔ کے کلام اور شخصیت کو ہر جگہ پھیلایا اور خوبصورت انداز میں کلامِ غالب کا محاکمہ پیش کیا۔ اس کے بعد مرزا موج لکھنوی کا تذکرہ ''حیاتِ غالب'' ہے جو غالبؔ کا سوانحی خاکہ ہے۔ اس میں ''آبِ حیات'' کو پیشِ نظر رکھا گیا۔

اِن تذکروں کے علاوہ بے شمار مضامین اور شرحیں ہیں جو غالبؔ کے کلام کے دروبست اور گہرائی کو ظاہر کرتے ہیں۔

سیّد علی حیدر طباطبائی نے پہلی بار دیوانِ غالب کی شرح لکھی جو انوار مطابع لکھنؤ سے پہلی بار شائع ہوئی اور دوسری بار ۱۹۰۱ء میں حیدرآباد سے شائع ہوئی۔ اِن تذکروں کے ساتھ ساتھ تبصرے بھی ہیں جو مختلف رسالوں میں شائع ہوئے۔ پیارے لال شاکر میرٹھی کا مضمون ''ادیب'' ستمبر ۱۹۱۲ء میں چھپا۔ اسی طرح اِسی رسالے یعنی ''ادیب'' میں مولانا عبدالماجد دریا آبادی کا مضمون چھپا جو غالبؔ کی شاعرانہ عظمت پر سیر حاصل تبصرہ تھا۔ ۱۹۰۳ء میں مرزا حیرت دہلوی نے ختم الشعراء میرزا نوشہ، کے نام سے ایک تبصرہ لکھا۔ جو رسالہ ''چراغ دہلی'' میں چھپا۔ انگریزی زبان میں غالب کے بارے میں مضمون چھپا۔ "Ghalib an Appreciation" جو صلاح الدین خدا بخش نے لکھا۔ اس میں غالب کی شاعری کی نمایاں خصوصیات کا تذکرہ کیا گیا۔

تذکرہ، گل رعنا، بھی ۱۹۲۱ء میں شائع ہوا۔ عبدالحیٔ صاحب، کے اِس تذکرے کا ذکر اُردو شاعری میں بہت عرصہ رہا۔

۱۹۱۸ء میں ''دیوانِ غالبؔ'' کا ''نسخۂ حمیدیہ'' مرتب ہوا۔ اِس دیوان کے آغاز میں عبدالرحمٰن بجنوری کا ایک طویل مقدمہ شامل ہے۔ جو الگ کتابی شکل میں ''محاسنِ کلامِ غالب'' کے عنوان سے شائع ہوا اور ۱۹۲۱ء اس کا سنِ طباعت ہے۔ ۱۹۲۴ء میں شائع ہونے والی رام بابو سکسینہ کی تاریخ ادب اُردو انگریزی زبان میں شائع ہوئی۔ انہوں نے پہلی بار غالبؔ کے کلام کو تین ادوار میں تقسیم کیا۔ ۱۹۲۸ء میں غالب پر ڈاکٹر سیّد عبداللطیف کی کتاب انگریزی زبان میں شائع ہوئی۔ ۱۹۲۸ء میں ہی ''مرقع چغتائی'' اور نقش چغتائی کے نام سے عبدالرحمٰن چغتائی کے دو مجموعے شائع ہوئے ان دونوں میں غالب کی شاعری کو مصور کر کے ایک نادر و نایاب کاوش کی تکمیل کی گئی۔ ۱۹۳۶ء میں غلام رسول مہر کی تصنیف غالب منظر عام پر آئی۔ اس سے قبل ۱۹۳۲ء میں نیاز فتح پوری نے نگار ''غالب نمبر'' شائع کیا۔

شیخ محمد اکرام نے ''غالب نامہ'' مرتب کر کے ایک نیا اندازِ تنقید دیا اور غالب کی مقبولیت کی وجوہات معلوم کرنے کی کوشش کی۔ مالک رام کی تصنیف ''ذکرِ غالب'' میں غالبؔ کی شخصیت کا مکمل تجزیہ اور کلام کا محاکمہ پیش کیا گیا۔

اِن کتب کے علاوہ آفاق دہلوی کی ''نادراتِ غالبؔ'' غلام رسول مہر کی ''خطوطِ غالب'' ڈاکٹر محی الدین قادری زور کی دو کتابیں ''روحِ غالب'' اور ''سرگزشتِ غالبؔ'' شوکت سبزواری کی ''فلسفۂ کلامِ غالب'' منظرِ عام پر آئیں۔ گویا ڈاکٹر وحید قریشی کے سامنے تنقید غالبؔ کی ایک طویل روایت موجود تھی لیکن انہوں نے جو محققانہ انداز اختیار کیا اور حیاتِ غالب کے نئے سنین دریافت کرنے کی جو سعی کی وہ قابلِ تحسین ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے غالبؔ کی حیات وفن کو نئے زاویوں سے دریافت کرنے کی بنیاد رکھی۔ انہوں نے ۱۹۷۰ء سے ۱۹۹۵ء تک کے پچیس برسوں میں غالب پر بہت کم مگر گراں قدر مواد پیش کیا۔ اِس ضمن میں ان کی تحقیقی کتاب ''نذرِ غالبؔ'' قابلِ تعریف ہے۔ جس میں انہوں نے غالب کی زندگی کے چند پنہاں گوشے منظرِ عام پر لانے کی کوشش کی ہے اور حیاتِ غالب کو نئے انداز سے جاننے اور کلام کے سیاسی و سماجی پس منظر کو نئے رُخ سے سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے غالب کے نفسیاتی تجزیے کے بعد یہ ثابت کیا ہے کہ غالبؔ کی ذہنی زندگی اور حقیقی زندگی میں بہت فاصلے اور بُعد پایا جاتا تھا اور انہی فاصلوں کے باعث غالب اپنے عصری معاملات اور واقعات سے خوفزدہ رہے۔ اس خوف کا عکس ان کے کلام اور فن میں بھی موجود ہے۔ ان کے ہاں عقلی اور جذباتی

آویزش بھی ملتی ہے۔ ان کے خاندانی پسِ منظر اور شاندار ماضی مگر حال کی تنگدستی نے انہیں ہمیشہ ذہنی طور پر مضطرب رکھا۔ ڈاکٹر صاحب نے ان حقائق کی بنیاد پر غالبؔ کی شخصیت اور فن کا تجزیہ حقیقت پسندی کے ساتھ کیا ہے۔ غالب پر ڈاکٹر صاحب نے جو کچھ لکھا۔ اس میں سے بیشتر ''نذرِ غالب'' میں محفوظ ہے اور غالب کی حیات وفن کے ہر موضوع اور ہر امکان کو چھو لیا۔ جس کی داد انہیں پاکستان اور ہندوستان کے علاوہ اطراف و جوانب سے بھی ملی۔ غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی کی دعوت پر ڈاکٹر وحید قریشی ۱۹۹۱ء میں غالب بین الاقوامی سیمینار میں شریک ہوئے۔ جس میں انہوں نے ''خوفزدہ غالب اور عصری صورتحال'' کے عنوان سے مقالہ پڑھا۔ پنجاب یونیورسٹی شعبۂ اُردو لاہور کے مجلّے ''تحقیق نامہ'' میں ''جاگیرِ غالب۔۔۔ ایک مطالعہ'' کے عنوان سے ڈاکٹر صاحب کا ایک مضمون چھپا۔ اسی طرح کلیاتِ غالب پر بھی ڈاکٹر صاحب کا تبصرہ شائع ہوا۔ اس کے علاوہ غالب کے حیات وفن پر مختلف کتب کے فلیپ ڈاکٹر وحید قریشی نے تحریر کیے۔ اِن سب کا مفصل احوال آئندہ صفحات میں آئے گا۔ مختصر یہ کہ غالب پر ڈاکٹر صاحب نے جو کام کیا وہ معیار کے لحاظ سے اہم اور نہایت وقیع ہے۔ اِس میں ڈاکٹر صاحب نے خالصتاً تحقیقی مزاج سے کام لیتے ہوئے محققانہ شعور کا مظاہرہ کیا ہے۔

ڈاکٹر وحید قریشی ''تنقیدی مطالعے'' میں شامل ایک مضمون ''غالبؔ کا نظریۂ شعر'' میں فرماتے ہیں:

> شاعرانہ عمل کی شعوری پرکھ کا اثر یہ ہے کہ غالبؔ کے کلام میں تنوع اور رنگا رنگی آ گئی ہے۔ تجربات کے اظہار پر اس کی گرفت زیادہ مضبوط ہے۔ یہی چیز جذبے کو سمیٹ کر اکائی بناتی ہے۔ غالب کی زندگی میں ایسے مواقع کم آتے ہیں جب شاعرانہ تجربے کے سامنے وہ عاجز آیا ہو۔ جب جذبات انتہائی شدت کے ساتھ ہجوم کرتے ہیں اور تنقیدی نظریئے کے لیے الہام کی رو میں سے انتخاب کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ایسے موقع پر غالبؔ کا دل بھی ڈول جاتا ہے۔ شاعرانہ فعل کی بڑائی اور عظمت کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ شاعر کو بعض اوقات اپنی زندگی بھی داؤ پر لگانی پڑتی ہے۔''[۱۱]

ہاتھ دھو دل سے یہی گرمی گر اندیشے میں ہے
آبگینہ تندیٔ صہبا سے پگھلا جائے ہے

ہجوم فکر سے دل مثل موج لرزے ہے
کہ شیشہ نازک و صہبائے آبگینہ گداز

دردِ دل لکھوں کب تک، جاؤں ان کو دکھلاؤں
انگلیاں فگار اپنی، خامہ خونچکاں اپنا!

غالب کی جدت پسند طبیعت کے ڈاکٹر وحید قریشی مداح ہیں۔ ان کے خیال میں غالب نے شاعری کے لیے اکبری دور کے استعارے استعمال کیے لیکن نئے ڈھنگ کے ساتھ۔ مثال کے طور پر اندیشہ، سوز و ساز، معنی سرخوشی، فکرِ مضمون وغیرہ وغیرہ۔ غالب نے اپنے شاعرانہ تجربے کی بنیاد ذاتی تجربے اور مشاہدے پر رکھی۔ غالب نے آرائشِ گفتار اور غزل کی زبان کو چمکانے کے لیے دیدہ ریزی سے کام لیا۔ اپنی شاعری کو نتیجتاً الہام اور مقدس عمل قرار دیتے ہیں۔

پاتا ہوں اس سے داد کچھ اپنے کلام کی
روح القدس اگرچہ مرا ہم زباں نہیں

آتے ہیں غیب سے یہ مضامین خیال میں
غالب سریر خامہ نوائے سروش ہے

اگرچہ یہ تصورات غیبی، ماورائی اور الہامی ہیں۔ تاہم ان کا منہج مادی ہے۔ غالب کی شاعری اعجاز اور دم عیسیٰ کے الہامی نغموں سے پُر سہی لیکن ارضی و سماوی اشیا کا باہمی ملن ہی غالب کو شاعرانہ تحریک عطا کرتا ہے۔

ہاں نشاطِ آمدِ فصل بہاری واہ واہ
پھر ہوا ہے تازہ سودائے غزل خوانی مجھے

؎ وہی اک بات جو یاں اک نفس واں نکہت گل ہے
چمن کا جلوہ باعث ہے مری رنگیں نوائی کا!

؎ غالب امروز بہ وقت کہ صبوحی زدہ ام
چیدہ ام ایں گل ''اندیشہ'' زباغِ دمِ صبح

ان مہیجات سے غالب نے ''آرائش غزل'' کی ہے۔ یہاں پہنچ کر ڈاکٹر وحید قریشی نے ایک نفسیاتی نقاد اور محقق کا رُوپ دھار لیا ہے۔ وہ غالب کے ہر عمل کی نفسیاتی توجیح پیش کرتے ہیں۔

؎ ہوں گرمی نشاط تصور سے نغمہ سنج
میں عندلیب گلشن نا آفریدہ ہوں

خود فرماتے ہیں:

''جس کے دل کو لگی ہو سوز و گداز کے شعر وہی کہتا ہے۔

اور اسی کے شعر با اثر ہوتے ہیں۔''

ڈاکٹر صاحب نے غالب سے زیادہ روحِ کلام غالب کا جائزہ لیا ہے اور ان اسباب اور عوامل کا کھوج لگانے کی کوشش کی ہے۔ جو غالب کے کلام میں شاعرانہ عمل بن کر نمودار ہوتا ہے۔ جس کی تہیں جذبات کے بحر ذخار کے نیچے مدفون ہیں اور جن کی وسعت، گہرائی تنوع اور ہمہ گیری بے مثل ہے۔

؎ مستانہ طے کروں ہوں رہ وادیٔ خیال
تا باز گشت سے نہ رہے مدعا مجھے!

غالب نے بھی اپنے کلام میں استعاروں کی ایک تازہ دنیا آباد کی ہے جو اس کے جذبات کی رنگا رنگی اور بوقلمونی کا پتہ دیتی ہے۔ غالب کے ہاں غزل اپنی روایات کی تشکیل و تکمیل پاتی ہے۔ غالب کی ذات بھی عام انسانوں کی طرح مختلف خانوں اور ٹکڑوں میں منقسم تھی۔ غم روزگار اور اپنی ذات اور شخصیت کی پرستش جو

ڈاکٹر وحید قریشی کے خیال میں نرگسیت یا (Narcissism) کا دوسرا عکس تھی اپنی ہستی کے عروسِ زیبا کی پرستش غالب جیسے ورسٹائل اور نابغہ (Genius) کے لیے یوں بھی ناگزیر تھی کہ اپنے زمانے میں ان کی وہ قدردانی نہ ہوئی جس کے یہ مستحق تھے۔

ے ہے تنگِ سینہ دل اگر آتش کدہ نہ ہو
ہے عارِ دل نفس اگر آذر فشاں نہ ہو

ے در بادۂ اندیشۂ ما درد نہ بینی
در آتش ہنگامۂ ما دود نیابی

ے ہنوز محرمیِ حسن کو ترستا ہوں
کرے ہے ہر بُنِ مو کام چشمِ بینا کا

ے نہ بندھے تشنگیِ شوق کے مضمون غالب
گرچہ دل کھول کے دریا کو بھی ساحل باندھا!

غالب کے ہاں لفظوں کی صورت گری اور اشعار کی مرصع کاری کا عمل دراصل درست Diction کی دروبست ہے۔ جہاں ایک تنقیدی شعور رکھنے والا شاعر سامنے آتا ہے۔ جو کھرے اور کھوٹے کی تخصیص کرنے پر قادر ہے۔

ے سخن کیا کہہ نہیں سکتے کہ جویا ہوں جواہر کے
جگر کیا ہم نہیں رکھتے کہ کھودیں جاکے معدن کو

اس جگر کاوی کا نتیجہ یہ ہے کہ غالب کا ہر شعر قاری کا Catharsis کرنے میں کامیاب نظر آتا ہے۔ یہاں غم اپنی آخری سرحدوں تک پہنچ کر منزلِ غم بن جاتا ہے۔ یہ المیہ ہے۔ جو پڑھنے والے کو شاعر کے رُوبرو لا کھڑا کرتا ہے۔

؎ غالب ز کلکِ تست کہ یا بم ہمی بدہر

مشکے کہ برجراحت، بند غم افگنم

غالب الفاظ کی صوتی اور جذباتی دونوں حیثیتوں سے واقف تھے۔

؎ حسد سزائے کمالِ سخن ہے کیا کیجیے

ستم بہائے متاعِ ہنر ہے کیا کہیے

جہاں ڈاکٹر وحید قریشی نے غالب کے فکر وفن کی نفسیاتی جہتوں کا سراغ لگایا ہے، ان کا قلم صرف نفسیاتی بھول بھلیوں تک محدود نہیں رہا بلکہ اس مقصد کے لیے وہ غالب کے اردگرد پھیلے سماج اور عہد کے عمیق سمندر میں بھی اترے ہیں۔ سب سے پہلے انہوں نے ابوظفر بہادر شاہ کے عہد کا حوالہ دیا ہے۔

تضادات کے اس دور میں غالب کے فن نے جنم لیا اور پروان چڑھا۔ ڈاکٹر صاحب اس عہد کا جائزہ یوں لیتے ہیں:

> ایک طرف قرونِ وسطیٰ کی قدریں تھیں اور دوسری طرف جدید دور کے مسائل اور جدید دور کی ضروریات۔ اس دور کا انسان اسی دوراہے پر کھڑا تھا۔ قدیم اخلاقی ضابطے قدیم فلسفیانہ افکار، قدیم رسم و رواج قدیم آدابِ معاشرت ایک طرف اور دوسری طرف ابھرتی ہوئی اور ترقی کرتی ہوئی قوموں کے نظریات اور عقائد تھے۔ پوری معاشرتی زندگی دو دھاروں میں بٹی ہوئی تھی۔ جہاں معاشرے میں دو رجحان متوازی چل رہے تھے۔ وہاں شعر و ادب میں بھی دو تحریکیں ساتھ ساتھ چلتی دکھائی دیتی ہیں۔ اس فضا میں لسانی تحریک کا رجحان زیادہ قوی ہے۔ سبب شاید یہ ہے کہ مٹتی ہوئی تہذیبی قدروں کا نقشہ جس کا کچھ حصہ حقیقی اور کچھ مثالی تھا زیادہ واضح تھا۔ اس کے مقابلے میں جو تبدیلی معاشرتی زندگی میں ظہور پذیر ہو رہی تھی اس نے فی الحال کوئی شکل اختیار نہیں کی تھی۔ اس لیے غالب اور اس کے ساتھیوں کی جدیدیت اس جدیدیت سے مختلف ہے۔ جس کی علم بردار سرسید کی تحریک ثابت ہوئی۔[۲]

اس عہد میں سماجی اور ادبی پیچیدگیاں بھی پروان چڑھیں اور زبان و بیاں کے نئے سانچوں نے بھی جنم لیا۔ شہنشاہِ عالم کے جذباتی تضاد نے مبالغہ آرائی کے رجحان کو فروغ دیا۔

بہرحال اس مٹتی ہوئی تہذیب نے غالبؔ جیسے بطلِ جلیل کو جنم دیا۔ جس کے روحانی اضطراب، بنے بنائے لسانی سانچوں سے گریز، احتجاج اور جذباتی طوفان نے اس دور کے باطنی رجحانات کو اپنے کلام میں سمو دیا۔ اس عہد تک آتے آتے زندگی کا چلن ہی بدل گیا تھا۔ غالب کی دلی عہد ابوظفر بہادر شاہ کی برباد شدہ دِلّی تھی۔ جہاں مادی وسائل کم تھے اور شکستِ آرزو کا ماتم زیادہ تھا۔

ڈاکٹر وحید قریشی نے نذر غالب، میں تحقیقی اور تنقیدی مزاج کا ثبوت دیا ہے۔ 'نذر غالب' کے دو ایڈیشن ہیں۔ پہلا ایڈیشن ۱۹۷۰ء میں شائع ہوا اور دوسرا بھی ۱۹۷۰ میں ہی منظرِ عام پر آ گیا۔ یہ دونوں ایڈیشن سنگ میل پبلی کیشنز لاہور سے شائع ہوئے۔ اس کتاب کے پہلے ایڈیشن کی ضخامت ۳۱۸ صفحات ہے۔ دوسرے ایڈیشن کی ضخامت ۲۸۰ صفحات ہے۔ 'نذر غالب' کے دونوں ایڈیشنوں میں عہدِ غالب اور غالب سے متعلق آٹھ مقالے شامل ہیں۔

یہ تمام مقالات غالب کی صد سالہ برسی کے موقع پر یکجا کر کے شائع کیے گئے۔

اِن دونوں ایڈیشنوں کا پیش لفظ ڈاکٹر ایس اے رحمان کا تحریر کردہ ہے اور ان دونوں ایڈیشنوں کا انتساب مولانا غلام رسول مہر کے نام کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر ایس اے رحمٰن ''نذر غالب'' کے دیباچے میں یوں رقم طراز ہیں:

> ''نذر غالب ڈاکٹر وحید قُریشی کے مقالات کا مجموعہ ہے۔ ان میں چند ایک تحقیقی مضامین اور متعدد تنقیدی جائزے شامل ہیں۔ کچھ ان میں سے مطبوعہ ہیں اور کچھ غیر مطبوعہ ہیں۔ ڈاکٹر وحید ادیب بھی ہیں اور ساتھ ہی تیشۂ تحقیق کے مردِ شیر اور میدانِ تحقیق کے شہسوار بھی۔ مؤخر الذکر دونوں اصناف تحریر میں متعدد کتابیں ان کے قلم سے نکل کر اہلِ علم سے خراجِ تحسین وصول کر چکی ہیں۔ [۳]

نذر غالب میں شامل آٹھ مقالات کی ترتیب کچھ یوں ہے۔

۱۔ عہد ابوظفر بہادر شاہ

۲۔ غالب اور نسخۂ شیرانی

۳۔ پنجاب یونیورسٹی کے دو گلدستے اور تلامذۂ غالب

۴۔ یادگار غالب۔ ایک تحقیقی مطالعہ

۵۔ غالب اور اسکا ماحول

۶۔ غالب کا ایک شعر

۷۔ غالب کا ایک اور شعر

۸۔ غالب کا نظریۂ شعر

'نذر غالب' میں نسخۂ شیرانی کے عنوان سے ڈاکٹر وحید قریشی نے کلامِ غالب کی تدوین کی تاریخ کا جائزہ ''دیوانِ غالبؔ اُردو' کے دو قلمی نسخوں کے ذکر سے شروع کیا ہے۔ یوں انہوں نے غالب کو تاریخی انداز سے دیکھنے کی سعی کی ہے۔ اِس ضمن میں نسخۂ اول بھوپال جسے قاضی انوارالحق ابنِ مولانا عبداللہ ٹونکی نے دیوانِ غالبؔ کے کئی نسخوں اور بعض دیگر اشعار کا اضافہ کر کے ۱۹۲۳ء میں بھوپال سے شائع کرایا۔ اسے عام طور پر نسخۂ حمیدیہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ غالبؔ کو تاریخی لحاظ سے مرتب کرنے کا خیال سید عبداللطیف، پی ایچ ڈی پروفیسر ادبیاتِ انگلیسی عثمانیہ یونیورسٹی کو آیا اور انہوں نے نومبر ۱۹۲۸ء میں غالب پر کتاب لکھی۔ لیکن یہ سعی ناتمام رہی سید عبداللطیف، نے اپنے طریقِ کار کی نشاندہی:

"Ghalib A critical Appreciation of his Life and urdu Poetry"

میں کی ہے۔ اِسی سے متاثر ہو کر ایس ایم اکرام صاحب نے غالب نامہ کا آغاز کیا اور اس کی اشاعتِ اول کے آخر میں کلامِ غالبؔ کو ترتیب وار درج کرنے کے کام کو ایک معین شکل عطا کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ غالبؔ نامہ پہلی بار دسمبر ۱۹۳۶ء میں شائع ہوا تھا۔ ''غالب نامہ'' میں شیخ اکرام کے ادوار کی تقسیم کے متعلق ڈاکٹر وحید قریشی فرماتے ہیں کہ انہوں نے اس ضمن میں کئی کتب سے استفادہ کیا مثلاً دیوانِ غالب اُردو طبع اول

مملوکہ خان بہادر سید ابو محمد صاحب، قلمی نسخہ ''میخانۂ آرزو'' (بانکی پور لائبریری)، قلمی نسخہ دیوانِ فارسی (رام پور لائبریری) نسخۂ حمیدیہ اور تذکرۂ گلشن بے خار سے خاص طور پر استفادہ کیا ہے۔ دوسری اشاعت کے لیے انہوں نے قلمی نسخہ دیوانِ اُردو (مملوکہ حافظ محمود خان صاحب شیرانی) دیوانِ اُردو طبع ثانی (۱۸۴۷ء) اور دیوانِ فارسی طبع اوّل ۱۸۴۵ء سے مدد لی تھی۔ اِس طرح انہوں نے کلامِ غالب کو پانچ ادوار میں تقسیم کیا۔

پہلا دور ۱۸۰۷ء تا ۱۸۲۱ء

پچیس سال کی عمر سے قبل غالب کے اشعار کا انتخاب

دوسرا دور ۱۸۲۱ء تا ۱۸۲۷ء

اِس ضمن میں وہ اُردو اشعار جو نسخۂ حمیدیہ کے متن میں درج نہیں لیکن اِس قلمی نسخے میں موجود ہیں جو پروفیسر شیرانی کے کتب خانے کی زینت ہے۔ حاشیے میں دو غزلوں کے مطلع درج ہیں:

ے ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغِ رضواں کا
وہ اک گلدستہ ہے ہم بے خودوں کے طاقِ نسیاں کا

ے آبرو کیا خاک اس گل کی جو گلشن میں نہیں
ہے گریباں ننگِ پیراہن جو دامن میں نہیں

تیسرا دور ۱۸۲۷ء سے ۱۸۴۷ء تک کا ہے۔

اس دور کے فارسی اشعار کو تین مختصر ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے۔

الف۔ لالۂ صحرا: ۱۸۲۷ء سے ۱۸۳۰ء تک جو سفر کلکتہ کے دوران میں کہے گئے۔

ب۔ گلِ رعنا: ۱۸۳۰ء سے ۱۸۳۸ء تک جو سفر کلکتہ کے دوران کہے گئے۔

ج۔ بادۂ شیراز: ۱۸۳۸ء سے ۱۸۴۷ء تک جو قلمی نسخہ بانکی پورہ کے بعد لکھے گئے۔

د۔ گلبنِ ہندی اس بیس سال کے عرصے میں غالب کی توجہ فارسی گوئی کی طرف تھی۔

چوتھا دور ۱۸۴۷ء سے ۱۸۵۷ء تک اور پانچواں دور ۱۸۵۷ء سے ۱۸۶۹ء تک کے عرصے میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اِس طرح غالب پر لکھے گئے اِس مقالے یعنی ''نسخۂ شیرانی'' میں ڈاکٹر وحید قریشی نے نسخۂ بھوپال اور نسخۂ شیرانی کے تقابلی مطالعے سے بعض غزلوں کے زمانہ تحریر کا قیاس کیا ہے۔ مجموعی اعتبار سے یہ مقالہ غالب شناسی کی روایت میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہے۔

''نذرِ غالب'' کا تیسرا مقالہ ''تلامذۂ غالبؔ'' پنجاب یونیورسٹی کے دو گلدستے کے عنوان سے ڈاکٹر وحید قریشی کا یہ مقالہ نذرِ غالب سے قبل ''ماہِ نو کراچی'' میں مارچ ۱۹۶۵ء چھپ چکا تھا۔ اِس میں غالب کے دو شاگردوں کا تفصیلی تعارف اور شاعروں کی روداد کا حوالہ دیا گیا ہے۔

یہ مجموعہ جس میں یہ ذکر موجود ہے۔ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہے۔ ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں: ''مشاعرہ دِلّی جس پر لائبریری والوں کو فرحت اللہ بیگ کے دلی کے آخری یادگار مشاعرے یا شمع دہلی، کا شبہ ہوا ہے۔ دراصل فرحت اللہ بیگ سے کوئی علاقہ نہیں رکھتا۔''

۳۲ صفحات کا یہ رسالہ جس میں ۱۲۹۷ھ مطابق ۸۰-۱۸۷۹ء کے مشاعرہ دہلی کا کلام درج ہوا ہے۔ نواب مرزا احمد سعید خان طالب کی فرمائش پر مطبع صادق الانوار، بہاول پور سے چھپا۔

اِس مشاعرے میں جن شعراء نے غزلیں پیش کیں۔ ان میں غالب کے شاگردوں میں سے قمرالدین دہلوی المتخلص پیر جی اور مرزا سعید الدین احمد خان غالبؔ نے دلی کے اس مشاعرے میں شرکت کی۔ ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ اس مشاعرے کے ایک برس بعد قمرالدین پیر جی کا انتقال ہوا۔ لہٰذا یہ آخری مشاعرہ تھا۔ جس میں پیر جی نے شرکت کی۔

ڈاکٹر وحید قریشی نے مالک رام کی کتاب ''تلامذۂ غالبؔ'' کے حوالے سے غالبؔ کے دوسرے شاگرد کا تفصیلاً ذکر کیا ہے جو کہ مرزا سعید احمد خاں عرف نواب سعید احمد خان طالب تھے۔ اس کے بعد ڈاکٹر وحید قریشی نے پیر قمرالدین المتخلص بہ پیر جی کی ایک غزل اور سعید احمد خان طالب کی دو غزلیں اور ایک قطعہ پیش کیا ہے۔ مشاعرہ دہلی کے تعارف کے بعد زیرِ نظر مقالے میں ''گلدستۂ انجمن'' کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔ اِس مجموعے میں دو مشاعروں کی روداد اور کلام شامل ہے۔ غالب شناسی کے ضمن میں یہ مقالہ منفرد اور نئی

معلومات کا حامل ہے۔

''نذرِ غالب، کا چوتھا مضمون ''یادگارِ غالب۔ ایک تحقیقی مطالعہ، نذر غالب میں شامل ہونے سے قبل کئی بار چھپ چکا تھا۔ ڈاکٹر وحید قریشی کے خیال میں یادگار غالب دو حصّوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصے میں مرزا کی زندگی کے واقعات اور ان کے اخلاق و عادات وخیالات کا بیان ہے۔

دوسرے حصے میں مرزا کے تمام کلامِ نظم و نثر کا انتخاب شامل ہے۔ یادگارِ غالبؔ کے اختتام پر حالیؔ، غالبؔ کے کلام کا موازنہ فارسی کے شعراء سے کرنا چاہتے تھے لیکن ظہوری کی ایک غزل کی اصلاح کر کے اسی سے غالب کی ایک غزل کا موازنہ کر دیا۔ کتاب کی تخلیق کے دوران حالیؔ، محمد حسین آزادؔ کے زیرِ اثر بھی رہے۔ یہاں تک کہ دستیاب مواد اور معاصر شہادتوں کی موجودگی کے باوجود تحقیقی مواد اکٹھا نہ کر سکے اور کم مواد پر اکتفا کر کے اس کتاب کو مرتب کیا۔

''نذرِ غالب، کا پانچواں مقالہ'' غالبؔ اور اس کا ماحول، رسالہ اُردو کراچی کے غالب نمبر جنوری مارچ ۱۹۶۹ء میں پہلی بار شائع ہوا ہے۔

ڈاکٹر وحید قریشی اس مقالے میں غالب کی انانیت کے بارے میں فرماتے ہیں: ''عمل اور حرکت سے متعلق ذخیرۂ الفاظ کی کثرت غالبؔ کی ''انا'' کو مثبت راستوں پر بھی گامزن کرتی ہے۔''

ڈاکٹر وحید قریشی نے غالب شناسی کی نئی روایت یوں رقم کی کہ ان کے ہاں تاریخ اور نفسیات دونوں جہتیں متوازی خطوط کی طرح رواں دواں ہیں۔ انہوں نے اس مقالے میں یہ دونوں انداز برتتے ہیں اور اس مقالے کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ اس مقالے میں انہوں نے 'متفرقاتِ غالب' اور ''کلیاتِ نثر غالب'' کے کئی حوالے دیے ہیں۔

''غالب کا ایک شعر'' کے عنوان سے نذر غالب کا چھٹا مقالہ رسالہ فاران کراچی کے شمارہ مئی ۱۹۶۰ء میں شائع ہوا۔ اس میں ڈاکٹر وحید قریشی نے غالب کے ایک شعر کی تشریح مختلف نقادانِ فن کی آراء کی روشنی میں کر کے اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔

یہ شعر یوں ہے۔

؎ نشہ ہا شاداب رنگ و ساز ہا مستِ طرب
شیشہ ے سروِ سبزِ جوئبار نغمہ ہے

اس شعر کی مختلف شارحین نے مختلف تشریحات پیش کیں۔ ان شارحین میں آغا باقر، بے خود، سعید الدین وغیرہ شامل ہیں۔ کسی کے خیال میں رنگ سے مراد رنگِ محفل ہے۔ تو کسی نے اس سے مراد بہار لی۔ کسی نے محفلِ معشوق کا سرور سمجھا۔ تو کسی نے اسے نشے کا رنگ سمجھا۔

مذکورہ بالا شارحین کی آرا نقل کرنے کے بعد ڈاکٹر وحید قریشی فرماتے ہیں:

’شعر کے مرکزی تاثر تک پہنچنے کے لیے ہمیں تشبیہوں کی ظاہری شکل وصورت سے گزر کر اس کے موڈ کو سمجھنے کی کوشش کرنی پڑے گی۔ شعر کی ساخت تشبیہات کے دو تین متوازی سلسلوں کی مرہونِ منت ہے۔ نشہ شاداب رنگ ہے اور ساز مست طرب ہے۔ نغمے کی ندی بہہ رہی ہے اور شیشۂ مے اس ندی کے کنارے ایک سروِ سبز ہے۔ شعر کا مرکزی نقطہ گویا شراب کا نشہ ہے اور اسی کے زیرِ اثر شاعر بہار، نغمے اور ندی کو دیکھتا ہے۔ شعر میں نشے کی کیفیت کو بہار کے پیکر میں مجسم کیا گیا ہے۔ غالب بعض اوقات غم غلط کرنے کے لیے شراب پیتے تھے اور بعض اوقات نشاط کی غرض سے لیکن زیادہ تر ان کی غرض شراب سے نشاط ہی ہے۔[۴]

غالب کی پسند و ناپسند سے ڈاکٹر وحید قریشی ان کی فکر اور نفسیاتی رویوں کا سُراغ لگاتے ہیں۔ مثلاً غالب کو سرخ و سبز رنگ پسند ہے۔ نشے کے لفظ کو بہت جگہ استعمال کرتے ہیں۔

ڈاکٹر وحید قریشی کے ساتویں مقالے کا عنوان ہے۔ ’’غالب کا ایک اور شعر‘‘ اس مقالے میں ڈاکٹر وحید قریشی نے دیوانِ غالب کے سب سے پہلے شعر کی تشریح کی ہے۔

؎ نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

اس شعر کی وضاحت کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں۔

''اس شعر میں شارحین نے خاصے اختلاف کا ثبوت دیا ہے اور نظم طباطبائی سے لے کر دورِ حاضر تک کے شارحین تک توضیحات و تشریحات کا لمبا چوڑا سلسلہ ہے۔ لیکن غالب نے جو وضاحت کی ہے۔ وہ شعر کے مطالب کی مختلف تہوں سے متعلق نہیں۔ بلکہ محض کاغذی ہے پیرہن کی ترکیب سے متعلق ہے۔ ایران کی رسمِ قدیم کا یہ حوالہ کہ دربار میں دادخواہ کاغذ کے کپڑے پہن کر حاکم کے سامنے جاتا تھا اور یہ صورت فریاد اور دادخواہی کی تھی۔''[۴]

اس طرح گویا ڈاکٹر وحید قُریشی نے غالب کی رائے کو دقیع قرار دیا ہے۔ کیونکہ اس شعر میں محض بندے کی خدا سے جدائی کی شکایت نہیں کی گئی بلکہ غالب نے اس شعر میں نقش کو کسی قدر شوخیٔ تحریر کا فریادی قرار دے کر ایک نیم ستائشی اور طنزیہ پیرایۂ اختیار کر لیا ہے۔

''نذر غالب'' میں شامل ڈاکٹر وحید قُریشی کا آخری مقالہ 'غالب کا نظریہ شعر' 'نذر غالب' میں شامل ہونے سے قبل مختلف جگہوں پر چھپ چکا تھا۔ وہ فرماتے ہیں کہ مختلف فارسی شعرا کی کلاسیکیت کی روشنی میں غالب نے اپنا مقام بنایا اور اکبری دور کے استعاروں کو اپنے کلام میں برتا۔ ان استعاروں میں چمن، غنچہ، بہار، نغمہ، ساز، مے، جام، پیمانہ وغیرہ شامل ہیں۔ لیکن غالب کی جودتِ طبع نے یہاں بھی اپنا رنگ دکھایا اور ان استعاروں کو نئے انداز سے برتا۔ ان کی بنیاد ذاتی تجربہ اور مشاہدہ ہوتی تھی۔ خلوصِ دل سے اشعار میں اثر انگیزی پیدا ہوتی ہے۔ جو کلام کی اصل خوبصورتی ہے۔ جذبے کی صداقت شاعر کے کلام کو رنگِ نو عطا کرتی ہے۔ ڈاکٹر وحید قُریشی کے خیال میں غالب، معانی اور الفاظ کی دوئی نہیں بلکہ یکرنگی کے قائل ہیں۔ ان دونوں کو ملا کر وہ کلام میں اثر انگیزی پیدا کرتے ہیں۔

ڈاکٹر وحید قریشی نے 'نذر غالب' میں تحقیقی و تنقیدی شعور کا ثبوت دیا۔ ان کی یہ تصنیف ان کی سترہ برسوں کی ادبی کاوشوں اور تحقیقی سفر کا حاصل ہے۔ انہوں نے اس تصنیف میں غالب کو ہر پہلو سے جانا اور پرکھا۔ غالب کی جذباتی زندگی کے نشیب و فراز کا سُراغ ان کے استعاروں سے لگایا۔

غالب کے پسندیدہ، سرخ و سیاہ رنگوں میں غالب کے ذہنی سفر کی منزل نظر آتی ہے۔ محبوب کے سراپا میں بھی وہ دہی رنگ دیکھتے ہیں۔ جو ان کی انا کی تسکین کا سامان فراہم کر سکیں۔

بحیثیت مجموعی 'نذر غالب' میں ڈاکٹر وحید قُریشی نے جامع اور مدلل انداز میں غالب کی شخصیت، بے چارگی، انانیت، حزن و ملال اور پھر امید سے بھری یاسیت کا سراغ لگایا ہے۔ وہ غالب کے مرکزی تاثر تک پہنچنے کے لیے خاص تشبیہوں سے گزر کر ان کے موڈ کو سمجھتے ہیں۔ انہوں نے نذر غالب میں متفرق مضامین جمع کر دیے۔ جن میں انہوں نے غالبیات کے سرمائے میں قابل قدر اضافہ کیا ہے۔

غالبیات کے سلسلے میں ڈاکٹر وحید قریشی کی تدوینی خدمات کی رسالہ صحیفہ مجلسِ ترقی ادب' لاہور ترجمانی کرتا ہے۔ جس کے ایک سے زیادہ غالب نمبر شائع ہوئے۔ اس کے مرتبین میں ڈاکٹر وحید قُریشی کا اسم گرامی نمایاں ہے۔ اس رسالے نے جامعیت اور معیار کی نئی اقدار قائم کیں۔

اس رسالے نے ۱۹۶۹ء کے بعد کے برسوں میں صحیفہ کے کچھ شماروں میں مطالعہ غالب کے سلسلے کے خصوصی گوشے قائم کیے۔ ''صحیفہ'' کے غالب نمبروں پر تو ڈاکٹر وحید قریشی کا نام رقم ہے ہی لیکن ان کے ساتھ ساتھ اندرونی سرورق پر ذیل کی تفصیل کے مطابق دو ناموں کا اندراج ملتا ہے۔

مدیر اعزازی: ڈاکٹر وحید قریشی

مدیر معاون: کلب علی خان فائق

'صحیفہ' کے غالب نمبروں میں سے پہلا غالب نمبر جنوری ۱۹۶۹ء میں چھپا۔ پانچ سو صفحات پر مشتمل ہے۔ اس اداریئے میں ڈاکٹر وحید قریشی لکھتے ہیں:

> ''غالب اردو اور فارسی کا عظیم شاعر ہے۔ اس کے انتقال کو سو برس ہو گئے مجلس ترقی ادب لاہور اس خاص تقریب پر 'صحیفہ' کا یہ غالب نمبر پیش کر رہی ہے جس میں ہم پاک و ہند کے غالب شناسوں کی نگارشات شائع کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں۔ یہ نمبر ضخامت کی وجہ سے دو حصوں میں تقسیم کرنا پڑا پہلا حصہ پیشِ خدمت ہے۔ دوسرا حصہ اپریل میں باصرہ نواز ہوگا۔''[۵]

(اداریہ صحیفہ لاہور غالب نمبر حصہ اول جنوری ۱۹۶۹ء)

ڈاکٹر وحید قریشی کی ادارت میں چھپنے والے اس نمبر کی فہرست مندرجہ ذیل ہے۔

۱۔ غالب کا زمانہ ۱۷۹۷ء یا ۱۸۶۹ء از ڈاکٹر محمد شمس الدین صدیقی۔ صفحہ ۱۔۱۵

۲۔ آب حیات کے مسودے میں غالب کے حالات آغا محمد باقر صفحہ ۱۶۔۶۰

۳۔ مرزا غالب کی ایک نئی غزل، ڈاکٹر حکم چند نیر صفحہ ۶۱ تا ۶۷

۴۔ بسلسلۂ غالب، اکبر علی خان صفحہ ۶۸ تا ۸۱

۵۔ غالب کی تاریخ گوئی۔ کسریٰ مہاس صفحہ ۸۲۔ ۱۰۶

۶۔ غالب اور ان کی ہم عمر صحافت۔ ڈاکٹر عبد السلام خورشید صفحہ ۱۰۷۔۱۲۷

۷۔ غالب پر ابو الکلام آزاد کا ایک مقالہ، عتیق صدیقی صفحہ ۱۲۸۔۱۴۵

۸۔ غالب اردو اخبار میں مُرتضیٰ حسین فاضل صفحہ ۱۴۶۔۱۵۴

۹۔ مختصات نثر غالب نجم الاسلام صفحہ ۱۵۵۔۱۶۵

۱۰۔ مرزا غالب کا اسلوب نگارش، (پنج آہنگ میں) ڈاکٹر عندلیب شادانی صفحہ ۱۶۶۔۱۸۳

۱۱۔ غالب اور زوال معجم، سید قدرت نقوی صفحہ ۱۸۴۔۲۱۳

۱۲۔ محاسنِ خطوطِ غالب، ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار صفحہ ۲۱۴۔۲۳۶

۱۳۔ قاطع القاطع، قاضی عبد الودود صفحہ ۲۳۷۔۲۶۶

۱۴۔ غالب کا سکہ شعر، ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی صفحہ ۲۶۷۔۲۷۲

۱۵۔ مرزا غالب کا سفر کلکتہ اور بیدل، ڈاکٹر عبد الغنی صفحہ ۲۷۳۔۲۹۱

۱۶۔ مرزا غالب کی فارسی غزل محمد منور صفحہ ۲۹۲۔۳۳۲

۱۷۔ ابر گہر بار کا ایک پہلو، اسلوب احمد انصاری صفحہ ۳۳۳۔۳۴۱

۱۸۔ کلامِ غالب میں تمثال شعری کا مقام، اختر اقبال کمالی صفحہ ۳۴۲۔۳۶۹

۱۹۔	غالب کی تہذیبی شخصیت کا تعارف، جیلانی کامران	صفحہ ۳۷۰۔۴۰۰
۲۰۔	غالب ایک جدید شاعر۔ ڈاکٹر وزیر آغا	صفحہ ۴۰۱۔۴۱۵
۲۱۔	غالب کی مشکل پسندی، انور سدید	صفحہ ۴۱۶۔۴۳۱
۲۲۔	غالب کی فن کارانہ ہمہ گیری	صفحہ ۴۳۲۔۴۶۹
۲۳۔	افکار غالب کے نئے زاویے مولانا غلام رسول مہر	صفحہ ۴۷۰۔۴۷۶
۲۴۔	Whispers from Ghalib زیتون عمر	
۲۵۔	Whispers from Ghalib صوفی اے کیو نیاز	

ان پچیس مستقل مقالات کے بعد رفتار ادب کے تحت کچھ کتابوں پر تبصرے کیے گئے۔ ان میں سے کچھ کتابیں براہِ راست غالب سے متعلق ہیں اور کچھ کسی نہ کسی عنوان سے غالب کے موضوع سے قریب تر ہیں:

۱۔	سرودِ غالب از یوسف بخاری دہلوی تبصرہ نگار نسرین کوثر	صفحہ ۴۸۴۔۴۸۵
۲۔	مقام غالب عبدالعمد صارم الازہری، مبصر مسکین علی حجازی	صفحہ ۴۸۵
۳۔	فگار دہلوی۔ حالات و انتخاب کلام، محمد اکرام چغتائی، تبصرہ نگار گوہر نوشاہی	صفحہ ۴۸۵۔۴۸۹
۴۔	کلیاتِ نثرِ غالب جلد اول، مرتبہ شیخ محمد اسماعیل، پانی پتی	صفحہ ۴۹۰۔۴۹۱

رسالہ صحیفہ کے غالب نمبر کو ادبی و علمی حلقوں میں پُر جوش طریقے سے سراہا گیا اور برصغیر کے طول و عرض سے اس پر داد و تحسین سے معمور خطوط آنے لگے۔ ان میں ادبی شخصیات، ماھنامے اور اخبارات بھی شامل تھے یہ خطوط مختلف اوقات میں ڈاکٹر وحید قریشی کے نام تحریر کیے گئے اور صحیفہ کے اس بے مثال نمبر پر انہیں مبارک باد پیش کی گئی۔

مداحوں کے ان خطوط کو 'صحیفہ' لاہور شمارہ اپریل ۱۹۶۹ء کے آخر میں محفوظ کر دیا گیا ہے۔

ان خطوط میں 'صحیفہ غالب نمبر' کے تحقیقی وتنقیدی انداز کو سراہا گیا اور ڈاکٹر وحید قریشی کی پُر خلوص ریاضت اور جدوجہد کو خراجِ تحسین پیش کیا گیا۔ جس کی بدولت صحیفے کا غالب نمبر ایک تاریخی دستاویز کی سند اختیار کر گیا اور اردو ادب میں ایک نئے باب کا آغاز ہوا یہ تو احوال تھا صحیفہ غالب نمبر کے حصہ اول کا۔

''صحیفہ'' لاہور غالب نمبر حصہ دوم اپریل ۱۹۶۹ء میں شائع ہوا۔

اس کے مرتب بھی ڈاکٹر وحید قریشی ہی تھے۔ اندرونی صفحات پر انہیں مدیر اعزازی اور کلب علی خان فائق کو مدیر معاون بتایا گیا۔

غالب نمبر حصہ دوم کے بارے میں کوئی ادارتی نوٹ مدیر یا مرتب کی جانب سے درج نہیں کیا گیا۔ یہ شمارہ ۱۳۱ صفحات پر مبنی تھا۔ اس کے مضامین شمولات کچھ اس طرح سے تھے۔

۱۔	غالب کی شاعری میں تسکین ضمیر، ابن فرید		صفحہ ۱ تا ۳۱
۲۔	غالب۔ بٹی ہوئی شخصیت کا مسئلہ		صفحہ ۳۲ تا ۳۵
۳۔	غالب ہیئت شناس و ہیئت ساز	افتخار جالب	صفحہ ۳۶ تا ۵۱
۴۔	غالب کی دورنگی، ڈاکٹر سہیل بخاری		صفحہ ۵۲ تا ۶۱
۵۔	غالب اور خود داری	ڈاکٹر گوپی چند نارنگ	صفحہ ۶۲ تا ۶۷
۶۔	غالب کا شعور کائنات عتیق احمد		صفحہ ۶۸ تا ۸۵
۷۔	غالب اور شعور حیات	ڈاکٹر تنویر احمد علوی	صفحہ ۸۶ تا ۹۷
۸۔	کلام غالب میں طنز و ظرافت	(قسط اول) یوسف جمال انصاری	صفحہ ۹۸ تا ۱۰۸
۹۔	غالب کی مشکل پسندی	(شمس الرحمٰن فاروقی)	صفحہ ۱۰۹ تا ۱۲۲
۱۰۔	غالب اور فلسفہٴ ویدانت	(حافظ عباد اللہ فاروقی)	صفحہ ۱۲۳ تا ۱۲۸

''صحیفہ'' لاہور، شمارہ جولائی، ۱۹۶۹ء کے آخری صفحات میں صحیفہ کے پہلے اور دوسرے شماروں کے

بارے میں مزید حوصلہ افزا تبصرے اور خطوط سے اکتسابات دیے گئے۔ جن میں مدیر اور مرتب کی دیدہ ریزی اور کاوشوں کو سراہا گیا۔

مثال کے طور پر مس زیتون عمر نے آکسفورڈ سے لکھا:

> "I have received your edition of the Ghalib number of Sahifa; may i congratulate you on an issue that even Ghalib may gave smiled at, for it is both learned and readable in England, it is particularly nice to see such labour being taken at home. I look forward to the following numbers." ۲

ان کے علاوہ ڈاکٹر حامد حسین، شمس الرحمٰن فاروقی لکھنؤ، ڈاکٹر عبد الاحد خلیل لکھنؤ، ڈاکٹر مناظر احسن ہر گانوی بھارت، ڈاکٹر لئیق بابری لاہور، ڈاکٹر عبد السلام خورشید لاہور، رسالہ اُردو زبان سرگودھا، ڈاکٹر فرمان فتحپوری کراچی، ریڈیو پاکستان لاہور، مالک رام بھارت، سلیم اختر ملتان، خواجہ حمید الدین شاہد کراچی، انور سدید سرگودھا ، ڈاکٹر سہیل بخاری سرگودھا، سید سبط حسن کراچی، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ امریکہ، رسالہ سادہ لاہور، رسالہ چٹان لاہور، ڈاکٹر بشیر حسین لاہور، عزیز احمد کینیڈا' ماجد الباقری راولپنڈی' آفتاب احمد خان مشیر اقتصادیات پلاننگ بورڈ کویت، مسعود گوہر کراچی کی طرف سے بھی ہدیہ تہنیت پیش کیا گیا۔

صحیفہ غالب نمبر کی دوسری جلد نے مضامین کی فکر انگیزی کے حوالے سے نئی مثالیں رقم کیں۔ ان میں وہ رچا ہوا مذاقِ علم و ادب موجود تھا۔ جو معیار نقد و تحقیق پر پورا اُترتا ہے۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ پوری چھان بین کے ساتھ مختلف مکتبہ خیال کے لوگوں کو غالب کے سلسلے میں اظہار کی دعوت دی گئی۔ جس سے پڑھنے والوں کو غالب شناسی میں مزید مدد ملی۔ اس لحاظ سے صحیفہ کا غالب نمبر، بر عظیم کے سب رسائل پر فوقیت حاصل کر گیا۔ کہ اس میں پاکستان اور بھارت کے چوٹی کے ماہرین غالبیات کی نگارشات شامل تھیں۔ علمی و ادبی حلقوں نے اس امر کا اعتراف کیا کہ ڈاکٹر وحید قریشی کے زیر ادارت آنے کے بعد صحیفہ ایک تحقیقی مجلّہ بن گیا اور اس میں ایک اعلیٰ ادبی تحقیقی مجلّہ کی ساری خصوصیات نظر آنے لگیں۔

صحیفہ کا تیسرا غالب نمبر جولائی ۱۹۶۹ء میں شائع ہوا۔ پہلے دو نمبروں کی طرح یہ نمبر بھی معیار کے لحاظ سے بے مثال ثابت ہوا اس کے صفحات ۱۵۴ تھے۔ اس کے مندرجات کی تفصیل حسبِ ذیل ہے۔

۱۔ نسخہ حمیدیہ کی فروگزاشتیں (نسخہ بھوپال کی روشنی میں) مولانا امتیاز علی عرشی۔ صفحہ ۱ تا ۲۸۔

۲۔ دیوانِ غالبؔ (نسخۂ بھوپال) ثبت دستخط اور مہریں، (ڈاکٹر سیّد حامد حسین، صفحہ ۲۹ تا ۳۹)

۳۔ غالب اور صغیر بلگرامی (قسط اوّل) (مشفق خواجہ، صفحہ ۴۰ تا ۷۲)

۴۔ غالب اور مارہرہ (محمد ایوب قادری، صفحہ ۷۳)

۵۔ غالب کا ایک خط اور ناظم سے منسوب غزل (اسرار الحق، صفحہ ۹۱ تا ۹۳)

۶۔ غالب کے دو جعلی شاگرد اور ایک جعلی تحریر (ڈاکٹر خلیق انجم، صفحہ ۹۴ تا ۱۰۷)

۷۔ غالبؔ اور اصولِ لغت نگاری (ڈاکٹر شوکت سبزواری، صفحہ ۱۰۸ تا ۱۲۹)

۸۔ کلامِ غالب میں طنز وظرافت آخری قسط (یوسف جمال انصاری، صفحہ ۱۳۰ تا ۱۴۲)

صحیفہ کے اس غالب نمبر نے بھی حسب سابق بڑی قدر و منزلت پائی۔ صحیفہ لاہور شمارہ اکتوبر ۱۹۶۹ء میں اس تیسرے غالب نمبر پر اہل قلم اور علمی و ادبی حلقوں کی جانب سے رسائل کے لیے تبصرے دیے گئے ہیں۔ جن میں صحیفہ کے غالب نمبر کو فنی، فکری اور تحقیقی اعتبار سے گراں مایہ دستاویز قرار دیا گیا۔ صحیفہ لاہور غالب نمبر حصہ چہارم اکتوبر ۱۹۶۹ء میں چھپا اور اس کے صفحات ۱۷۲ تھے۔ اس میں بھی اداریہ نہیں تھا۔ اس کے مشمولات کی فہرست درج ذیل ہے۔

۱۔ غالب اور صغیر بلگرامی (دوسری اور آخری قسط) مشفق خواجہ، صفحہ ۱ تا ۲۹۔

۲۔ غالب اور غالب تخلص کے اُردو شعراء، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، صفحہ ۳۱ تا ۵۷۔

۳۔ یادگارِ غالب اور مقدمہ شعر و شاعری میں غالب کے بعض اشعار۔ (سعادت علی صدیقی، صفحہ نمبر ۵۸ سے ۶۵)

۴۔ غالب کے نقاد۔ (ڈاکٹر گیان چند، صفحہ ۶۶ تا ۷۸)

۵۔ غالب اور ہمارا قومی شعور)(فتح محمد ملک، صفحہ ۷۹ تا ۸۳)

۶۔ غالب کا ذہنی افق، مرزا ادیب، صفحہ ۸۴ تا ۹۱۔

۷۔ غالب کا سیاسی ماحول، ڈاکٹر محمد باقر، صفحہ ۹۲ تا ۹۸۔

۸۔ غالب کی ادا شناسی اور نوا سنجی، عشرت رحمانی (صفحہ ۹۹ تا ۱۰۲)

۹۔ غالب کی تفہیم، ڈاکٹر عابد رضا بیدار، صفحہ ۱۰۳ تا ۱۰۶۔

۱۰۔ غالب کے دو شاگردوں کے متعلق دو سوال (شیخ محمد اسماعیل پانی پتی، صفحہ ۱۰۷ تا ۱۱۰)

۱۱۔ غالب کے پانچ اشعار فرانسیسی میں ترجمہ۔ ڈاکٹر لئیق بابری)

۱۲۔ غالب کے اشعار پر نثری تضمین (ایم۔ اسلم، صفحہ ۱۱۳ تا ۱۱۵)

۱۳۔ غالب اور ان کی بیگم دیوانِ غالب میں سے ایک شعری مکالمہ سید امتیاز علی تاج، صفحہ ۱۱۶ تا ۱۲۲)

اِن مستقل مندرجات کے علاوہ رفتارِ ادب کے تحت کتابوں پر تبصرے بھی کیے گئے جو صفحہ ۱۲۳ تا ۱۶۵ پر مشتمل ہیں۔ اِن تبصروں میں کچھ غالبیات سے متعلق کتابوں کے کچھ حصے پر مشتمل ہیں۔

اِن کی تفصیل حسبِ ذیل ہے۔

۱۔ کلیاتِ ظفر مرتبہ عمر فیضی تبصرہ نسرین کوثر، صفحہ ۱۲۳ تا ۱۲۴۔

۲۔ ولی سے اقبال تک۔ اِس میں کچھ مضامین غالب سے متعلق ہیں۔ (سیّد عبداللہ، صفحہ ۱۲۶ تا ۱۲۸)

۳۔ دبستانِ غالب ناصر الدین ناصر مبصر محمد بشیر حسین (صفحہ ۱۶۴ تا ۱۶۵)

۴۔ غالب کی صد سالہ برسی ۱۹۶۹ء کے موقع پر صحیفہ کے مندرجہ بالا چار نمبر شائع ہوئے اپریل ۱۹۷۳ء میں صحیفہ کا شمار ۳۶ غالب نمبر حصہ پنجم کے طور پر چھپا۔ جس کے مدیر اعزازی ڈاکٹر وحید قریشی اور مدیر معاون کلب علی خان فائق تھے۔

صحیفہ غالب نمبر حصہ پنجم کے سولہ مقالات میں سے ابتدائی سات غالب سے متعلق ہیں۔

۱۔ علاؤ الدین احمد خان کے نام غالب کا نادر مکتوب مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی، صفحہ ۱ تا ۱۲۔

۲۔ دیوانِ غالب نسخۂ شیرانی، قسط اول۔ (سیّد قدرت نقوی، صفحہ ۱۳ تا ۳۹)

۳۔ مرزا غالب اور شاہ نصیر عبدالرزاق چوہدری (صفحہ ۴۰ تا ۵۶)

۴۔ غالب۔ آتش زیرپا، سلیم اختر (صفحہ ۵۷ تا ۷۷)

۵۔ غالب کا ذہنی وفکری ارتقاء۔ عباد فاروقی، صفحہ ۷۸ تا ۸۶)

۶۔ سخن دہلوی اور غالب۔ رخصت القاسمی (صفحہ ۸۷ تا ۱۰۲)

۷۔ مطلع دیوانِ غالب منظور احسن عباسی (صفحہ ۱۰۳ تا ۱۰۴)

اِس نمبر کے آخری تین مضامین معروف غالب شناس شیخ محمد اکرام سے متعلق ہیں:

۱۔ قطعہ تاریخِ وفات ڈاکٹر شیخ محمد اکرام از فاضل زیدی، صفحہ ۱۵۴۔

۲۔ محمد اکرام (از ڈاکٹر ممتاز حسن، صفحہ ۱۵۵ تا ۱۵۷)

۳۔ سوانح حیات شیخ محمد اکرام مرحوم از پروفیسر حمید احمد خان، صفحہ ۱۵۸ تا ۱۶۴)

صحیفہ کے ان پانچ غالب نمبروں کے درمیان ۱۹۷۰ء اور ۱۹۷۱ء میں بھی صحیفہ کے دو شماروں میں غالب سے متعلق کچھ حصے مخصوص کیے گئے، اِن کی تفصیل یہ ہے:

صحیفہ شمارہ ۵۲، جولائی ۱۹۷۰ء:

۱۔ تلامذہ غالب، تحسین سروری، (صفحہ ۴۹ تا ۵۹)۔

۲۔ غالب کا ایک دکنی شاگرد افسر صدیقی امروہوی (صفحہ ۶۰ تا ۷۰)

۳۔ ترجمۂ کلام غالب اُردو سے انگریزی (مترجم زیتون عمر، صفحہ ۷۱ تا ۷۳)

صحیفہ شمارہ ۵۵ اپریل ۱۹۷۱ء:

۱۔ دیوانِ غالب قلمی نسخہ بھوپال (ملکیت اور کتابت ڈاکٹر ابو محمد سحر، صفحہ ۱۲۳ تا ۱۴۰)

۲۔ کارنامۂ غالب (تعارف وتبصرہ) (ڈاکٹر شوکت سبزواری، صفحہ ۱۴۱ تا ۱۴۹)

۳۔ مجلسِ یادگار غالبؔ پنجاب یونیورسٹی کی سات کتابوں پر تبصرہ از کلب علی خان فائق، صفحہ ۱۵۰ تا ۱۶۲)

۴۔ غالب۔ لائف اینڈ لیٹرز (رالف رسل اور خورشید الاسلام پر تبصرہ)، مبصر سلیم اختر، صفحہ ۱۶۲ تا ۱۶۸)

صحیفہ کے اِن غالبؔ نمبروں میں ڈاکٹر وحید قریشی کا کوئی مقالہ شامل نہیں۔ لیکن یہ نمبر ان کی محنتِ شاقہ اور حسنِ ترتیب کے غماز ہیں۔ ان کے ذریعے انہوں نے فکرِ غالب کے پنہاں گوشوں کو ہر جگہ پھیلا دیا اور آنے والی نسلوں کے لیے فکرِ غالب تک رسائی کو سہل بنایا اور اس میں نئے امکانات تلاش کرنے کے عمل کو جاذب اور دلکش بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔

''نذرِ غالب'' اور صحیفہ کے پانچ غالب نمبروں کے علاوہ ڈاکٹر وحید قریشی نے غالب پر مقدار کے لحاظ سے تو کم لیکن معیار کے حوالے سے بہترین کام کیا۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کی دعوت پر ڈاکٹر وحید قریشی ۱۹۹۱ء میں غالب بین الاقوامی سیمینار میں شریک ہوئے۔ یہ سالانہ بین الاقوامی سیمینار ۲۰۔۲۱، ۲۲ دسمبر ۱۹۹۱ء کو ایوانِ غالب نئی دہلی میں منعقد ہوا جس کا افتتاح ۲۰ دسمبر ۱۹۹۱ء کو شام پانچ بجے حکومتِ ہند کے مرکزی وزیر ریلوے سی کے جعفر شرف نے کیا۔

دوسرے روز ۲۱ دسمبر ۱۹۹۱ء کی صبح دس بجے بین الاقوامی سیمینار شروع ہوا جس میں پاکستان مندوب کے طور پر ڈاکٹر وحید قریشی نے ایک مختصر مقالہ پڑھا۔

بعنوان: ''خوف زدہ غالب اور عصری صورتحال''

یہ مقالہ غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی کے مجلّے ''غالب نامہ'' میں چھپا۔ ڈاکٹر وحید قریشی کے خیال میں،

غالب کی ذہنی زندگی اور حقیقی زندگی کے درمیان فاصلے تھے ناآسودگی اور ناقدری کے احساس نے انہیں عمر بھر ملول رکھا۔ یہی داخلی اضطراب ان کے تصورِ غم، تصورِ رشک اور تصورِ فن میں بدل گیا۔ ڈاکٹر وحید قریشی کا یہ مقالہ غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی کے مجلے غالب نامہ کی جلد۳ اور دوسرے شمارے میں جولائی ۱۹۹۲ء میں چھپا۔ بعد ازاں یہی مقالہ کسی قدر اضافے اور ترمیم کے ساتھ رسالہ اوراق لاہور شمارہ جون جولائی ۱۹۹۲ء میں شائع ہوا۔ ڈاکٹر صاحب کا خیال یہ ہے کہ ذہنی اور حقیقی زندگی کے فاصلوں کے باعث غالب کی ذات مختلف عصری صورتوں سے خوف زدہ محسوس ہوتی ہے۔

غالب ہمیشہ Nostalgic رہے۔ان کا شخصی ماحول ایک امیر زادے کا تھا لیکن ساتھ ساتھ یتیمی کا احساس اور ایک خوف کا عنصر انہیں اپنے اجداد کی عالی نسبی کے بار بار ذکر کے ذریعے وہ آپ اپنے کو یہ باور کراتے رہے کہ وہ حاکم ترک نسل سے ہیں۔ نفسیاتی طور پر برتری کا یہ اظہار فی الاصل احساس کمتری ہی ہے۔ ان کے محدود وسائل نے انہیں مقروض ہونے پر مجبور کیا لیکن وہ جاگیردارانہ معیار کے مطابق زندگی بسر کرنے کی ہمیشہ آرزو کرتے رہے۔ جس کا سبب بتاتے ہوئے ڈاکٹر وحید قریشی کہتے ہیں کہ اس کی وجہ یہ تھی غالب کو ننھیال کے مالی رحم و کرم پر پلنا پڑا اور وہ ہمیشہ خود کو خاندان کے مقابلے میں کم حیثیت تصور کرتے رہے۔ غالب نے جہاں ذاتی زندگی میں دوہرے معائیر کے ساتھ زندگی بسر کرنے کی خلش برداشت کی وہاں جدید انگریزی حکومت کی عقلی طرفداری اور قدیم معاشرتی اقدار کی قدردانی کا تضاد بھی ان کے قلب و جاں میں پلتا رہا۔ یہ عقلی اور جذباتی آمیزش تھی جس نے ان کے کلام اور فن دونوں کو عصری صورتحال کا سچا غماز بنا دیا۔

خوفزدہ غالب جب زندگی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتا ہے تو خوف کی ایک لہر اس کے رگ و پے میں دوڑ جاتی ہے یہی خوف غالب کو بار بار تخیل کی بلند پروازی کی جانب مائل کرتا ہے زندگی کے آخری ایام میں اس خوف میں ناکامی کا احساس بھی شامل ہو گیا۔

شعبہ اُردو گورنمنٹ کالج لاہور کے مجلے ''تحقیق نامہ'' شمارہ ۳۔۴، سال ۹۵۔۱۹۹۴ء میں ''جاگیرِ غالب۔۔۔۔۔ ایک مطالعہ'' کے عنوان سے ڈاکٹر وحید قریشی کا ایک مضمون شائع ہوا جو دراصل ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کی تدوین شدہ کتاب ''جاگیرِ غالب'' پر ایک علمی تبصرہ ہے۔ یہ مضمون ڈاکٹر سیّد معین الرحمٰن کی

تالیف ''نقوشِ غالب'' میں بھی شریک ہے۔

یہاں ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کی علمی و ادبی فتوحات کا تذکرہ بھی کرتے ہیں اور ساتھ ساتھ دیگر غالب شناسوں کا حوالہ بھی دیتے ہیں۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے پرتھوی چندر کے غالب سے ربطِ خاص کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ انہوں نے غالب کے بارے میں دو اہم کتابیں شائع کیں۔ ایک مرقع غالب، اور دوسری حقِ جاگیرِ غالب۔ اشاعت ثانی کے وقت کتاب کا نام ''حقِ جاگیرِ غالب'' کی بجائے ''جاگیرِ غالب'' قرار دیا گیا۔ ڈاکٹر وحید قریشی کے بقول ''جاگیر غالب'' کی اشاعت ثانی ڈاکٹر معین الرحمٰن کا ایسا کارنامہ ہے جس نے انہیں غالبیات میں اہم ترین مقام عطا کیا۔ انہوں نے غالب کے بارے میں یہ دستاویز چھاپ کر حیاتِ غالب کے اہم گوشے کو اُجاگر کیا ہے۔ پرتھوی چندر کی کتاب کی یہ تدوینِ نو ایسی کاوش ہے جس نے ایک گم شدہ گراں مایہ متاع کو پڑھنے والوں کے لیے محفوظ کر دیا ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے جاگیرِ غالب پر جو مختصر تبصرہ کیا۔ وہ دراصل برسوں بعد چھپنے والی ایک کارآمد تحریر ہے۔ جس میں انہوں نے غالب شناسی کی دیرینہ قدر کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر معین الرحمٰن کی اِس اَدبی کاوش کو سراہا ہے۔

اِس کے علاوہ رسالہ ''اُردو ڈائجسٹ'' لاہور شمارہ فروری ۱۹۶۶ء میں ''کلیاتِ غالب'' ناشر احمد علی شیخ، شیخ مبارک علی، اندرون لوہاری دروازہ لاہور ۱۹۶۵ء صفحہ ۶۷ پر ڈاکٹر وحید قریشی کا ایک مختصر تبصرہ شائع ہوا، جو مندرجہ ذیل ہے:

> غالب کے اُردو دیوان کی مقبولیت نے ان کے فارسی کلام کی طرف سے ادب کے طالب علموں کو غافل کر دیا تھا حالانکہ خود غالب اپنے اُردو کلام کو مجموعہ بے رنگ قرار دیتے تھے اور فارسی کے کلام کو اپنا اصل کارنامہ جانتے تھے حقیقت یہ ہے کہ غالب کی عظمت کا اصل ثبوت ان کے فارسی کلام میں ہی ملتا ہے۔ یوں اُردو کے کلام کی مدد سے ان کا جائزہ مکمل نہیں ہوسکتا۔ جب تک فارسی کلام کو سامنے نہ رکھا جائے۔ کلیات کی موجودہ اشاعت اس ضرورت کو پورا کرتی ہے۔ متن کی بنیاد غالباً نول کشور کے شائع کردہ کُلیات کے تیسرے اڈیشن ۱۹۲۴ء پر رکھی گئی ہے۔ اس نسخے کی خرابی یہ تھی کہ اس میں املاء کا کوئی اصول مقرر

نہ تھا۔ موجودہ نسخے میں بھی اس کا کوئی خیال نہیں رکھا گیا۔ اس سے قطع نظر صحت متن کی پابندی البتہ کی گئی ہے کتابت و طباعت کی اغلاط کم ہیں شروع میں مولانا غلام رسول مہر کا دیباچہ شامل ہے۔ جس میں غالب کے حالات درج ہیں۔ اس کے بعد یادگارِ غالب کا ایک طویل اقتباس بطور مقالہ شامل ہے۔ جس میں غالب کے فارسی کلام کا ایک مفصل جائزہ لیا گیا ہے۔ اس وقت جبکہ ملک سے فارسی کا ذوق اُٹھتا جارہا ہے۔ امید ہے شائقین، ناشرین کی اس ''جسارت'' کو بنظرِ استحسان دیکھیں گے۔ ۷

یہ تبصرہ مختصر ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ سیر حاصل بھی ہے۔

۱۹۸۱ء میں ڈاکٹر سیّد معین الرحمٰن کی کتاب ''تحقیق غالب'' شائع ہوئی۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے اس کا فلیپ تحریر کیا۔ اس میں بھی ڈاکٹر صاحب نے ڈاکٹر سید معین الرحمٰن کی غالب شناسی کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے ان کے نتائج کو قابلِ قدر اور لائقِ تحسین قرار دیا ہے۔

غالبیات میں ڈاکٹر وحید قریشی کا اندازِ فکر دنظر متوازن اور نقطۂ نظر معروضی ہے۔ وہ داخلی و خارجی دونوں شہادتوں کو سامنے رکھ کر مسلمہ حقائق کے ساتھ نتائج فکر پیش کرتے ہیں۔ ان کی کتاب 'نذرِ غالب' نے غالب شناسی کے نئے دروازے کھول دیے ہیں۔ اس میں تحقیق و تنقید دونوں اندازِ نظر موجود ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ صحیفہ کی ادارت میں انہوں نے غالب شناسی کی نئی روایات کو فروغ دیا ہے۔ اور غالبیات سے شغف رکھنے والوں کے لیے ایسا تحقیقی اور بنیادی مواد جمع کر دیا ہے۔ جو آنے والی نسلوں کے لیے معاون ثابت ہوگا۔ مجلس ترقی ادب نے 'صحیفہ' کے غالب کو جس محنت اور محبت سے آراستہ کیا۔ وہ ڈاکٹر وحید قریشی جیسے مدیر اور محقق کی محنت شاقہ کا مرہونِ منت ہے۔

ڈاکٹر وحید قریشی نے ۱۵ اکتوبر ۱۹۷۱ء کو شہنشاہِ ایران کے اڑھائی ہزار سالہ جشن کی مناسبت سے ارمغانِ ایران، مجلس ترقی ادب لاہور، اکتوبر ۱۹۷۱ صفحات، ۲۰۲ صفحات کے نام سے ایک کتاب مرتب کی۔ 'ارمغان ایران' رسالہ 'صحیفہ' میں وقتاً فوقتاً ادبیات فارسی سے متعلق شائع ہونے والے مقالات کا ایک انتخاب ہے۔

اس میں شامل سات مقالات میں سے چار غالب سے متعلق ہیں۔

غالب شناس کے طور پر ڈاکٹر وحید قریشی کی اہمیت کا ایک پہلو یہ ہے کہ وہ ۲۵ اپریل ۱۹۷۳ سے ۱۹۸۲ء تک پنجاب یونیورسٹی میں غالب پروفیسر کے طور پر فائز رہے۔ ان کی نگرانی میں ایک ریسرچ اسکالر محمد ایوب شاہد نے ''شارحین غالب کا تنقیدی مطالعہ'' کے موضوع پر پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری لی۔ ڈاکٹر محمد ایوب شاہد کا یہ مقالہ مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور سے دو جلدوں میں چھپ چکا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے غالب کو ہر پہلو سے سمجھا اور اسکو بیان کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ نفسیات سے گہرے لگاؤ اور مطالعے نے انہیں غالب کی نفسیاتی سطح پر تشریح طرف مائل کیا۔

☆☆☆

حوالہ جات (باب چہارم)

۱ وحید قریشی ڈاکٹر، تنقیدی مطالعے، کارواں پریس لاہور، ۱۹۶۷ء،

۲ وحید قریشی ڈاکٹر، نذر غالب، یادگار غالب کراچی۔ طبع سوم ۲۰۰۴ء۔ صفحہ ۱۳ تا ۱۴۔

۳ ایضاً۔ دیباچہ از ڈاکٹر ایس اے رحمٰن۔

۴ ایضاً۔ صفحہ ۲۱۳ تا ۲۱۴۔

۵ اداریہ صحیفہ لاہور غالب نمبر حصہ اول جنوری ۱۹۶۹ء۔

۶ بحوالہ صحیفہ لاہور شمارہ جولائی ۱۹۶۹ء، صفحہ نامعلوم۔

۷ رسالہ اردو ڈائجسٹ لاہور شمارہ فروری ۱۹۹۶ء، صفحہ ۶۷۔

☆☆☆

باب پنجم

ڈاکٹر وحید قریشی بحیثیت نقاد

ڈاکٹر وحید قریشی کی ادبی حیثیت ہمہ جہت ہے۔ اُردو ادب، فارسی ادب، تاریخ، نفسیات، شاعری، تحقیق، تدریس غرض یہ کہ کوئی شعبہ ایسا نہیں جس میں ڈاکٹر صاحب نے اپنے جوہر نہ دکھائے ہوں۔ تحقیق اور تنقید تو ایسے دو شعبے ہیں جن کو متوازی خطوط کی طرح ڈاکٹر صاحب اپنے ہمراہ لے کر چلے ہیں۔ ان کی تنقید، تحقیق کی رہنمائی میں اپنا سفر طے کرتی ہے یہی وجہ ہے کہ ان کی تنقید فن پاروں پر بے جان تبصرہ بن کر نہیں رہ جاتی بلکہ اس میں حقائق کی جاندار دریافت، صداقت کی بے مثل کھوج اور واقعیت کی عظمت موجود ہے۔ ان کا اسلوب سادہ، شگفتہ اور رواں ہے۔ ان کی تنقید نے کوئی ایک میدان نہیں چنا بلکہ نثر، شاعری، قدیم و جدید ادب سب پر حاوی ہے۔ انہوں نے ادبی گروہ بندی سے دور رہ کر اپنے لیے جو راستہ منتخب کیا وہ آنے والے ادوار میں بھی علمی راستوں پر گامزن طالب علموں کی رہنمائی اور سیرابی کرتا رہے گا۔

ڈاکٹر وحید قریشی ایک کہنہ مشق، نکتہ رس اور صائب الرائے نقاد ہیں وہ واقعات کو صرف ایک گوشے سے نہیں دیکھتے بلکہ ان کی نظر ہمہ جہت اور جامع ہے۔ وہ حقائق کی چھان بین کا سراغ بڑی دِقت نظری سے لگاتے ہیں۔ پھر ان کے بارے میں رائے دیتے ہیں یوں ان کی تنقید تحقیقی بصیرت سے ہم آہنگ ہو جاتی ہے۔

ان کی تنقید کے نفسیاتی پہلو پر بہت بحث کی گئی ہے بلکہ ان کو نفسیاتی نقاد بھی کہا گیا ہے مثلاً شبلی کی حیات معاشقہ، یادگار غالب اور آبِ حیات کا تقابلی جائزہ، مقدمہ شعر و شاعری کا مقدمہ اور حالی کی سوانح عمریوں سے متعلق اُردو تنقید کے روایتی انداز سے انحراف یہ تمام موضوعات ایسے ہیں جن میں ڈاکٹر صاحب کی نفسیاتی تنقید اور تحقیق کا شعور دونوں یکجا نظر آتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ عمرانی شعور اور تاریخی بصیرت کے بھی حامل ہیں۔ یوں ایک فن پارہ ان کے ہاں صرف ادبی کارنامہ نہیں کہلاتا بلکہ یہ ایک وسیع ترین کینوس پر اُبھرنے والی تصویر بن جاتا ہے۔ جس کے ہر رنگ کو ڈاکٹر صاحب کی تنقید اور ابھارتی، گہرا کرتی اور نمایاں بناتی ہے۔ یہ ان کی طبیعت کا وصفی جوھر بھی ہے اور ان کے اساتذہ کی محبت و شفقت اور تربیت کا عملی نمونہ بھی انہیں

اپنے اساتذہ میں سے حافظ محمود شیرانی، ڈاکٹر محمد اقبال، مولوی محمد شفیع اور ڈاکٹر سیّد عبداللہ سے طبعی مناسبت رہی۔ اس لیے تحقیق وجستجو ان کا مزاج بن گیا اور یہ جستجو ان کی تنقید کی حقانیت کو بھی اجاگر کرتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے مضامین اور تصنیفات میں نفسیاتی اندازِ تنقید کو اپنایا ہے۔ نفسیات ان کا پسندیدہ مضمون رہا ہے۔ اس طرح جب ان کے نظامِ تنقید میں تاریخ، تحقیق، نفسیات اور تنقید یکجا ہو جاتے ہیں تو وہاں ان کی تنقید بذاتِ خود ایک فن پارہ بن جاتی ہے اور کسی خاص عہد کی ایک Miniature تصویر کی طرح نقشِ ماضی بن کر ثبت ہو جاتی ہے۔

تنقید کے حوالوں سے ان کی کتابوں میں مختلف اشارات ملتے ہیں۔ مثلاً کسی عہد کا جائزہ، کسی شخصیت کے فن کا جائزہ، کسی خاص تحریک یا دبستان کا جائزہ، کسی گروہ یا معاشرے کا جائزہ اور انفرادی کاوشوں کے جائزے۔ تنقید کے حوالے سے ان کی مندرجہ ذیل تخلیقات نمایاں ہیں۔

۱۔ مطالعہ حالی

۲۔ جدیدیت کی تلاش میں

۳۔ افسانوی ادب

۴۔ اُردو ادب کا ارتقاء۔۔۔ ایک جائزہ

۵۔ تنقیدی مطالعے

۶۔ اُردو کا بہترین انشائی ادب

۷۔ شبلی کی حیات معاشقہ (یہ تحقیق بھی ہے)

۸۔ نذر غالب (یہ تحقیق بھی ہے)

۹۔ میر حسن اور ان کا زمانہ (یہ تحقیق وتنقید کی عمدہ مثال ہے)

۱۰۔ باغ وبہار۔۔۔ ایک تجزیہ (یہ بھی تحقیقی تنقید پر مشتمل ہے)

۱۱۔ مطالعہ ادبیات فارسی

۱۲۔ اُردو نثر کے میلانات

اِن تصنیفات کے علاوہ وسیع پیمانے پر لکھے گئے مقالات شامل ہیں۔ جن کے موضوعات میں بڑا تنوع پایا جاتا ہے۔ یہ مقالات تاریخ، تعلیم، پنجابی، اُردو، فارسی کے مختلف موضوعات پر لکھے گئے ہیں اور ان کی تعداد تقریباً ۲۹۸ ہے۔

ڈاکٹر وحید قریشی بحیثیت نقاد مختلف رنگوں اور اسلوب کے حامل ہیں۔ مثال کے طور پر ان کے ڈی۔ لٹ کے تحقیقی مقالے ''میر حسن اور ان کا زمانہ، میں تحقیق کے ساتھ ساتھ نفسیاتی تنقید کا رجحان بھی آ گیا ہے اس طرح ''شبلی کی حیات معاشقہ'' میں بھی ان کا انداز ایک محقق کے ساتھ ساتھ نفسیاتی نقاد کا ہے۔ نفسیاتی نقاد عموماً فرائڈ کی پیروی میں محتسب کا کردار ادا کرتے نظر آتے ہیں لیکن ڈاکٹر صاحب سماجی حوالوں، عمرانی تقاضوں اور نفسیاتی الجھنوں کی روشنی میں کسی ادیب کی تحلیل نفسی کرتے ہیں اور جدید نفسیات پر مبنی تحقیقی انداز نظر اپناتے ہیں اور اپنی منتخب کردہ شخصیت کی پرتیں کھولتے ہیں۔

''شبلی کی حیات معاشقہ'' نفسیاتی تنقید کے لحاظ سے خاصی اہمیت کی حامل ہے۔ اسے ایک مقالے کی صورت میں ۱۹۴۵ء میں حلقۂ ارباب ذوق میں پڑھا گیا۔ بعد میں یہ ماہنامہ ''کتاب'' لاہور میں اپریل ۱۹۴۵ء میں اور ادبی دُنیا میں مئی ۱۹۴۵ء میں شائع ہوا۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے تحلیل نفسی کے بنیادی اصولوں کو اپناتے ہوئے شبلی کی تخلیقی شخصیت کی توضیح کی ہے۔ یہ جدید نفسیات پر مبنی تحقیقی اندازِ نظر کی کامیاب کتاب ہے۔ شبلی کا جذبۂ عشق ان کی شاعری اور دیگر تخلیقات میں کس طرح ارتفاع پذیر ہوا۔ اس جانب ڈاکٹر وحید قریشی نے توجہ دلاتے ہوئے ان واقعات کو بنیاد بنایا ہے جو شبلی کو جاننے اور سمجھنے کے لیے کلیدی حیثیت رکھتے ہیں۔ شبلی کے کلام پر کونسی نفسی کیفیات کس طرح اثر انداز ہوئیں اس کا جائزہ لینے کے لیے ڈاکٹر وحید قریشی نے فرائڈ، میکڈوگل اور ایڈلر کے نظریات سے استفادہ کیا ہے۔ اس طرح نفسیاتی تنقید میں حقیقت پسندی کے رجحان نے جنم لیا اور سوانح نگاری کی بُت پرستی اب بُت شکنی میں تبدیل ہوگئی اور علمی و ادبی مرتبے کو دیگر اندازِ نظر سے دیکھنے کی عادت بھی پیدا ہوئی لیکن اس کا مقصد شخصیت کے مراتب کو کم کرنا نہ تھا۔ بلکہ علامہ شبلی کی شاعرانہ عظمت کا بھی یہ بین ثبوت ہے کہ ان کے جذبات نے شاعری کے راستے تطہیر حاصل کر لی اور یہ ان کی شخصیت

کی اثرانگیزی کو کم کرنے یا مدھم کرنے والا رنگ نہیں بن سکا۔ یہ ایک مثبت راستہ تھا جس کی بدولت انہوں نے اپنی شخصیت کے تضادات اور نرگسیت کو ضم کیا۔ ڈاکٹر وحید قریشی کے خیال میں علامہ شبلی کے عشق کے تین مراکز تھے۔ ایک تو ابوالکلام کی ذات دوسرے عطیہ بیگم اور تیسرے مدراس کی کوئی اہم ہستی۔ شبلی نے اپنی زندگی کی کٹھن گھڑیوں کو جذبہ عشق کی بدولت آسان بنایا اور اپنی ناآسودگی کو ایک خاص مقصد کی شاہراہ پر ڈال دیا۔ یہ تضاد ان کی سوانح عمریوں اور غزلیات کے مابین جھلکتا ہے۔ یہ غزلیں نہیں بلکہ شرابِ دوآتشہ ہے۔ یہ متضاد رجحانات ان کی شخصیت کے الجھاؤ کو سلجھاتے ہیں۔ اس کے علاوہ شبلی انتہاؤں کے مسافر نظر آتے ہیں۔ ہر راستے اور ہر منزل کی انتہا کی چاہت اور اس کو پانے کی تشنہ آرزو انہیں مضطرب رکھتی ہے۔ ان کی نرگسیت کا سیلِ فراواں ریگزاروں اور باغوں میں یکساں روانی سے بہتا ہے۔

ڈاکٹر وحید قریشی نے اس جرأت مندی کی طرح ڈالی جو اس سے قبل اُردو تنقید میں موجود نہ تھی۔ انہیں بیک وقت کئی مضامین، موضوعات اور متفرق رجحانات کا نقاد کہا جاسکتا ہے۔ تنقید کے دوران وہ ایک محتسب نظر آتے ہیں۔ جن کا لہجہ کبھی سچائی کا ذائقہ چکھ کر تلخ ہو جاتا ہے اور کبھی یکسانیت سے اُکتا کر اپنے لیے نئی شاہراہ متعین کر کے اس سفر پر روانہ ہو جاتے ہیں۔ جسے لاحاصلی کی منزل کہیے۔ بہرحال نفسیاتی تنقید ان کے ہاں نیا تجربہ ہے جس کا مقصد سنسنی خیزی نہیں بلکہ بُت شکنی اور روایت کا نیا رُخ متعین کرنا ہے۔ وہ نفسیاتی حقائق اور داخلی شواہد پر اپنی تنقید کی بنیاد رکھتے ہیں۔ وہ شبلی کی زندگی میں رونما ہونے والے مختلف واقعات کا پتہ ان کی جنسی زندگی کی ناآسودگی اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے جذبات و واقعات سے لگاتے ہیں۔

تنقید کے حوالے سے باغ و بہار ایک تجزیہ، اہم کام ہے۔ جس کو مختلف مباحث میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اس میں باغ و بہار کی اہمیت کی طرف بھی توجہ مبذول کرائی گئی ہے۔

ڈاکٹر وحید قریشی نے باغ و بہار کے کرداروں اور ان کی شخصیت کا تجزیہ اس دور کے سماجی احوال کے پس پردہ محرک نفسیاتی وجوہات پر رکھا ہے۔ اس طرح ان کرداروں کی نفسیاتی پیچیدگیاں کھل کر سامنے آتی ہیں اور ان کا رہن سہن دلی کی طرزِ معاشرت کا عکاس بن جاتا ہے۔ اس طرح یہ نفسیاتی و عمرانی تجزیہ داستان کے واقعات میں معنویت پیدا کرتا چلا جاتا ہے۔ پورے معاشرے کی نفسی پیچیدگیاں ایک فرد کی الجھنوں کا سراغ بن

جاتی ہیں۔ داستان کو ڈاکٹر صاحب اجتماعی لاشعور کا نقشہ قرار دیتے ہیں۔ اس میں عوام الناس کے عقائد اور تہذیبی رویئے متشکل ہو جاتے ہیں۔ باغ و بہار کا تجزیہ کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے اس دور کے معاشرے کی داخلی و خارجی دونوں جہتوں کا مطالعہ کرتے ہوئے اجتماعی لاشعور کی بات بھی چھیڑی ہے۔

باغ و بہار کے تجزیے کا مفصل تذکرہ ڈاکٹر وحید قریشی بحیثیت محقق والے باب میں آ چکا ہے۔

ڈاکٹر وحید قریشی نے مثنوی سحر البیان کو مرتب کیا ہے۔ ان کے خیال میں میر حسن نے گزشتہ سے پیوستہ رہ کر کلاسیکی ادب کو بنیاد بنایا اور ایک بنے بنائے پلاٹ کو نئے سرے سے ترتیب دیا اور شعوری کاوش سے واقعات میں ربط پیدا کر دیا۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے نفسیاتی نقاد کے طور پر سحر البیان کے کرداروں کا نفسیاتی تجزیہ کیا ہے اس مثنوی میں مختلف خوابوں کا بیان ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے پہلے خوابوں کی اِنسانی زندگی میں حیثیت پر روشنی ڈالی ہے اور بیداری میں ان خوابوں کا تعلق زندگی کے عملی واقعات سے جوڑا ہے۔ نفسیاتی اصطلاحوں میں میکڈوگل کے نظریات سے استفادہ کیا ہے۔ مثال کے طور پر فرماتے ہیں۔

> میکڈوگل شراب نوشی میں تین درجے بتاتے ہیں فی الحال پہلے درجے کا تذکرہ مقصود ہے۔۔۔ جس کی وجہ سے حواس ایک دوسرے سے نسبتاً علیحدہ ہو کر کام کرتے ہیں۔ سماجی قیود کے اٹھ جانے سے جنسی بے کلی کو کسی بھی سطح پر باآسانی پیدا کیا جا سکتا ہے۔ یہی چال اس شراب نوشی میں چلی گئی ہے۔[۱]

ڈاکٹر وحید قریشی نے میر حسن کی تشبیہات کے نظام پر بھی بحث کرتے ہوئے اس کو داخلی کیفیات کے اظہار کا وسیلہ قرار دیا ہے۔ اس کے علاوہ رنگوں کے استعمال اور ان کی معنویت کو بھی اجاگر کیا گیا ہے۔ رنگوں کی نفسیاتی توجیہہ بھی پیش کی گئی ہے۔ اس طرح کردار نگاری کا تجزیہ بھی نفسیاتی تنقید کی ذیل میں آتا ہے۔ جہاں ڈاکٹر صاحب سحر البیان کے مَرد کرداروں کی جفاکشی، عیش و عشرت، مقاصد کی لگن کا تذکرہ کرتے ہیں۔ وہیں نسوانی کرداروں کی نفسی تحلیل بھی کرتے ہیں۔ ان کی نرگسیت کو اُجاگر کرنے کے لیے ان کے ناموں کا حوالہ دیتے ہیں اور ان کی خود پسندی کو ان واقعات کے ذریعے بیان کرتے ہیں جو ان کو پیش آئے۔

تنقید کے حوالے سے ڈاکٹر صاحب کی اہم تصنیف ''اُردو نثر کے میلانات'' ہے یہ کتاب ۱۹۴۵ء سے

۱۹۸۴ء تک نثری ادب پر لکھے گئے تنقیدی مقالات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کو چھ مختلف حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اس میں پیش لفظ کے علاوہ ۱۱ مضامین ہیں اور اس کے ۱۵۳ صفحات ہیں۔ مقالات کی تفصیل یہ ہے۔

۱۔ اُردو ادب ۱۸۵۷ء سے ۱۹۶۶ء تک

۲۔ اُردو میں مزاح نگاری

۳۔ مولوی نذیر احمد کی یاد میں

۴۔ انتقاد کی مختصر تاریخ

۵۔ جدید اُردو ادب کے سنگ میل۔۔۔تنقید میں

۶۔ اُردو ادب میں نفسیاتی اندازِ فکر

۷۔ نفسیاتی تنقید

۸۔ ہمارے ادب کا نیا دور۔۔۔۱۹۶۵ء کا پاکستانی ادب

۹۔ مولانا محمد حسین آزاد تا مولانا صلاح الدین احمد

۱۰۔ خلفیہ عبدالحکیم۔۔۔ایک نقاد

۱۱۔ ممتاز حسین۔۔۔۔۔ایک نقاد

اس کتاب میں ڈاکٹر وحید قریشی نے نفسیاتی نقطۂ نظر سے مصنفین اور فن پاروں کی قدر و قیمت کے مابین تعلق کا ادراک کیا ہے۔ اس کے علاوہ اُردو ادب میں مزاح نگاری کے ادوار متعین کیے گئے ہیں۔ مزاح نگاری پر سیاسی اور سماجی اثرات سے بحث کی گئی ہے۔ طنز و مزاح کے فرق کی نشاندہی بھی کی گئی ہے۔ انہوں نے اس مضمون میں جن سوالات کے جوابات دیے ان میں مزاح کیا ہے؟ اس کی اقسام اور حدود کیا ہیں اور مزاح کا مقصد کیا ہے؟ انہوں نے مغربی ادب کا بھی گہرا مطالعہ کیا ہے۔ لہٰذا یہاں اس مطالعے کا عکس جھلکتا ہے۔ مزاح کے محرکات میں کانٹ اور سٹیفن لی کاک کے تصورات پیش کیے گئے ہیں۔ مزاح کی تعبیر کے لیے

ڈاکٹر صاحب نے فرائڈ کے نظریات سے بھی استفادہ کیا ہے۔ مثلاً لکھتے ہیں: ''کمی یا تخفیف اور تقابل کے تصور نے فرائڈ کو Humour اور Comic کی وضاحت کا راستہ سمجھایا اور تقابل نے شوپن ہار کو حقیقت اور تخیل کے مابین ناہمواری کی نشاندہی پر مجبور کر دیا۔''۲

ڈاکٹر صاحب کا مضمون فارسی ادب بھی ہے۔ جس کے حوالے سے انہوں نے اُردو ادب خاص طور پر اُردو مزاح کا جائزہ لیا ہے۔ وہ محقق ہونے کے ساتھ ساتھ جدید علمی نظریات اور نفسیاتی آگہی کی روشنی میں اپنے موضوع کا جائزہ لیتے نظر آتے ہیں۔ مثال کے طور پر انتقاد کی مختصر تاریخ میں انہوں نے نفسیاتی تنقید کی اہمیت کو بیان کیا ہے اور اس ضمن میں سگمنڈ فرائڈ کے نظریات کا ہر دور پر اثر واضح کیا ہے۔ جوان کے نفسیاتی شعور اور گہرے مطالعے کا رہینِ منت ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے ڈاکٹر سلیم اختر کی کتاب ''نگاہ اور نقطے'' کا جائزہ بھی لیا ہے اور اس طریقہ کار کی وضاحت کی ہے جو ڈاکٹر سلیم اختر نے نفسیاتی تنقید کے لیے وضع کیا ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی بیسویں صدی میں نفسیاتی تحقیق کے باقاعدہ آغاز اور نفسیاتی طریق کار سے کرداروں کے تجزیے کا تذکرہ کرتے ہیں حالانکہ اس سے قبل نفسیات الگ ایک سائنسی مضمون کے طور پر پڑھا اور پڑھایا جاتا رہا تھا۔ ڈاکٹر صاحب اس ضمن میں یوں رقم طراز ہیں:

> نفسیاتی حقائق کا شعور قدیم ادب میں تھا لیکن فنکاروں میں نفسیاتی علم نہ تھا وہ واقعات کی نفسیاتی توجیہات اور کرداروں کے تجزیے سے واقف نہ تھے۔ علاوہ ازیں یہاں کے ادبا ابھی لاشعور کی کارکردگی سے آگاہ نہ تھے۔ اُردو ادب میں تحلیل نفسی کا چلن ۱۹۳۰ء سے ہوا۔ جدید ادب میں نفسیاتی رجحانات کے لیے دوسری جنگِ عظیم کا زمانہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ میراجی، ریاض احمد، وغیرہ نے تنقید کے علاوہ شاعری میں نفسیات کے مطالعے سے کام لیا۔ سعادت حسن منٹو، ممتاز مفتی، شیر محمد اختر، امجد الطاف، الطاف فاطمہ، عزیز احمد، قرۃ العین حیدر، ممتاز شیریں نے افسانوں میں نفسیات کے علم سے مدد لی ہے۔۳

ڈاکٹر وحید قریشی نے ن۔ م راشد کی کئی نظموں کا تجزیہ آزاد تلازمے کی نفسیاتی تحلیل کے لیے ضرورت کی روشنی میں واضح کیا ہے۔ میراجی کی نظموں کے متعلق بھی نفسیاتی تنقید کے اصولوں کی روشنی میں واضح کرتے ہوئے فرائڈ کے مریضوں کی کیس ہسٹری کو بیان کیا ہے۔

ممتاز مفتی اور اشفاق احمد کے افسانوں میں بھی یہی اندازِ نظر روا رکھا گیا ہے۔ ۱۹۳۰ء کے بعد کے افسانوں کا موضوع نفسیاتی اور داخلی زندگی کا بیان تھا۔ جس کے پردے میں فرائڈ اور یونگ کے نظریات سامنے آئے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر وحید قریشی میرا جی کو پہلا نفسیاتی نقاد قرار دیتے ہیں۔ جنھوں نے فرائڈ کے نظریات کی روشنی میں نفسیاتی دبستان کی بنیاد ڈالی۔ حسن عسکری نے بھی اپنی تنقید میں نفسیاتی نقطۂ نظر کو اپنایا۔ نفسیات نے جدید فکری زندگی پر گوناگوں اثرات مرتب کیے ہیں۔ نفسیات دانوں کے نظریات کی روشنی میں انسانی ذہن کے افعال و اعمال کا درست جائزہ لینے میں بڑی مدد ملتی ہے اس طرح حیات و کائنات کو نئے سرے سے جانچنے اور پرکھنے کا عمل آسان تر ہو جاتا ہے۔

حالی کی ''مقدمہ شعر و شاعری'' جو اُردو تنقید میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے، ڈاکٹر وحید قریشی نے اسے نئے سرے سے مرتب کیا۔ اس تاریخ ساز کتاب پر کوئی تحقیق اور تنقید موجود نہ تھی۔ اس میں حالی کی شخصیت اور تنقیدی حیثیت پر تفصیلی نظر ڈالی گئی ہے۔

اِن حوالوں کا تحقیقی جائزہ لیا گیا ہے۔ جو حالی نے اپنی کتاب میں سیاق و سباق کے بغیر درج کیے تھے۔ ان خیالات پر متوازن انداز سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ جو حالی نے شاعری کے متعلق درج کیے۔ حالی کے خیالات و نظریات کے جائزے کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر وحید قریشی نے اپنے خیالات کو بھی ایک باشعور نقاد کے انداز میں پیش کیا ہے اور ان کے معتدل نتائج اخذ کیے ہیں۔ اُنھوں نے حالی کی شخصیت پرستی کو ادب کی اعلیٰ اقدار کے منافی قرار دیا ہے کیونکہ اس سے نقطۂ نظر میں غیر جانبداری کا عنصر مفقود ہو جاتا ہے اور تنقیدی نظام متزلزل ہو جاتا ہے۔

شبلی کی طرح حالی کے تجزیے میں بھی ڈاکٹر وحید قریشی نے حالی کے خیالات کے تضادات کو ان کی نفسیاتی الجھنوں سے تعبیر کیا ہے۔ انہوں نے حالی کی ''اخلاق زدگی'' کو نفسیاتی الجھن قرار دیا ہے۔ مثلاً فصاحت کے معیاروں کا تذکرہ اور شاعری کے سوسائٹی کے تابع ہونے کا ذکر وغیرہ۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے حالؔی کے مقدمے کو نئی شرح و بسط کے ساتھ لکھا اور محفوظ کیا ہے۔

ڈاکٹر وحید قریشی کی غالب شناسی کے زمرے میں ''نذر غالب'' کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ کتاب ۲۹۰ صفحات اور آٹھ مقالات پر مشتمل ہے۔ اس میں ایک تحقیقی مضمون اور دیگر تنقیدی مضامین شامل ہیں۔ ان کے

تنقیدی مضامین بھی ان کے تخلیقی مضامین بن جاتے ہیں۔ ان میں جودت طبع اور تنقیدی اُپج کا اظہار بڑے بھرپور طریقے سے ہوا ہے۔ شبلی اور حالی کے نفسی خصائص کا تجزیہ جس طرح انہوں نے انوکھے نفسیاتی انداز سے کیا ہے بالکل اسی طرح غالب کی الجھنوں کو سلجھاتے نظر آتے ہیں غالب نکتہ سنج، گھمبیر اور تہہ در تہہ شخصیت کے حامل ہیں۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے غالب کی لغات، رنگوں، تشبیہات، سرخ رنگ اور غالب کی خود رحمی (Self Pity) اور دیگر تلازمات میں غالب کو بڑے منفرد انداز میں اپنے تحقیقی و تنقیدی عدسے سے دیکھا اور پرکھا ہے۔ ہمارے سامنے غالب کا ایک ہی روپ اُجاگر ہو جاتا ہے جو سُرخ رنگ کو سیاہ میں تبدیل ہوتے دیکھتا ہے اور سُرخی کا انجام روشنی نہیں بلکہ تاریکی کو بنا کر پیش کرتا ہے۔

ڈاکٹر وحید قریشی نے غالب کے تحت الشعور میں متحرک خیالات کی نئی جہتوں کی طرف اشارہ کیا ہے اور یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ماحول اور عصری صورتحال سے غالب خوفزدہ ہے۔ وہ خیالات اور ذہنی الجھنیں جو در پردہ متحرک ہو کر انسان کے اندر خوف اور جمود پیدا کر دیتی ہیں اور نفسیاتی و جذباتی عوامل کے ساتھ مل کر ماحول سے فرار پر اُکساتی ہیں۔

ایسے میں وہ طبعی بے اعتدلیوں سے سبک سر بھی ہوتا ہے مگر غیر یقینی صورتحال اسے سنبھلنے نہیں دیتی۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے غالب کی تحلیل نفسی کے دوران ان کے خاندان، عقائد اور ان فارسی شعراء جن سے غالب متاثر ہیں، کی روشنی میں جائزہ لیا ہے۔ غالب کی شخصیت کے پیچیدہ اور تہہ دار مضمون میں مفہوم پیدا کرنے کے لیے ڈاکٹر وحید قریشی نے عہدِ حاضر کی علامتوں اور استعاروں کو استعمال کیا ہے۔ خاص طور پر انہوں نے یونگ کا حوالہ دیا ہے جو اجتماعی لاشعور کا مطالعہ ان رمزیات و کنایات کے ذریعے کرتا ہے۔ جو شعراء اپنے کلام میں استعمال کرتے ہیں اور یہ جدید نفسیاتی تنقید کا ایک اہم شعبہ ہے۔ ''میر حسن اور ان کا زمانہ'' میں ڈاکٹر وحید قریشی نے میر حسن کی تخلیقات کو ان کے عہد کے تقاضوں کی روشنی میں دیکھا ہے۔

''میر حسن اور ان کا زمانہ'' کا پہلا باب تاریخی ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی کا نظام تحقیق اس اصول پر استوار ہے کہ وہ داخلی اور خارجی شہادتوں سے نتائج اخذ کرتے ہیں اور اس طرح نفسیاتی تنقید کے لیے مواد فراہم کر لیتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر صاحب کی دلچسپی کا خاص مضمون تاریخ ہے اور یہ حقیقت ہے کہ تاریخی شعور کے بغیر ایک محقق اپنی تحقیق کا حق ادا نہیں کر سکتا اور نہ ہی تحقیق کے تقاضوں

سے عہدہ برآ ہوسکتا ہے۔

وہ اِنسانی طبیعت میں موروثی اثرات کو بھی نظرانداز نہیں کرتے۔ سودا کی شخصیت کے پرت کھولنے میں بھی انہوں نے اسی اندازِ تنقید کو روا رکھا ہے۔ سودا کی عظمت، ہجوگوئی، مزاح، ان سب کے پس پردہ کون سے حقائق کارفرما ہیں۔ وہ میر پر کس کس طرح تنقید کرتے ہیں۔ تضحیک روزگار کیوں ان کا محبوب مشغلہ بن گئی ان کا مطالعہ وسیع اور احتیاط پسندی ان کا شیوہ تھی۔ لیکن ان کی مجروح انفرادیت نے انہیں معاصرین پر کیچڑ اُچھالنے پر آمادہ کر دیا۔ ان کی Ego دو حصوں میں تقسیم ہوگئی۔ انہیں کوئی اپنا خیرخواہ دکھائی نہیں دیتا۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے سودا کی ہجوگوئی کو بیک وقت ان کی عظمت اور ان کی مجروح انا کا اظہار کہہ کر ایک اور ادبی مکاشفے کی بنیاد رکھ دی ہے لیکن نفسیاتی نقاد کے لیے یہ سوال محلِ غور ہے۔

اس کتاب کا اگلا مضمون ''سودا کی غزل گوئی'' ہے۔ سودا نے دلی کے دربار کی بربادی اور لکھنؤ اور فیض آباد کی تباہی بھی دیکھی۔ اس دور میں غزل گوئی میں میر کا نام مستند سمجھا جاچکا تھا۔ لیکن سودا کا میدان بظاہر قصیدہ گوئی ہی رہا۔

میرحسن کے عہد میں کن محرکات نے ان کے ادبی شعور کی تشکیل میں حصہ لیا۔ ماحول سے اکتاہٹ کس طرح ان کی خواہشات کی عدمِ تکمیل کا موجب بن جاتی ہے اور نارسائی کا یہ غم ان کی مثنوی میں رنگوں اور روشنی کی شکل میں ظاہر ہوا ہے۔ مال و دولت کے تذکرے ان کی اپنی بے سروسامانی کے نتیجے میں پیدا ہونے والی محرومی کی شکل میں ظاہر ہوئے ہیں اور یوں وہ خواب بیداری میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ میرحسن کی غزل گوئی بھی ان کی شخصیت کے داخلی اضطراب کو متشکل کرتی ہے اور یہ کشمکش ان کے اشعار میں روح کی طرح پیوست اور جاری و ساری ہے۔ میرحسن کے ہاں جذبات و احساسات اور خیالات کی ایک سطح نہیں پائی جاتی بلکہ وہ ایک گریزاں لہر کی طرح دور ہی دور سفر کرتے چلتے جاتے ہیں۔ ان کا ہر جذبہ اپنے ارتفاع اور اظہار کے لیے پیکر تراشتا ہے۔

ان پیکروں میں حرکت و حرارت اور رنگینی ہے۔ موسیقی بھی ان کے احساس تنہائی کو رفع کرنے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے ایڈلر کے نظریۂ احساس کمتری کے حوالے سے میرحسن کی شخصیت کا جائزہ لیا ہے۔ میرحسن کی شخصیت کے تضادات کو ان کے فن کی روشنی میں حل کیا ہے۔ ان کے

اس تنقیدی اندازِ نظر نے ان کی تحقیق میں نئی رفعت پیدا کر دی ہے اور اس کی معنی خیزی میں اضافہ کیا ہے۔

ڈاکٹر وحید قریشی کی تنقید کی ایک نمائندہ ان کی تصنیف ''تنقیدی مطالعے'' بھی ہے۔ اس کے بعض تنقیدی مضامین میں نفسیاتی تنقید کا رجحان پایا جاتا ہے۔ مثلاً ''عرش کی افسانہ نگاری''، ''سودا کی مجروح شخصیت''۔ ''اس نظم میں، میرا جی، تجزیہ'' اور کچھ نفسیاتی تحریک کے متعلق وغیرہ۔

''عرش کی افسانہ نگاری'' میں ڈاکٹر وحید قریشی نے عرش صدیقی کے دو افسانوں ''گنتی'' اور فرشتہ کو خاص طرز پر نفسیاتی تنقید کے نقطۂ نظر سے پرکھا ہے۔ اس ضمن میں ''تنقیدی مطالعے'' ایسی تصنیف ہے جس میں ڈاکٹر صاحب کی تنقیدی بصیرت بھرپور طریقے سے سامنے آئی ہے۔ یہ کتاب کارواں پریس لاہور نے اکتوبر ۱۹۶۷ء میں شائع کی۔ ترتیب والی فہرست میں ڈاکٹر وحید قریشی نے اس کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ (۱) شاعری۔ (۲) تنقید۔

پہلے حصے میں چھ مضامین ہیں۔ جو سودا، میر حسن، آتش، اکبر اور اقبال کے بارے میں ہیں۔ دوسرے حصے میں تنقید ہے۔ جس میں فیضی کا نظریہ شعر، غالب کا نظریۂ شعر، اُردو تنقید سن ستاون سے پہلے، تنقید اور روایت، حالی کی تنقید، انشائی ادب، خسرو کا نظریۂ اسلوب، قدیم نظریۂ اسلوب شامل ہیں۔

پہلا مضمون ''سوؔدا کی مجروح شخصیت'' ہے۔ سوؔدا کی شاعری پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کامیاب ہجو گو شاعر ہیں۔ ان کے ہاں بانکپن اور لفظی صنعت گری موجود ہے۔ ان کے اشعار میں مصرعوں کی نوک پلک متاثر کن ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے سودا کے بارے میں جو نتائج اخذ کیے ہیں۔ ان کا تجزیہ ان کے اصولِ انتقاد کو ظاہر کرتا ہے جس کے مطابق وہ پہلے نتائج پیش کرتے ہیں۔ بعد ازاں اس کو ہر رُخ سے پرکھتے ہیں۔ انہوں نے سودا کی قصیدہ گوئی سے طبعی مناسبت کا ذکر کرتے ہوئے مندرجہ ذیل اشعار پیش کیے ہیں۔

اُٹھ گیا بہمن و دے کا چمنستان سے عمل
تیغ اُردی نے کیا ملک خزاں مستاصل
لڑکھڑاتی ہوئی پھرتی ہے خیاباں میں نسیم
پاؤں رکھتی ہے صبا صحن میں گلشن کے سنبھل

ڈاکٹر وحید قریشی کی تنقید ایک سپاٹ اور ہموار راستہ نہیں بلکہ رنگارنگ مناظر سے آراستہ میدان، وادیاں، گلبن، پہاڑ اور سمندر ہیں۔ یہاں اپنی پسندیدہ شخصیت کی تعریف بھی ہے تو تیکھی تنقید کے انداز میں۔ اس کی علمیت کا اعتراف ہے تو اس کے زورِ طبع کی تعریف بھی لیکن مبالغہ آرائی کے ساتھ نہیں بلکہ بڑے متوازن انداز میں۔ وہ تنقید کے ہر دبستان کے مبصر ہیں۔ نہ صرف نفسیاتی تنقید بلکہ عمرانی، سماجی، تاریخی تنقید کے حوالے بھی ان کے ہاں مستحکم ہیں۔ وہ جہاں فرائڈ اور میکڈوگل کے نظریات سے روشنی پاتے ہیں وہاں ہکسلے کے خیالات سے بھی استفادہ کرتے ہیں۔ انہیں معلوم ہے کہ میر کے غم کے نفسی خصائص اور عمرانی وجوہات کیا ہیں۔ سودؔا کے ہاں خوش فکری کا کیا مقام ہے اور اس مقام کو حاصل کرنے میں ان کے بچپن کی بے غمی اور فارغ البالی کا کتنا دخل ہے۔ وہ کسی بے بنیاد مفروضے پر اپنی تنقید کی بنیاد نہیں رکھتے۔ ان کا نظام تنقید ٹھوس اصولوں کی مشاورت اور رہنمائی میں آگے بڑھتا ہے۔

قصیدہ گوئی ہی سودؔا کی شاعری کا محور سمجھی گئی تھی لیکن غزل کا میدان میرؔ کا حصہ تھا۔ سودؔا غزل گو تھے۔ لیکن روایت پرستی ان کے مزاج کا حصہ نہ تھی۔ ڈاکٹر وحید قریشی سودا کی غزل گوئی کا جائزہ ان کی خاص افتادِ طبع کی روشنی میں لیتے ہیں۔ انہوں نے نقادوں کے اس فیصلے اور اندازِ تنقید کے خلاف احتجاج حقائق اور دلائل کی روشنی میں کیا ہے جس میں نقادانِ ادب یہ فیصلہ دے دیتے ہیں کہ میرؔ کے سامنے سودا کا چراغ نہ جل سکا۔ سودؔا کی غزل گوئی اور ان کے تصورِ فن میں ان کے دل کی دھڑکن صاف سنائی دیتی ہے۔

؎ جب نظر اس کی آن پڑتی ہے
زندگی تب دھیان پڑتی ہے

؎ گلہ لکھوں میں اگر تیری بیوفائی کا
لہو میں غرق ہو سفینہ آشنائی کا

؎ تجھ قید سے دل ہو کر آزاد بہت رویا
لذت کو اسیری کی کر یاد بہت رویا

ے سوداؔ جو ترا حال ہے ایسا تو نہیں وہ
کیا جانیے تو نے اسے کس آن میں دیکھا

قصائد میں سوداؔ کی خود پسندی صاف جھلکتی ہے جب وہ آغاز میں صرف اپنی ذات کو محور بنا کر تعریفی اشعار لکھتے ہیں۔ ان کے بعد ممدوح کی باری آتی ہے۔ نرگسیت کا شکار ہونے کی وجہ سے وہ اپنے دل میں سکون کی رمق بھی نہیں پاتے بلکہ اپنے آپ کو تنہا اور مظلوم سمجھتے ہیں۔

ے جی مرا مجھ سے یہ کہتا ہے کہ ٹل جاؤں گا
ہاتھ سے دل کے ترے اب میں نکل جاؤں گا

ڈاکٹر وحید قریشی نے سودا کی حرماں نصیبی کا سبب بھی ان کے ذاتی حالات اور مٹتی ہوئی تہذیب کے غم میں تلاش کیا ہے۔ ان کی بے اولادی اور زمانے کی بربادی ایک استعارہ بن کر ان کے اشعار میں نمودار ہوتی ہے۔

ے کدھر کو چھوڑ گئے مجھ کو ہمرہاں تنہا
پھروں ہوں دشت میں جوں گردِ کارواں تنہا

ڈاکٹر وحید قریشی خود بھی روایت پسندی کے ساتھ ساتھ جدت طرازی کے قائل ہیں اور سودا کی اس روش کو بھی بنظرِ استحسان دیکھتے ہیں۔

سوداؔ نے زمانے کی مٹتی ہوئی تہذیب کے درد کا احساس بھی کیا ہے۔ وہ خود کو اسی بربادی کا استعارہ سمجھتے رہے۔

ے وہ سمندر ہے کہ جس کا نہ کہیں پاٹ لگے
کشتی عمر مری دیکھیے کس گھاٹ لگے

ڈاکٹر وحید قریشی نے نفسیاتی نقطۂ نظر سے جب سودا کے کلام میں صیغہ واحد متکلم کا جائزہ لیا تو لکھا:

''میں کے لفظ میں سوؔدا کی ایک اور مشکل کا حل ہے۔ اس کی شخصیت کا یہ پہلو غزل میں اپنی ذات کو شمع بنا کر تسکین پاتا ہے۔ محبوب کی ذات پس منظر میں چلی جاتی ہے۔ کبھی کبھی سوؔدا آپ بھی محبوب ہو گئے ہیں۔ ایڈلر کے خیال میں جو لوگ اپنی ذات کو زیادہ اہم سمجھتے ہیں، ہمیشہ ایسے شخص کو شریکِ حیات بنانا پسند کرتے ہیں۔ جو انہی کی ذات کا پرتو ہو تا کہ تمام عمر شکست و فتح کا کھیل جاری رہ سکے۔ نرگسیت کے ان مریضوں کے بارے میں فرائڈ کا قول ہے کہ مردانہ صفات والے محبوب ان کا مطمعٔ نظر ہو جاتے ہیں۔ اس کا محبوب زلیخا نہیں یوسف ہے۔''[۴]

میں عاشق اپنا اور معشوق اپنا آپ ہوں پیارے
گہے پروانہ اس مجلس میں گاہے شمع محفل ہوں

ڈاکٹر وحید قریشی نے تذکرہ نگاروں کے اس خیال سے اتفاق نہیں کیا کہ یہ سوؔدا کا اندازِ بیان ہے بلکہ ان کی شخصیت کو مختلف سطحوں پر اپنی تسکین کا سامان تلاش کرنا پڑا چنانچہ ان کے ہاں غم کی شدت اور لہجے کا گداز ہے یہ کیفیت ان کے ہاں میرؔ کا انداز بھی پیدا کرتی ہے۔

شمع رخوں سے روشن ہو گھر ایسے اپنے نصیب کہاں
صبح ازل سے قسمت نے خاموش چراغِ شام کیا

ان کی غزلیات میں تنوع ہے اور بلند پروازی بھی۔ ان کے ہاں محاکات اور امیجری کے ساتھ ساتھ صوت و آہنگ بھی موجود ہے۔

ہوں میں وہ وحشی رم خوردہ کہ تا دشتِ عدم
پات کھڑکے ہے تو مانندِ صدا جاتا ہوں

انہی عناصر پر سوؔدا کی غزل کا دارومدار ہے اور ان پر ان کے کلام کا آب و رنگ منحصر ہے۔

ڈاکٹر وحید قریشی کی تنقید کی عمارت کا ہر زاویئے سے جائزہ لیا جائے تو اس میں عمرانی، سیاسی اور تاریخی

عناصر نمایاں ہیں۔ وہ زیرِ بحث شاعر یا ادیب کے ذہنی محرکات کی تلاش سے اپنی تنقید کا سفر شروع کرتے ہیں۔ وہ ظاہری الفاظ، عبارت اور پیش پا افتادہ معانی کے پردے میں حقیقی معنی اور اس کا پس منظر تلاش کرتے ہیں۔ اس طرح ان کے ہاں تحقیق کی طرح تنقید بھی ایماندارانہ عمل بن جاتا ہے اس طرح وہ ایک نفسیات داں بھی بن جاتے ہیں اور انسانی لاشعور میں چھپے شخصی اور اجتماعی محرکات تک رسائی حاصل کر لیتے ہیں جو ان کی تنقید کی حقیقی بنیاد بن جاتے ہیں۔ ان کی نگاہِ باریک بین فن پارے یا ادیب کی جمالیاتی قدروں کی داد بھی دیتی ہے لیکن تخلیق کار کی شخصیت کے پوشیدہ گوشوں اور داخلی محرکات کو نظر انداز بھی نہیں کرتی ان کے یہی تحقیقی فن پارے پڑھنے والوں میں بحث ونظر کی طغیانی پیدا کرتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کسی نفسیات دان کے مقبول اقوال کو حوالہ بنائے بغیر فن پارے کی تفہیم کے وہ ذرائع استعمال کرتے ہیں۔ جو ان کی ذاتی کاوش کا ثمرہ اور انفرادی رسائی کو ظاہر کرتے ہیں۔ انہوں نے ایڈلر، یونگ، فرائڈ اور دیگر کئی نفسیات دانوں کے مطالعے کے بعد انہیں فن پاروں کی تفہیم کا ایک ذریعہ بنایا ہے۔ لیکن احتساب کے لیے نہیں بلکہ تجزیے کے لیے اور اس تجزیے کی منزل بھی ڈاکٹر صاحب کا اپنا فیصلہ اور ادبی نکتہ نظر ہوتا ہے۔ اُردو ادب کے علاوہ تاریخ، فارسی، مصوری، نفسیات اور دیگر مضامین کے اسرار و رموز اور دیگر اسالیب نے ان کی تنقید میں یکسانیت کا خاتمہ کر دیا ہے۔ مطالعے کی وسعت، فکرانگیز معلومات کی بدولت ان کی تنقید میں فکرانگیزی، نئے افق کی دریافت اور قوتِ تجزیہ موجود ہے۔

’’تنقیدی مطالعے‘‘ کا اگلا مضمون ’’میر حسن کی غزل گوئی‘‘ ہے۔ میر حسن کی شخصیت ڈاکٹر وحید قریشی کی خصوصی دلچسپی کا مرکز رہی ہے۔ انہوں نے ڈی لٹ میں بھی ’’میر حسن اور ان کا زمانہ‘‘ پر تحقیق کی اور ان کی شخصیت کے خفیہ پہلوؤں کو اجاگر کیا۔ میر حسن کے زمانے میں مغلیہ تمدن کی پرچھائیاں ماند پڑ رہی تھیں۔ یہ سیاسی زوال لیکن ادبی عروج کا دور تھا۔ یہ میر و مرزا کا دور تھا۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے تاریخی پہلوؤں کو سامنے لا کر میر حسن کے ادبی کردار کا تجزیہ کیا ہے اور اس پر دلی اور لکھنؤ کے تمدن کے اثرات کو بھی واضح کیا ہے۔ اس وسیع ترکینوس میں میر حسن کے کلام کا تجزیہ اور بھی وقیع ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی کے پیشِ نظر وہ استعارے ہیں جنہیں میر حسن نے اپنے کلام میں برتا ہے اور ان گریز پا استعاروں کی مدد سے ہی میر حسن کے ذہنی افق کا تجزیہ ممکن ہے۔

یہ تازہ گوئی کا عہد تھا۔ ڈاکٹر وحید قریشی میر حسن کے کلام کو ادوار میں تقسیم کر کے پہلے دور کو ۱۱۸۳ ہجری

کے لگ بھگ تصور کرتے ہیں۔ اس دور میں مثنوی درشادیٔ آصف الدولہ، رموز العارفین (۱۱۸۸) اور دیوان غزلیات اور متفرقات (اولین اشاعت ۱۱۹۳) شامل ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب میر حسنؔ بطور ایک غزل گو کے اپنی انفرادیت کو پوری طرح اجاگر کرنے میں کامیاب نہ ہوئے تھے۔ دوسرا دور ۱۱۸۹ ہجری سے ۱۱۹۹ ہجری تک ہے جس میں مثنوی قصرِ جواھر (۱۱۹۹ ہجری) قصیدہ درتہنیت عید ۱۱۹۹ ہجری، گلزارِ ارم ۱۱۹۲ ہجری اور سحر البیان ہے۔ میر حسنؔ کی غزل گوئی دراصل ان کے ابتدائی کلام کا جائزہ ہے۔ لیکن اس میں سے بھی دو تہائی حصہ ہی ایسا ہے جو ان کے مقام کو متعین کرنے میں ہماری مدد کرتا ہے۔ درحقیقت ''سحر البیان'' میں ہی ان کا رنگ خاص ملتا ہے۔ لیکن غزل میں کوئی خاص نقطۂ نظر ان کے ہاں موجود نہیں۔ البتہ دیگر معاصر شعراء کے اثرات ان کے ہاں ملتے ہیں۔ میر حسن نے جن شعراء کی پیروی کی ان میں میرؔ، سوزؔ، حسرتؔ، سوداؔ، مصحفیؔ، ضیا ملا نسبتی شامل ہیں۔ ان شعراء کے فلسفیانہ خیالات اور زمینیں میر حسنؔ کے ہاں نظر آتی ہیں۔

نادری حملے سے ابدالی حملوں تک شعراء کو نقل مکانی کے صدمے سے گزرنا پڑا۔ مغلوں کے زوال نے اجتماعی پستی اور زوال کو فروغ دیا۔ اس کے اثرات اس دور کی غزل پر واضح طور پر محسوس کیے جاسکتے ہیں۔ دلی کی فضا سے تو میر حسن متاثر تھے ہی لیکن زوال اور بربادی ان کی غزل کا استعارہ بھی بنے ہیں۔

میر حسنؔ کے ہاں مثالیہ انداز اور تضاد (Paradox) موجود ہے۔ وہ میرؔ و سوداؔ کے انداز سے متاثر ہیں۔ الفاظ کی تراش خراش، شوکتِ الفاظ، بھاری لہجہ یہ سب میر حسنؔ کے ہاں موجود ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ میر حسن کی ذات اس شعری عمل میں کارفرما ہے۔ وہ کبھی صیغۂ واحد متکلم استعمال کرتے ہیں اور کبھی اپنے معاصر شعراء کی اقدار کی اصل نمائندگی کرتے ہیں۔ وہ نئی نسل اور معاصر ادب سے متاثر بھی ہیں۔ وہ گفتگو اور محاکاتی انداز سے اس تاثر کو اور بھی واضح کرنے میں کامیاب ہیں۔ میر حسن کے اسلوب میں رنگارنگی اور تاب و توانائی ہے۔

کب میں گلشن میں باغ باغ رہا
میں تو جوں لالہ واں بھی داغ رہا

سیرِ گلشن کریں ہم اس بن کیا
اب نہ وہ دل نہ وہ دماغ رہا

جب تلک میں جیا حسنؔ تب تک
غم مرے دل پہ بے قیاس رہا

دل غم سے ترے لگا گئے ہم
کس آگ سے گھر جلا گئے ہم

مانندِ حباب اس جہاں میں
کیا آئے تھے اور کیا گئے ہم

یہ تو ظاہری اثرات ہیں لیکن میر حسنؔ کے داخلی اثرات کی تعمیر میں میر دردؔ کے صوفیانہ افکار اور دھیمے لہجے کا عمل دخل بہت زیادہ ہے۔ میر حسنؔ کی فطرت میں تسلسل اور رابطہ ہے ان کی غزل مسلسل اور مربوط ہوتی ہے۔ ان کے جذبات میں توانائی اور احساس کی شدت موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ منظر کشی اور سراپا نگاری ان کے ہاں بدرجۂ اتم موجود ہے۔ ان کے ہاں اپنے احساسات کو پیش کرنے کا سلیقہ موجود ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے میر حسنؔ کے کلام میں صوتی تجربات اور آہنگ کو ان کے فنِ موسیقی سے دلچسپی کا نتیجہ قرار دیا ہے مثلاً حروفِ علت کی ترتیب میں انہوں نے بڑے کمال دکھائے ہیں۔ اِس طرح لسانی جدت اور اصوات کی ترتیب لائق صد تحسین ہے۔

اگلا مضمون ''آتش کی غزل گوئی'' ہے۔

آتش کی غزل جدت کا نقطۂ آغاز کہی جاسکتی ہے۔ آتش کے ماضی کا ناتا دلّی سے مربوط تھا لیکن مستقبل اودھ سے جڑ گیا۔ ادبی لحاظ سے فیض آباد کی شعری تحریک کو دلی کے دبستان شعری سے جوڑا جاسکتا ہے۔ آتش نے صنعت گری اور قلندرانہ وضع دونوں کو ہم آہنگ کیا۔ ان کے ہاں تلون مزاجی موجود ہے۔ مزاج کے اس تلون نے ان کے اشعار میں خود فراموشی، قلندری، ایک گونہ بے خودی اور جذبات کی پرستش کے متضاد جذبات کو پیش کیا۔ مفلسی میں بھی ایک آن بان کا احساس موجود ہے۔

لیکن ان کے ہاں ماتمی فضا اور آن بان کا فقدان ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے آتش کے تلازمات،

علامات اور روایات کے ذریعے ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں اور رجحانات کا جائزہ لیا ہے اور نفسیاتی محرکات کا سراغ بھی لگاتے ہیں۔ جن کی وجہ سے آتش جن اقدارِ حیات پر یقین رکھتے ہیں انہی کو ناپائیدار بھی سمجھتے ہیں۔ گویا تشکیک کا رویہ ان کی زندگی اور اقدار کو متزلزل کیے رکھتا ہے۔ رنج و ملال ان کے فن کو دوام بخشتا ہے۔ اخلاقیات کا درس ہو یا موت کا تذکرہ ان کے ہاں روایتی رسمی بیان نہیں بلکہ یہ دیر پا اثرات کا حامل کلام ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی آتش کے کلام میں جو گہرائی تلاش کرتے وہ انہیں آتش کا فکری رشتہ دبستان میر سے جوڑنے پر مائل کر دیتا ہے۔ آتش کے کلام میں انہیں میر کی سی گہرائی، ضبط، سنجیدگی اور انسانی نفسیات سے واقفیت نظر آتی ہے۔

ے
یہ آرزو تھی تجھے گل کے روبرو کرتے
ہم اور بلبل بیتاب گفتگو کرتے
پیام بر نہ میسر ہوا تو خوب ہوا
زبانِ غیر سے کیا شرحِ آرزو کرتے

ے
موت مانگوں تو رہے آرزوئے خواب مجھے
ڈوبنے جاؤں تو دریا ملے پایاب مجھے
فرقتِ یار میں کرتی ہے قیامت برپا
روزِ محشر سے نہیں کم شبِ مہتاب مجھے

اصل میں آتش کا حزنیہ اور عشقیہ کلام ان کا سرمایۂ افتخار ہے۔ آتش کے کلام کی فضا دراصل ان کے عہد اور گزشتہ شعری تحریکات سے قریب ہے۔ روایت سے تال میل کے باوجود آتش کے کلام کو تازہ گو شعراء کے ساتھ ملا کر دیکھا جائے تو یہی تازگی اور ندرت ان کے کلام میں بھی ملتی ہے۔

اس سے اگلا مضمون ''اکبر اور نئی علامات'' ہے۔ اس میں ڈاکٹر وحید قریشی نے سرسید اور حالی کے ساتھ اکبر کی لفظی و معنوی جدت کا ذکر کیا ہے اور ان کی طنز و ظرافت کے نت نئے پہلوؤں اور

رنگ بدلتے شعری شعور کا ذکر کیا ہے۔ اکبر کے بارے میں اس خیال کو ڈاکٹر صاحب نے غلط ثابت کیا کہ وہ روایات قدیم کی گرتی ہوئی عمارت کے فقط ایک نوحہ گر ہیں اور ایک تہذیبی سرمائے اور محدود ذہنیت کے ترجمان ہیں۔

ڈاکٹر وحید قریشی اپنی جدت پسند نگاہ کی بدولت یہ ثابت کرتے ہیں کہ اکبر نے قیود کو پہلی بار توڑا اور ادب میں نئی وسعتیں پیدا کیں۔ اکبر کی جدت ان کی علامات میں مضمر ہے۔ انہوں نے ان علامات کو اپنے گردوپیش کی خارجی زندگی سے اخذ کیا۔ انہیں برطانوی حاکمانہ تصورات اور قدیم مشرقی اور مذہبی تصورات کے تصادم کا افسوس تھا۔ وہ مفاہمت کے قائل نہیں بلکہ جذباتی ہم آہنگی کے قائل ہیں۔

ے رہ گئے نا آشنا احباب غائب ہو گئے

ہم نفس دو ایک جو باقی تھے صاحب ہو گئے

اکبر کی شاعری میں شیخ اور سید دراصل قدیم و جدید کی علامتیں ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ نئی روشنی کا استعارہ بھی ہیں۔ لیکن یہ نئی روشنی ان کے عہد کا تاریک باب ہے۔

ے جو میری ہستی تھی مٹ چکی ہے نہ عقل میری نہ جاں میری

ارادہ ان کا، دماغ ان کا، خیال ان کا زبان میری!

اکبر کی علامتیں مغربی تہذیب کا غازہ ہیں۔ انجن، سوٹ، ریل، پیانو، کالج، مس، سروس، لیڈی، سکول، ہوٹل، یہ وہ علامتیں ہیں جن کے ذریعے ڈاکٹر وحید قریشی اکبر کے کلام کی تہہ تک پہنچتے ہیں۔ ان کے ظاہری معانی کے ساتھ ساتھ ان کے مفاہیم کے بھی شناسا ہیں۔ ڈاکٹر صاحب اکبر کے اس کارنامے کو یوں بیان کرتے ہیں:

> اکبر کی علامات کی رنگا رنگی کا یہی عالم ہے۔ اکبر کے دوسرے کارناموں کو اگر ہم وقتی طور پر نظر انداز بھی کر دیں۔ جب بھی شعر میں نئے احساس اور نئے شعری تجربے کو شامل کرنا، پرانی ہیئت میں نئی تبدیلیاں کر کے نئی نئی کیفیتوں کے اظہار کے لیے گنجائش پیدا کرنا اکبر کا وہ کارنامہ ہے جو انہیں اُردو شاعری کا ایک اہم معمار ثابت کرتا ہے۔ ۵

اُردو شاعری میں تنقیدی مطالعے کے سفر کو جاری رکھتے ہوئے ''اقبال کی شاعری'' ڈاکٹر وحید قریشی کا اگلا مضمون ہے۔ جس میں انہوں نے اقبال کے کلام کے مختلف حصوں کو تنقیدی جائزے کے لیے منتخب کیا ہے۔

اقبال کے کلام کے پہلے حصے پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر وحید قریشی نے اسے نئے تجربوں اور زبان و بیان کے نئے خدوخال وضع کرنے کا زمانہ کہا ہے۔ ان کے ہاں فارسی زبان کی پرشکوہ تراکیب نظر آتی ہے۔ دوسرے دور میں اقبال رومی، حافظ، غالبؔ اور ظہوری سے متاثر نظر آتے ہیں۔ لیکن اپنی جودتِ طبع کی بدولت دوسروں کے اسالیب کو اپنی ذات میں سمو کر ایک نئی آواز ایک انوکھا اسلوب اختیار کر لیتے ہیں۔ جذباتی توانائی کے لحاظ سے پیامِ مشرق، زبورِ عجم، بالِ جبریل اقبال کی شاعری کا نقطۂ عروج ہیں۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے اقبال کے کلام کا تجزیہ وہ اس انداز سے کرتے ہیں کہ اقبال کے کلام کا جذباتی سطح پر اظہار، تشبیہات و استعارات، علامتیں، نئی تلمیحات اور زبان بیان کے نئے نئے انداز ان سب کا تاثرات کی روشنی میں جائزہ تنقید کے ایک خوبصورت پیرائے کا اظہار ہے۔ مثال کے طور پر اقبال کے مندرجہ ذیل اشعار کو اصوات کی ترتیب اور بحر کے انتخاب کی وجہ سے بہترین کلام قرار دیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ فنی و فکری خوبیوں کی بنا پر اقبالؔ کا کلام ناقابلِ تقلید ہے:

سلسلۂ روز و شب نقش گر حادثات
سلسلۂ روز و شب اصل حیات و ممات
اول و آخر فنا باطن و ظاہر فنا
نقشِ کہن ہو کہ نو منزلِ آخر فنا

پھر چراغ لالہ سے روشن ہوئے کوہ و دمن
مجھ کو پھر نغموں پہ اکسانے لگا مرغِ چمن
پھول ہیں صحرا میں یا پریاں قطار اندر قطار
اودے اودے نیلے نیلے پیلے پیلے پیرہن

اس اندازِ تنقید کے بعد ڈاکٹر وحید قریشی نفسیات کے محدب عدسے سے اقبال کے فن و شخصیت کا مطالعہ

کرتے ہیں:

> اقبال کی شخصیت نرگسیت اور احساسِ گناہ کا ایک بڑا دلچسپ آمیزہ ہے۔ خودی کا فلسفیانہ غلاف اس اظہار شخصیت اور پشیمانی کو ڈھانپے ہوئے ہے۔ یہاں اقبال کے فلسفے کی اچھائی یا برائی سے بحث نہیں۔ یہاں صرف اس بات کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ فلسفۂ خودی کا تعلق اقبال کی شخصیت سے بھی ہے حتیٰ کہ اس کے ضمنی پہلو بھی اسی مرکز سے کسب فیض کرتے ہیں۔[۶]

ڈاکٹر وحید قریشی کے خیال میں اقبال کے اظہارِ جذبات میں جو شدت ہے اس میں بھی اقبال نے اپنی تسکینِ جذبات کا پہلو نکالا ہے۔ لیکن تیسرے دور میں یہ جذباتی شدت مدھم پڑ جاتی ہے۔ اب اقبال خطابت کے ذرائع پر زیادہ بھروسہ کرنے لگے ہیں۔ اقبال کی شاعری کا یہ ناقدانہ جائزہ بڑا مدلل ہے اور اس جذباتی لگاؤ سے ہٹ کر بڑا ہی منفرد ہے جو عام نقادانِ اقبال اپنے شعروں میں روا رکھتے ہیں۔

''تنقیدی مطالعے'' کے تنقیدی مضامین دو حصوں میں منقسم ہیں۔ ایک حصہ ''شاعری'' اور دوسرا حصہ ''تنقید'' پر مشتمل ہے۔ تنقید کے حصے میں ڈاکٹر وحید قریشی نے تنقید کے بڑے دلچسپ پہلوؤں کو پیش کیا ہے۔ پہلا مضمون ''فیضی کا نظریۂ شعر'' ہے۔ اس طرح ایک نقاد نے ایک دوسرے نقاد کے اصولِ انتقاد کو موضوعِ بحث بنایا ہے۔ کسی بھی شاعر کا نظریۂ شعر اس کا تصورِ فن ہوتا ہے اور اپنی شاعری میں وہ ہمیشہ اپنے تصورات فن کو ہی بالواسطہ طور پر استعمال کرتا ہے۔ لیکن ڈاکٹر وحید قریشی نے فیضی کے نظریۂ شعر کو سمجھنے کے لیے ابوالفضل کے نظریۂ فن سے شناسائی کو ضروری قرار دیا ہے اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ فیضی کے نفسیاتی تجزیے سے ڈاکٹر صاحب یہ اخذ کرتے ہیں کہ فیضی ایک انفعالی کردار تھا۔ اپنے چھوٹے بھائی کی علمی فتوحات کی وجہ سے فیضی پر ابوالفضل کو ترجیح حاصل ہے۔ فیضی نے اس ترجیحی سلوک کو قبول کیا اور ہمیشہ اپنے بھائی کی قابلیت کا معترف رہا۔

دراصل فیضی کے نظریۂ شعر کے پسِ پشت ابوالفضل کے نظریۂ فن کے تین بنیادی نکات درج ذیل ہیں:

ا۔ الفاظ و معانی کا رابطہ

ب۔ تقلید و انفرادیت تصوف کی روشنی میں۔

ج۔ ادب میں صوفیانہ اقدار کی اہمیت

فیضؔی کا عہد وہ دور تھا جب رومؔی کے اثرات کے تحت تصوف نے فنِ شعر میں راہ پا لی تھی بلکہ ایک ضابطۂ عمل بن گیا تھا۔ ابوالفضلؔ نے بھی معنیٰ اور صورت میں وحدت پیدا کی ہے اور اس کے ذریعے تصوف کے لیے راہِ بیان پیدا کی ہے۔ اس طرح ان کا فنِ شعر ایک ضابطۂ حیات بن جاتا ہے اور تصوف ان کی منزل ہے۔ ''تحقیق'' اور ''انفرادیت'' ان کے لیے ہم معنیٰ بن گئے ہیں۔ اگرچہ جامؔی کے ردعمل کا اثر ان کے ہاں بھی ملتا ہے لیکن یہاں آکر فیضؔی کا راستہ ابوالفضل سے جدا ہو جاتا ہے۔

فیضؔی کے نزدیک شعر کی الہامی صفات اس وقت ظاہر ہوتی ہیں جب دل عشق کی چوٹ کھائے ہوئے ہو لیکن ان کا اصل موضوع ان کا تخلیقی عمل ہے۔ ان کے کلام میں ان کی اندرونی کشمکش کا اظہار موجود ہے لیکن اس کشمکش پر روایت بھی اثر انداز ہوتی ہے اور ان کی اپنی شخصیت کا جادو بھی چلتا نظر آتا ہے۔ ان کے کلام کی منزلیں بڑی پیچدار ہیں۔ اسی سے ان کا نظریۂ شعر تشکیل پاتا ہے۔

اگلا مضمون ''غالبؔ کا نظریۂ شعر'' ہے۔ اس مضمون میں غالبؔ کے عہد کے تاریخی، تہذیبی اور نفسیاتی تجزیے کے بعد غالب کے تصورِ فن کو واضح کیا گیا ہے۔ اس میں غالب کے مخصوص نظریۂ روایت کو بھی موضوع بنایا گیا ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے اُردو تنقید میں نظری اور عملی دونوں طرح کی تنقید کی بنیاد ڈالی ہے۔ ان کے ہاں معقول استدلال موجود ہے۔ وہ گہرائی اور تفصیل کے ساتھ غالبؔ کے کلام کے فنی و فکری عناصر کا جائزہ لیتے ہیں۔ وہ روایت کے اس تصور کو بھی پیشِ نظر رکھتے ہیں۔ جو بقول ٹی ایس ایلیٹ ماضی کو اپنی ہڈیوں میں رچا کر آگے بڑھنے کا نام ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے خیال میں غالب نے ایک ایک لفظ کی نبض شناسی قیدِ زمان و مکاں سے بلند ہو کر ہی حاصل کی۔ اکبری دور کی تازہ گوئی نے ایک نئی روایت کی بنیاد ڈالی۔ اکبری دور کے استعاروں نے اُردو غزل کو فارسی غزل کے چمن سے گل چینی کر کے نت نئے استعارے اور تشبیہات عطا کیں۔ چمن، غنچہ، بہار، نغمہ، ساز، مے، جام، پیمانہ، بادۂ گوہر نے غزل کے ایوان سجا دیے۔ نئے اصول انتقاد

کی بنیاد ڈالی۔

معانی و بیان کے نئے سانچے وضع ہوئے۔ جمالیاتی اوزان و معائیر مقرر کیے گئے۔ غالب کا ابتدائی کلام انہی رجحانات کا پتہ دیتا ہے۔ اس میں ظاہری حسن کے ساتھ ساتھ باطنی حسن بھی کارفرما ہے۔ غالبؔ کے ہاں بھی شاعری الہامی کیفیت کا نام ہے اور یہ الہام گیارہویں حس کا نام ہے۔ غالب غم زمانہ سے متاثر ہوتے ہیں اور ساتھ ساتھ غم عشق کا بیان بھی ایک اثرانگیز لے اختیار کر لیتا ہے۔ غالب شاعرانہ عمل کی شعوری پرکھ کرنے والے شاعر ہیں۔ ان کے ہاں اعجاز اور شعبدہ میں فرق ہے۔ وہ لفظوں کی تراش خراش ضرور کرتے ہیں مگر لفظ و معنی کو جدا نہیں سمجھتے۔ وہ الفاظ کی صوتی اور جذباتی دونوں حیثیتوں سے اچھی طرح شناسا ہیں اور اس عمل کو ''بالیدن'' قرار دیتے ہیں جس کے مطابق اشعار کو بناتے، سنوارتے اور نکھارتے ہیں۔ یہی ان کا تصور شعروفن ہے۔

اگلا فکر انگیز مضمون ''اُردو تنقید سن ستاون سے پہلے'' ہے۔ اس مضمون کا آغاز ڈاکٹر وحید قریشی نے محمد حسین آزاد کی ''آبِ حیات'' کے ایک اقتباس سے کیا ہے۔ ان کے خیال میں قدیم تنقید کا مقصد صرف نقدِ شعر تھا اور زیادہ تنقیدی سرمایہ اسی ضمن میں صرف ہوا ہے تذکرے، علم معنی و بیان کی کتابیں، قوافی کے رسالے، شعراء کے دواوین اور عروض کی کتابیں ہمارا موضوع رہیں۔

''مطالعۂ حالی'' ڈاکٹر وحید قریشی کا ایک اور تنقیدی کرشمہ ہے۔ ''مطالعہ حالیؔ'' کا پہلا ایڈیشن اُردو بک سٹال لاہور کی طرف سے ۱۹۴۱ء میں شائع ہوا۔ اس تصنیف میں حالیؔ کی تصنیفات اور نگارشات کے اہم حصوں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب دیباچے میں فرماتے ہیں:

> مولانا حالیؔ کے کلامِ نثر و نظم کا مطالعہ میرا موضوع رہا ہے اور اس انتخاب کا پہلا مقالہ اسی تعلق کی داستان بیان کرتا ہے۔ دوسرے مقالے میں مولانا کی شاعری کو موضوع بنایا ہے۔ تیسرا ان کے تنقیدی کام کی مفصل روداد ہے۔ چوتھا حالی کے تحقیقی کارناموں کے ایک حصے کا تفصیلی جائزہ پیش کرتا ہے۔ ۷

اس کتاب کا پہلا باب ''میں اور حالی'' ڈاکٹر وحید قریشی کی حالی شناسی کا ایک انوکھا بیان ہے۔ اس میں،

انہوں نے اپنی ابتدائی زندگی کے احوال بیان کرتے ہوئے حالؔی کے کلام اور شخصیت سے اپنے لگاؤ کی داستان بھی بیان کی ہے۔ حالی سے ان کا ابتدائی تعارف ''مسدس مدو جزر اسلام'' کے اشعار کے ذریعے ہوا جو انہیں ابتدائی عمر میں ہی ازبر تھے۔

حالؔی سے اس تعارف نے کئی منازل طے کیں۔ نظم سے غزل اور پھر نثر کی باری آئی۔ ڈاکٹر صاحب نے شاعری اور نثر دونوں کو واضح خطوط میں دیکھنا شروع کر دیا۔ اس کے ساتھ حالی کے مقالات کا تحقیقی پہلو بھی ڈاکٹر صاحب کے مزاج سے قریب تر تھا اور ان کے تنقیدی معیار بھی تشکیل پانے لگے۔ مطالعے کی اس گہرائی نے ڈاکٹر وحید قریشی کو ایک نقاد کی حیثیت سے حالؔی کے سارے مواد کو دیکھنے کا موقع فراہم کیا۔ اب حالؔی اور ڈاکٹر صاحب کا تعلق ذاتی تعصبات اور آلائشوں سے قطعاً پاک ہو گیا۔ بلکہ حالی کے نظریات کو تنقید کی کسوٹی پر پرکھنے کا عمل شروع ہوا اور اس ضمن میں ڈاکٹر وحید قریشی کا مزاج یہ ہے کہ وہ محاسن و معائب کی تلاش اور بیان میں رو رعایت اور مصلحت اندیشی کو پسند نہیں فرماتے بلکہ زیرِ بحث شخصیت کو اس کے اصل روپ میں دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ دیگر لوگوں کی آراء کا مطالعہ تو کرتے ہیں لیکن ان کی تنقید کی عمارت سراسر ان کی اپنی تعمیر کردہ ہے۔ وہ حالؔی کے کلام کو بھی تاریخی ترتیب سے دیکھتے ہیں اور اس عمل کے دوران حالی کے ناقدانہ شعور میں انہیں چند نقائص بھی نظر آتے ہیں۔ کیونکہ شہرت ہی کسی نقاد کے انتقاد کی اچھائی یا برائی کا معیار نہیں ہے۔ شہرت کی اس مرصّع جالی کے پیچھے ان کی حقیقی حیثیت کا سراغ لگایا جائے تو وہ کچھ اور ہی طرح سے سامنے آتی ہے۔

ڈاکٹر وحید قریشی حالؔی کی تنقید کا جائزہ لیتے ہوئے اپنا تنقیدی تصورِ فن بھی بیان کر جاتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

> حالؔی منطقی مغالطوں کا شکار بھی تھے۔ قدیم و جدید کے امتزاج میں اکثر جگہ وہ غلطی کھا گئے ہیں۔ اپنی طبیعت کی بعض مجبوریوں کے سبب وہ بعض عناصر کے تجزیے میں ناکام رہے۔ اس کا احساس ہمارے اکثر نقاد کرتے ہیں لیکن یہ تو تجزیے کی منزل ہے۔ قدر و قیمت کا فیصلہ کرتے وقت تو خیالات کی صحت و عدمِ صحت کا اقرار کرنا ہی پڑے گا۔ ہمارے ہاں تجزیے اور تعین اقدار کے اس فرق کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے حالانکہ اس آخری منزل پر

آ کر نقاد کا کام عذر پیش کرنا یا جواز ڈھونڈنا نہیں بلکہ کھرے کھوٹے میں فرق کرنا ہے۔ ۸

گویا ڈاکٹر وحید قریشی نے حالؔی کے اندازِ تنقید پر بحث کے دوران اپنا تنقیدی نظریہ بھی بیان کر دیا اور ایک نقاد کے فرائض کو بھی اجاگر کر دیا۔ ان کے خیال میں حالی کی نظم و نثر کا تجزیہ بھی ذرا مختلف انداز سے کرنا پڑے گا کیونکہ نثرنگار حالؔی اور شاعر حالی میں بڑا فرق ہے۔ شعر کے ضمن میں ان کا نظامِ فکر خاصا سلجھا ہوا ہے۔ لیکن نثر میں ان کے مباحث الجھے ہوئے نظر آتے ہیں۔ نقاد حالی اور محقق حالؔی بھی ایک دوسرے سے متضاد رویئے رکھتے ہیں۔ جہاں انہوں نے حیاتِ سعدی، میں تحقیق کے بنیادی اصولوں کی پیروی کی ہے۔ وہاں حیاتِ جاوید اور یادگارِ غالب میں ان اصولوں کو مدنظر نہیں رکھا گیا۔ اسی طرح تنقید میں بھی انہوں نے سچ کی خاطر اپنے عقائد کو صلیب پر نہیں چڑھایا بلکہ اپنے عقائد کے ساتھ زندہ رہے اور پھر سچ کو کہنے کے لیے جس جرأت کی ضرورت تھی وہ حالؔی کے عاجزانہ رویئے کے بس کی بات نہ تھی جبکہ تنقید حقیقت کو دیکھنے اور پرکھنے کا نام ہے۔

ڈاکٹر صاحب کا دوسرا مضمون ''حالؔی دلی میں'' ہے۔ جس میں ڈاکٹر وحید قریشی نے یہ ثابت کیا ہے حالی کے رویوں، طرزِ فکر اور احساسات کو متعین کرنے میں کوئی ایک عامل نہیں بلکہ بہت سے عوامل کارفرما رہے۔ اگرچہ ڈاکٹر وحید قریشی نے اپنی تحقیق میں فلسفہ، سیاسی و سماجی عوامل اور نفسیات کا ذکر بھی کیا ہے اور حالی کے علاوہ دیگر شخصیات جن پر انہوں نے تنقیدی مباحث لکھے ہیں۔ سب کے فن پاروں کا تجزیہ اور اس تجزیے کے اصول ان فن پاروں کے اندر سے ہی اخذ کیے ہیں۔ لیکن عمرانی اصول، نفسیات کے حوالے اور جدلی مادیت کے فلسفے کے قانون ڈاکٹر وحید قریشی کسی ایک دائرے میں مقید رہ کر اپنی تنقید کو کسی ایک رجحان کے تابع نہیں کرتے بلکہ ان کی تحقیق و تنقید کائنات، فطرت اور اِنسان کے مابین بنیادی رشتوں پر اپنی بنیاد رکھتی ہے۔ ان کے انتقاد ادب کا مدار سیاسی و سماجی تعلق پر ہے۔ لیکن ساتھ ہی بالواسطہ طور پر عمرانی و نفسیاتی عناصر بھی شامل ہو جاتے ہیں۔ یوں ایک ایسی تصویر اُبھرتی ہے۔ جو ہیئت اور عینیت کے درمیان ایک حقیقی مظہر بن کر اُبھرتی ہے۔

کسی بھی ادیب سے اس کا خاص عہد، ماحول اور علاقہ جدا نہیں کیا جا سکتا۔ یہ کبھی لینڈ سکیپ بن کر اس کی تخلیقات میں ظاہر ہوتا ہے اور کبھی خاص علامتوں کی زبان اختیار کرتا چلا جاتا ہے۔ مصنف کا تشبیہاتی و استعاراتی نظام اس کے اردگرد سے مشابہ اور اخذ کردہ ہوتا ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے بھی حالؔی کی

تخلیقات اور ان کے قیام دلی کے درمیان نفسیاتی رشتوں کا سراغ اپنے مضمون میں لگایا ہے۔ ۱۸۵۷ء جو کہ ایک سیاسی بساط کے الٹنے کا زمانہ ہے۔ حالؔی نے بھی اسی دور میں اول اول غالب کا کلام سنا اور تعلیم کی تکمیل کی۔ ۱۸۵۷ء کے بعد محفلیں اجڑ گئیں اور حالی نے لاہور میں آ کر قیام کیا۔ اِس دوران انہیں اپنا وطن دلی یاد آتا رہا لیکن جن تخلیقی سوتوں نے لاہور میں جنم لیا انہیں دلی جا کر انتہائے کمال ملا۔ دلی ان کا ادبی وطن تھا۔ انہوں نے نیچرل شاعری اور سادہ نویسی کو اپنا کر انگریزی ادب کے اثرات کو بھی قبول کیا۔ لاہور میں رہائش کے دوران انہوں نے تعلیمی کتابوں کی تدوین کا کام بھی کیا اور نثری تخلیقات کی طرف توجہ کی۔ شاعری میں شعوری طور پر نئی روح پھونکنے کی کوشش کی۔ لیکن دہلی آ کر ان کا رجحان شاعری کی طرف زیادہ رہا۔ غالب کا مرثیہ حالؔی کے شاعرانہ فن کی معراج ہے۔ وہ ۱۸۵۷ء سے اگست **۱۸۸۹**ء تک اینگلو عربک کالج میں عربی کے استاد رہے۔ کچھ مدت کے لیے واپس لاہور آئے لیکن یہ فضا ان کو اداس اور بیزار کرتی رہی۔ وہ پھر لوٹ کر دلی چلے گئے لیکن اب ان کی فطری شاعری کی چنگاری، بجھ رہی تھی اور یہ دھندلے نقوش ایسے خیالات ہیں جن میں کسی جذبے کا دور دور تک سراغ نہیں ملتا۔ سرسیّد کے زیر اثر حالی ناصحانہ اور اخلاقی شاعری کرتے رہے۔ مثنوی تعصب و انصاف، مناظرہ واعظ وشاعر، مناجات بیوہ، حقوق اولاد، یہ ایسی نظمیں ہیں جو حالی کو رفتہ رفتہ ایک میکانکی انداز کا شاعر بناتی چلی گئیں البتہ مسدس مدوجزر اسلام، میں شاعر کے احساسات کی سطح بلند اور تخلیقی لگن اپنی ارفع ترین صورت میں سامنے آتی ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے مسدس مدوجزر اسلام، میں مسلمانوں کے زوال اور انتشار کی وسیع تصویر اور علامت بغداد میں درحقیقت دلی ہی کے غدر اور ہنگامے کی اصل تصویر قرار دیا ہے۔ دلی جو اب ویرانہ تھا۔ ان کے ساتھی، سخن فہم دوست ایک ایک کر کے اس دُنیا سے اُٹھ رہے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ مسدس مدوجزر اسلام امت اسلام کے علاوہ دلی اور دلی والوں کا نوحہ بھی ہے۔

تذکرہ دہلی مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ
نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانہ ہرگز

اب دلی میں رہنا ماتم یک شہر آرزو تھا۔ وہ دوبارہ پانی پت میں انصاریوں کے محلے میں جانے کی خواہش رکھتے تھے۔

اس سے اگلا مضمون ''حالی کی تنقید'' ہے۔ اس میں ڈاکٹر وحید قریشی نے مقدمہ شعروشاعری پر تنقید کے

ذریعے حالی کے کلام کی نوعیت اور اس کی صحیح قدروقیمت کا اندازہ لگایا ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے کبھی بھی کسی شخصیت پر تنقید کے دوران توازن و تناسب کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ یہی خوبی وہ حالی اور ان کے مقدمے میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ حالی کے تنقیدی نظام میں انہیں وضاحت تو ضرور مل جاتی ہے لیکن توازن نہیں ملتا اور ان کی تنقید قدیم تنقیدی نظام کی بازگشت بن کر رہ جاتی ہے۔

قدیم تنقیدی نظام پر ایرانی اثرات کا ردعمل آج تک موجود ہے۔ ہمارے نقاد معانی اور الفاظ کو الگ الگ کر دیتے ہیں اور واضح تصورات کی خاطر تجسیمی عمل کے قائل ہیں۔ حالی نے قدیم و جدید مغربی تنقید کا مطالعہ بھی کیا تھا۔ اس دور میں بیرونی اثرات بھی اُردو تنقید کو متاثر کر رہے تھے۔ لیکن حالی کی مذہبی شیفتگی اس درجہ بڑھی ہوئی تھی کہ ہر اثر کو اسی طرح قبول نہیں کر سکتے تھے۔ ان کا ذہن قطعیت کی طرف مائل تھا وہ دیگر شخصیات کو ان کے عقائد سے الگ کر کے بھی قبول کر لیتے اور اپنے عقائد کی روشنی میں اپنی اصطلاحات کا تعین کرتے۔ ان کے ہاں وضاحت تو موجود ہے لیکن تفصیلات نہیں۔ وہ شاعری میں قوتِ متخیلہ کے ساتھ ساتھ قوتِ ممیزہ کو بھی ضروری خیال کرتے ہیں اور شعر میں جوش و تاثیر کے قائل ہیں۔ اس کے علاوہ ''سوز و گداز'' کی خوبی ان کے ہاں مغربی اثرات کے تحت آتی ہے۔ مغربی اثرات کے زیرِ اثر ہی حالی نے نظام تنقید میں تبدیلی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ مثلاً سادگی کا مفہوم ان کے نزدیک کچھ اور ہے۔ وہ ذہن میں خیال کے واضح ہونے کے قائل ہیں۔ استعارے، تشبیہات اور تلمیحات دور از فہم نہیں ہونے چاہئیں۔

وہ الفاظ کی بے ساختگی اور تاثیر کے قائل ہیں۔ انہوں نے انگریزی تنقیدی سرمائے میں میکالے، ملٹن، بائرن اور جانسن سے اثر قبول کیا ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی مقدمے پر دیگر مغربی اثرات کا ذکر یوں کرتے ہیں۔

> کولرج ہندوستان میں اس وقت مشہور نہ تھا اگرچہ اس کی "Biographia Literatria" میں سے ایک فقرے کا نصف حالی نے لے لیا ہے۔ باقی نصف کو بھی اگر وہ دیکھتے تو شاید ان کا نظریہ شعر اپنی موجودہ صورت سے مختلف ہوتا۔ وہ ورڈز ورتھ کی شاعری سے واقف تھے۔ لیکن اس کے Preface تک ان کی رسائی نہ تھی۔ کیونکہ اس مضمون پر اگر ان کا ہاتھ پڑ جاتا تو وہ تمام مضمون کا ترجمہ کر ڈالتے اور اپنی کتاب میں شامل کر لیتے۔ یہی ایک ایسا مضمون ہے، جس سے ان کے سادگی والے نظریئے کو ایک

> زبردست بنیاد مل سکتی تھی۔ یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ ورڈز ورتھ کے اس نظریئے کی کولرج نے Biographia Literaria ہی میں تقلید کی ہے۔ جس سے ملتے جلتے نظریئے پر حالی نے مقدمہ کی بنیاد کھڑی کی ہے۔ میتھیو آرنلڈ کی کتابیں بھی ان کی نظر سے نہیں گزریں۔ ۹

ڈاکٹر وحید قریشی نے مقدمۂ شعر و شاعری کو سامنے رکھ کر اس حقیقت کو ثابت کیا ہے کہ حالی نے انگریزی تنقید کو اس کے صحیح تناظر میں نہیں دیکھا۔ شاید اس کی وجہ مواد کی فراہمی میں وقت بھی رہی ہو گی۔ مقدمے کے پہلے ثلث میں تضاد اور بے ترتیبی حد سے بڑھ گئی ہے۔ اگرچہ مولانا نے مقدمہ شعروشاعری لکھنے اور مواد جمع کرنے میں دس سال صرف کیے۔ ۱۸۹۳ء میں مقدمہ شعروشاعری نے مکمل شکل اختیار کی۔ جس میں حالی نے واضح کیا کہ شاعری اگر عمدہ اصول پر مبنی ہو تو کس قدر قوم اور فن کے لیے فائدہ مند ثابت ہو سکتی ہے۔ لیکن فن شاعری کے وہ بنیادی اصول جو خود مقدمہ شعروشاعری میں حالی نے ترتیب دیے ان میں فکری تضاد ''یادگارِ غالب'' میں واضح نظر آ جاتا ہے۔ شخصیت پرستی حالی کی بہت بڑی کمزوری رہی ہے۔ وہ افراد کی شہرت کو ہی ان کے ادبی مقام اور درجے کی کسوٹی سمجھنے لگتے ہیں۔ شہرت کے علاوہ اخلاق اور سادگی کو بھی وہ کسی شخصیت کو پرکھنے کے لیے مدنظر رکھتے ہیں۔ اس ضمن میں حالی کے سامنے قدیم تنقیدی نظریہ اور منطق کے اصول و ضوابط معیار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اخلاقی نقطۂ نظر ایک مستقل قدر کی طرح ان کے ذہن پر چھایا ہوا ہے۔

ڈاکٹر وحید قریشی نے حالی کے اصولِ انتقاد کے تین اہم ستون سادگی، مبالغہ آرائی سے گریز اور نیچرل ہونا قرار دیے ہیں۔ حالی کا تنقیدی نظام انہی اصولوں پر استوار ہے۔ وہ لفظ اور معانی کے بنیادی تعلق کو قائم رکھنے کے حامی ہیں۔ وہ کمال غور و فکر کے بعد ظہور میں آنے والے کلام کو منزہ اور لطیف سمجھتے ہیں لیکن بعد ازاں ایک بحث کے دوران اس نظریئے کو خود ہی باطل ثابت کر دیتے ہیں جہاں یہ فرماتے ہیں کہ شاعری کا مدار جس قدر الفاظ پر ہے، اس قدر معانی پر نہیں۔ مضمون اور طرزِ ادا کے درمیان خلا کا احساس خود حالی کو بھی شدت سے ہے۔ مضمون کی بحث ان کے ہاں سب سے زیادہ اُلجھی ہوئی ہے۔ حالی کے خیال میں تخیل کا بنیادی اصول جذبے کا ادراک ہے۔ ان کے ہاں" خیال" کا پرانا تصور ہے۔ لیکن اپنے تنقیدی نظام میں وہ خیال کے تصور کو

ثابت نہیں کر پائے اور بلاغت کے قدیم تصورات کو ہی ثابت کرتے رہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی روایت سے غافل نہیں بلکہ ہر طرح کی روایت ان کے مضامین میں اپنا تانا بانا بنتی نظر آتی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ ادیب کی داخلی کیفیات کو بھی مدنظر رکھتے ہیں۔ ان کے ہاں حالیؔ کا کلام ان کے خلوص کا آئینہ تو ہے لیکن وہ اسی آئینے میں جب دوسرے افراد کا عکس دیکھتے ہیں تو منطقی مغالطوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ حالی ادب اور اخلاق کے باہمی تعلق کو ناگزیر قرار دیتے ہیں اور بالواسطہ اخلاقی تلقین کو ادیب یا شاعر کی ذمہ داری قرار دیتے ہیں۔

ڈاکٹر وحید قریشی حالی کی اخلاق زدگی کو ان کی نفسیاتی الجھن قرار دیتے ہیں۔ حالیؔ کو مخصوص حالات اور ماحول کی وجہ سے اپنے علمی پس منظر اور تیز ذہانت کی نعمتوں کو بروئے کار لانے کا کبھی موقع نہ مل سکا۔ ایک اچھا تنقیدی شعور پیدا کرنے کے لیے اخلاص کے علاوہ شعور ذات کی ضرورت بھی ہے۔ حالیؔ نے نقدِ شعر کی بنیاد جن اصولوں پر رکھی وہ اصول انہوں نے اپنائے بھی لیکن دیگر عوامل سے گریزاں نہ رہ سکے جو ان اصولوں پر اثر انداز ہو کر ادب پارے کی داخلی و ظاہری شکل بدل ڈالتے ہیں۔

اس کتاب کا اگلا مضمون ''یادگار غالب ایک تحقیقی مطالعہ'' ہے۔ جس پر تنقید کرتے ہوئے ڈاکٹر وحید قریشی اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ یادگارِ غالب، تحریر کرتے وقت حالی کو جو سہولتیں اور مواد بہ آسانی میسر آ سکتا تھا۔ انہوں نے اپنی تنقید کے دوران اس سے بھرپور استفادہ نہیں کیا۔ واقعات و سنین کی بے شمار غلطیاں اس حقیقت کو ظاہر کرتی ہیں۔ حالیؔ نے معاصر شہادتوں اور مسودوں سے فائدہ نہیں اٹھایا۔ اس دور میں حیاتِ غالب پر قلم اٹھاتے وقت انہیں بے شمار افراد سے بنیادی شہادتیں میسر آ سکتی تھیں اور خود حالی بھی غالبؔ کے معاصرین میں سے ایک تھے۔ غالب کے جاننے والوں اور شاگردوں کی بڑی تعداد ایسی تھی جو حالیؔ کے اردگرد موجود تھے۔ اس کے باوجود ''یادگارِ غالب'' میں تنقیدی فروگزاشتیں موجود ہیں اور افراط و تفریط کی وجہ سے حالیؔ نے ''یادگارِ غالب'' میں متوازن نقطۂ نظر پیش نہیں کیا۔ ان کا طریقِ تنقید بھی ڈاکٹر وحید قریشی کے خیال میں طے شدہ اصولوں پر مبنی نہیں اور انہیں کتاب کی ضخامت اور حجم کا خیال بھی پریشان کیے دیتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب حالیؔ کی ''یادگارِ غالب'' میں پیش کردہ واقعات اور بیانات کا جائزہ لینے کے لیے ان کے معاصرین کے بیانات سے موازنہ و تقابل کرتے ہیں۔ ان بیانات کی زمانی و تاریخی ترتیب کے ذریعے یہ ثابت کرتے ہیں کہ حالیؔ کے کئی بیانات محض اندازے پر مبنی ہیں۔ ان میں تاریخی واقعیت موجود نہیں۔ پھر

شفیعہ کی دہلی آمد، جشنِ رامپور، حالؔی کی غالب سے شاگردی اور روابط وغیرہ ایسی مثالیں ہیں جن سے یہ اندازہ لگانا چنداں دشوار نہیں کہ غالب سے حالؔی کے روابط اور نشست اس قدر نہ تھی کہ وہ ان کے حالات مفصل بیان کر سکیں۔ غالب کی زندگی کی تفصیلات رقم کرنے میں حالؔی کو یقیناً یہی دشواری رہی۔ غالب کی زندگی کے واقعات ان کے ہاں ہیں تو سہی مگر کسی قدر پراگندہ اور منتشر حالت میں۔ اس اثر آفرینی کا حالؔی کے ہاں شائبہ نہیں جو خود غالب کے کلام اور زندگی پر آسمان کی طرح سایہ فگن ہے۔ اسی طرح ڈاکٹر وحید قریشی نے تاریخی حقائق کے ذریعے بھی یہ کھوج لگانے کی کامیاب کاوش کی ہے کہ غالب کے آباؤ اجداد کس سن میں ہندوستان آئے۔ اس مقصد کے لیے وہ شاہ عالم کی بادشاہی کے زمانے ۱۷۵۹ء سے شروع کرتے ہیں کہ اس دور میں شاہ عالم کی بادشاہی کا آغاز ہوا۔ اسی طرح غالبؔ کے ذاتی مکان، کرائے داری کے مکانوں اور غالب کے سفرِ کلکتہ کی تفصیلات کا صحیح رُخ جاننے کے لیے ڈاکٹر صاحب نے حالؔی کے بیانات پر اکتفا نہیں کیا بلکہ حالی کے علاوہ ''یادگارِ غالب'' کے مدمقابل ''آبِ حیات'' سے استفادہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ دیگر قرائن اور معاصر شہادتوں کو بھی مدنظر رکھا ہے۔ ''یادگارِ غالب'' پر ''آبِ حیات'' کے اسلوب کے اثرات کا جائزہ بھی لیا گیا ہے۔ کہیں کہیں خود غالب کے بیانات، میں تضادات موجود ہیں۔ یعنی ''آبِ حیات'' میں تحریر کچھ اور ہے جبکہ ''یادگارِ غالب'' میں بات کی نوعیت بدل گئی ہے۔ مثال کے طور پر حالؔی نے لطائف وظرائف ''آبِ حیات'' ہی سے لیے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ''آبِ حیات'' کو پڑھ کر غالبؔ کی جو تصویر بنتی ہے۔ ''یادگارِ غالب'' میں بننے والی تصویر سے زیادہ مختلف نہیں۔ غالب کی معنی آفرینی، نازک خیالی، ظرافت، طرزِ خیال اور طرزِ بیان کی جدت یہ ایسے امور ہیں کہ جنہیں آزاد پہلے ''آبِ حیات'' میں بیان کر چکے تھے۔ لیکن حالؔی نے میسر اور دستیاب مواد کو چھان بین کر کے پرکھا نہیں۔ حالؔی نے تنقید کے بنیادی اصولوں مثلاً پرکھنا، چھان بین کرنا، کھرے اور کھوٹے میں فرق اور بہترین مواد کی پہچان کو سامنے نہیں رکھا حالانکہ ان میں بہترین تنقیدی شعور موجود تھا۔ لیکن اس کا استعمال نہ کر کے انہوں نے ''یادگارِ غالب'' کے تنقیدی معیار کو اپنی دیگر تنقیدوں مثلاً حیاتِ سعدی، سے کمتر درجہ کی تصنیف بنا دیا۔

''مطالعۂ حالی'' کا آخری مضمون ''حالی کی غزل گوئی'' ہے۔ حالی یقیناً ایک بہترین غزل گو تھے لیکن اپنے اس جوہر کو انہوں نے دُنیاداری اور اخلاقی اصولوں کی بھینٹ چڑھا دیا۔ انہوں نے اپنے مادی نظریات کی

بدولت شاعری اور تنقید دونوں کو مادی اور افادی پہلوؤں کے ترازو میں تولا۔

ڈاکٹر وحید قریشی کے خیال میں یہ مادی و افادی نظریۂ ادب ۱۸۵۷ء کے بعد سے ہمارے ادب کا واضح رجحان ہے۔ جو اس کے دور کے ہر ادیب اور شاعر کے یہاں نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی چونکہ تاریخ دان بھی ہیں۔ اس لیے وہ اپنی تنقید کو عمرانی و سماجی پہلوؤں سے الگ نہیں کرتے۔ یوں بھی جس معاشرے میں قدروں کی شکست و ریخت کا یہ عالم ہو کہ ایک تہذیب سرے سے مٹ چکی ہو اور نئی تہذیب کا قافلہ ابھی روانہ ہی نہ ہوا ہو۔ وہاں قدروں کا سرمایہ ایک پیچیدہ نفسیاتی الجھن کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے لارڈ لیک کے دہلی پر قبضے ۱۸۵۳ء سے حالی کے عہد کا جائزہ لینا شروع کیا ہے یہ اگرچہ حالی سے قبل کے واقعات ہیں لیکن یہی وہ دور ہے جہاں زندگی کی اصل قدریں کچلی گئیں اور قدیم و جدید اقدار میں تصادم کی کیفیت شروع ہوگئی۔ مادی ترقی کی دوڑ میں زندگی میں حرکت اور جدوجہد نے سکوت کی جگہ لے لی۔ ترکِ دُنیا کا رویہ متروک ہوا۔ یہ تضادات کی فضا تھی۔ لیکن سرسیّد نے ان تضادات کو اپنی علمی تحریک میں ضم کرنے کی کوشش کی۔ سرسیّد احمد خان کی تحریک بھی درحقیقت ایک احساسِ شکست کا نتیجہ تھی۔ تاہم اس تحریک سے اُردو ادب کو بالواسطہ فوائد حاصل ہوئے اور ادب میں عقلی رجحان نے فروغ پایا اور قدیم کے خلاف ردعمل کی ایک صورت پیدا ہوئی۔ تسخیر کائنات اور مادی زندگی کی اہمیت نے فکر ونظر میں نئی تبدیلیاں پیدا کیں۔ مغربی علوم کی ترقی، سائنسی فتوحات، یورپی علمی ترقی کے سامنے ہماری دیگر قدروں کی طرح اُردو شاعری بھی زیادہ دیر نہ ٹھہر سکی تھی۔ چنانچہ شعراء نے براہِ راست زندگی کی صداقتوں سے اپنا رابطہ قائم کیا۔ غزل میں سماجی، معاشرتی اور سیاسی افکار کو بیان کیا جانے لگا۔ لیکن زبان و بیان کو اس سے نقصان بھی پہنچا او روہ یہ کہ قدیم تشبیہات و استعارات کو ترک کر کے زبان کو عام استعمال کی سطح کے قریب تر لانے کی کوشش کی گئی۔

اس ضمن میں حالی نے مقدمۂ شعروشاعری میں اُردو شاعری کی تنقید کے نئے معیار تشکیل دیے۔ حالی کی غزلیات ارتقاء کے اعتبار سے تین حصوں میں منقسم ہیں۔ لیکن ڈاکٹر وحید قریشی کے خیال میں ادوار کی زمانی تقسیم پیچیدہ اور الجھی ہوئی ہے۔ حالی کی غزلیات کا سرمایہ ۱۸۹۳ء میں مرتب ہوا۔ ان غزلیات میں تغزل بھی ہے اور حالی کے ادبی ارتقاء اور شاعرانہ سفر کی داستان بھی۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے حسبِ روایت حالی کے عہد کے نشیب و فراز کا جائزہ تاریخی حقائق کے آئینے میں لیا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ حالی کے ذاتی حالات، افتاد

طبع اور نفسیاتی پہلوؤں کو نظر انداز نہیں کرتے۔ حآلی کی تنقید و تخلیق دونوں کا جائزہ ان کے حالات کی روشنی میں لیتے ہیں۔ حآلی کی زندگی کی ابتدائی مشکلات، والدین کی شفقت سے محرومی اور دوسروں کے سہارے چلنے والا رویہ ان کی شاعری میں تشکیک کی فضا پیدا کرتا ہے۔ حالی شیفتہ، کرنل ہالرائیڈ اور سرسیّد احمد خان جیسی شخصیات سے متاثر ہیں اور ان خطوط کی مدد سے اپنے فن کی تکمیل کرتے ہیں جو ان شخصیات کے ساتھ تشکیل پاتے ہیں۔ وہ ہمیشہ ان شخصیات کی تقلید کرتے رہے۔ حآلی کی اصلاح پسندی بھی دوسروں کی روش سے متاثر ہونے کا نتیجہ تھی۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے مقدمہ شعر و شاعری کے دیباچے میں حالی کی اس روش کا جائزہ مفصل انداز میں لیا ہے۔ حالی کی جدت پسندی بھی ان کے تقلیدی رجحان کا ہی ایک زبردست اظہار ہے۔ حآلی کے داخلی کوائف ان کے ہر رجحان کے پسِ پشت محرک کی صورت میں جلوہ فرما ہیں۔ حآلی کے تضاد اور تذبذب کے سرچشمے ان کی اپنی شخصیت سے ہی پھوٹتے ہیں۔ مثال کے طور پر عشق کو قومی زندگی کے لیے مہلک اور نجی زندگی میں ناگزیر خیال کرتے ہیں یعنی اپنے عقائد اور حقیقی زندگی میں عدم توازن کا شکار ہیں۔

ڈاکٹر وحید قریشی نے اِن حقائق سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ حالی کے تجربات میں وہ وسعت اور گہرائی نہیں جو انہیں میؔر اور غالؔب کے پائے کا شاعر بنا سکے۔ البتہ ڈاکٹر صاحب حآلی کو نفسیاتی اشعار کہنے والا کامیاب شاعر تسلیم کرتے ہیں۔ حالی کے کلام بالخصوص غزل کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں:

> لفظی تضادات سے ہٹ کر حالی جب زندگی کے تضادات کی تصویر کشی کرتے ہیں تو وہ سب سے زیادہ کامیاب ہمیں وہاں نظر آتے ہیں۔ جہاں اِنسانی اعمال کا تضاد انہیں اپنی طرف کھینچتا ہے یہاں پر ان کی شخصیت میں ایک وحدت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس تنظیم اور وحدت کی بنیاد پر انہوں نے جو شاعری کی ہے وہ غزل گوئی میں حآلی کی معراج ہے۔ اپنے تضادات کا شکار ہونے کی بجائے یہاں زمانے کے تضاد کو بھانپ لیتے ہیں اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتے ہیں۔ یہاں حآلی کی اپنی شخصیت پوری طرح اُبھر آتی ہے۔ تحریکِ سرسیّد کے برگزیدہ افراد نے روحانی قدروں کی بجائے مادی قدروں کی ترجمانی کی اور زندگی کے خارجی مظاہر کی مدد سے اپنا بنیادی رویہ متعین کیا۔ حآلی نے اُردو شاعری کو جامد تصورات اور ساکن زندگی کی ترجمانی سے آزاد کر کے اسے کائنات کے وسیع تر پہلوؤں سے آشنا کیا۔ ۱۰

تنقید کے میدان میں مستقل تصانیف کے علاوہ ڈاکٹر وحید قریشی نے وقتاً فوقتاً مختلف تنقیدی مقالات بھی لکھے ہیں۔ ان مقالات کو ادبی رسائل وجرائد میں شائع کیا جاتا رہا۔ مثال کے طور پر ''سویرا لاہور'' ضمیمہ اورنٹیل کالج وغیرہ۔ ڈاکٹر وحید قریشی کے یہ مقالات ان کی محققانہ بصیرت اور تنقیدی شعور کے غماز ہیں۔ ان کی نگاہ ہر پہلو سے نکتہ آفرین ہے اور نکتہ سنج بھی۔ اس ضمن میں ان کا ایک تنقیدی مضمون ہے: ''سوؔدا کی غزل گوئی''۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے اس مضمون میں سودا کی غزل گوئی کے سرچشموں کا سراغ لگانے کی کوشش کی ہے۔ اِس ضمن میں وہ سودا کے زمانے کی فارسی روایت کا تذکرہ بھی کرتے ہیں اور اس روایت کے زیرِ اثر سودا کی اُردو غزل گوئی کا جائزہ لیتے ہیں۔ روایت پسندی اور روایت شکنی کے درمیان سوؔدا نے جن راہوں پر سفر کیا وہ ڈاکٹر وحید قریشی کی دلچسپی کے خاص پہلو ہیں۔ مثال کے طور پر سوؔدا کی قصیدہ گوئی کی تعریف کرتے ہوئے انہیں انورؔی اور خاقانؔی کے ہم پایہ قرار دیتے ہیں لیکن اُردو غزل میں سوؔدا میر کے ہم پایہ ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔

سودا کی تحلیل نفسی کرتے ہوئے ڈاکٹر وحید قریشی ان کی محرومیوں کا سراغ ان کے ذاتی الم سے لگاتے ہیں۔ جو بے اولادی اور نرگسیت کی صورت میں ان کی ذات کا غم بن گیا۔ تنہائی کا احساس بھی ان کی ذاتی مشکلات کا نتیجہ تھا۔ ڈاکٹر وحید قریشی نفسیاتی تنقید کے اصولوں کو استعمال میں لاتے ہوئے سوؔدا کی لغات اور تشبیہات و استعارات کا جائزہ لے کر ان کے محرکات شعری کا سراغ لگاتے ہیں۔ خاص طور پر ثمر کا لفظ ان کے ہاں بے برگ و بارزندگی کی علامت بن کر رہ گیا ہے۔

؎ گل پھینکے ہیں اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی
اے خانہ بر اندازِ چمن کچھ تو ادھر بھی!

؎ میں ہوں وہ نخل کہ جس نخل کو قیامت تک
بہار کیسی ہی آئے تو برگ و بار نہیں

سوؔدا کے ہاں بھی اپنے دیگر معاصرین کی طرح دُنیا کی ناپائیداری کا احساس بہت گہرا ہے۔ دِلّی کی گلیوں کا ماتم ان کے فن کا مرکزی نقطہ بن جاتا ہے۔ ان کا عشق مادی ہے لیکن اس میں رنگارنگی اور تنوع بھی ہے

اور یہی تنوع ان کی غزل کا اہم جزو ہے:

ے نے حرف و نے حکایت و نے شعر و نے سرود
نے سیرِ باغ و نے گل و گلزار دیکھنا
خاموش اپنے کلبۂ احزاں میں روز و شب
تنہا پڑے ہوئے در و دیوار دیکھنا

ے تصویر تری مجھ بن مانی نے جو کھینچی تھی
انداز سمجھ اس کا بہزاد بہت رویا

اِن کے ہاں صوتی بصری اور سمعی امیجری چمک کر مٹ جانے والے جذبات کی عکاس ہے۔ سوؔدا کے ہاں Sound Image اور Visual Images موجود ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی سوؔدا کی اسی تکنیک کو ان کا Colour Sense کہا ہے جس کی مدد سے وہ مناظر میں نکھار پیدا کرتے ہیں:

ے گرم جوشی نہ کرو مجھ سے کہ مانندِ چنار
اپنی ہی آگ میں میں آپ جلا جاتا ہوں

ے چمن میں بلبلوں نے جب نہ پائے عشق کے چھکے
لگی سارے چمن کو آگ جتنے تھے کنول دہکے

سودا کی غزل گوئی کے مذکورہ بالا عناصر ان کی شاعری کو جو آب و رنگ عطا کرتے ہیں۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے ان کا تجزیہ تنقید کے آئینے میں اپنے اصولوں کو کسوٹی بنا کر کیا ہے۔

اگلا مضمون ''غالب کا نظریۂ شعر'' ہے۔ جس کا مفصل تذکرہ ''نقدِ غالب'، کے زمرے میں آچکا ہے۔ لیکن ''نقدِ غالب'' کے علاوہ یہ مضمون ادبی رسالے سویرا لاہور میں بھی شائع ہو چکا ہے۔ اس مضمون میں ڈاکٹر وحید قریشی نے غالب کے اشعار کا تجزیہ کرتے ہوئے ان کے شاعرانہ عمل کی پرکھ کے انداز کی توضیح کی ہے۔ جس کے زیرِ اثر

غالب کے کلام میں تنوع پیدا ہو گیا ہے۔ وہ جذبے کی صداقت کے لیے اثر انگیزی اور سچائی کو ضروری خیال کرتے ہیں لیکن اس صداقت خیال کے لیے دل کو کڑے کوس طے کرنا پڑتے ہیں۔ ذہنی طور پر یہ کیفیت عذابِ الیم کے مترادف ہے۔

ے ہاتھ دھو دل سے یہی گرمی گر اندیشے میں ہے
آبگینہ تندیٔ صہبا سے پگھلا جائے ہے

ے ہجومِ فکر سے دل مثل موج لرزے ہے
کہ شیشہ نازک و صہبائے آبگینہ گداز

ے درد دل لکھوں کب تک جاؤں ان کو دکھلا دوں
انگلیاں فگار اپنی خامہ خونچکاں اپنا!

جگر کاوی کے یہی مراحل ارسطو کے الفاظ میں Catharisis ہیں۔ اگلا مقالہ اورنٹیئل کالج میگزین کا ضمیمہ ہے۔ عربک اینڈ پرشین سوسائٹی پنجاب یونیورسٹی لاہور کی طرف سے شائع ہوا۔ یہ ضمیمہ اس سوسائٹی کے ممبروں اور خریدارانِ ضمیمہ میں تقسیم ہوتا تھا۔ اِس ضمیمے میں جو مئی ۱۹۲۸ء میں شائع ہوا۔ ڈاکٹر وحید قریشی کا تنقیدی مضمون مرزا محمد حسن قتیل شائع ہوا۔ جس کا صفحہ نمبر ا تا ۴۲ پر مشتمل ہونا فہرستِ مضامین میں ظاہر کر دیا گیا ہے۔ اِس فہرست میں پہلے نمبر پر ڈاکٹر وحید قریشی کا مذکورہ بالا مضمون شامل ہے جبکہ دوسرا مضمون دیوانِ خواجو (مسلسل) از پروفیسر تاج محمد خان ہے۔

ڈاکٹر وحید قریشی کا ''مرزا محمد حسین قتیل'' بنیادی طور پر تحقیقی مضمون ہے لیکن تحقیق کے ساتھ ساتھ تنقیدی بصیرت بھی موجود ہے۔ یوں بھی ایک باشعور محقق اور صاحبِ بصیرت نقاد ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ اِس مضمون میں ڈاکٹر وحید قریشی نے پنجاب یونیورسٹی میں موجود مرزا محمد حسن قتیل کے قلمی نسخے پر بنیاد رکھ کر ان پر اپنے تنقیدی و تحقیقی مضمون کی عمارت کھڑی کی ہے۔ ان کی تحقیق کے مطابق قتیل کا ابتدائی نام دیوالی سنگھ تھا اور ان کے آباؤ اجداد کی بود و باش بٹالہ میں تھی۔ وہ پنجابی تھے۔ بعد ازاں باغپت میں مقیم ہو گئے۔ قتیل کے والد درگاہی مل دہلی نواب ہدایت علی خان کی سرکار میں ملازم ہوئے۔ دہلی کی مضافاتی بستی میں قتیل پیدا ہوئے۔

ڈاکٹر وحید قریشی نے قتیل کے بارے میں ساری تحقیق ہجری سن کے حوالے سے کی ہے۔ قتیل فارسی شاعر تھا۔ اس نے مرزا باقر شہید اصفہانی سے اٹھارہ سال کی عمر تک صرف، نحو، منطق، معنی و بیاں، بدیع و ریاضی، عروضِ عربی و فارسی میں مکمل دسترس حاصل کی۔ ان کی تعلیم کا یہ زمانہ سیاسی لحاظ سے نواب شجاع الدولہ کا زمانہ تھا۔ قتیل نے چودہ سال کی عمر میں اسلام قبول کیا۔ ان کا اسلامی نام محمد حسن رکھا گیا اور اپنے استاد کے مسلک یعنی شیعہ فرقے سے اپنا ناتا جوڑا۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے قتیل کے اس مسلک کی ایک نفسیاتی توجیہہ اس کے رجحانات اور شاعرانہ میلانات میں تلاش کی ہے، فرماتے ہیں:

> قتیل کی شاعری میں جو چیز سب سے زیادہ پڑھنے والے کو متوجہ کرتی ہے۔ وہ ہے اس کا سرخ رنگ کا احساس۔ غزلوں پر غزلیں پڑھتے جایئے آپ کے ذہن میں جو آخری تاثر قائم ہوتا ہے وہ سرخی کا ہے۔۔۔۔۔ سرخی کا یہ احساس اور خون کا تصور اور اس کے متعلقات سے یہ لگاؤ مجرمانہ شخصیت سے مختلف ہے۔ Guilt Complex میں احساس دوہرا ہوتا ہے۔ خوف اور نفرت بیک وقت دونوں کی عملداری ہوتی ہے۔ جہاں خون اور اس سے متعلقہ احساسات کارفرما ہوتے ہیں۔ مرض میں ایک وحشت، خوف اور نفرت کی کشمکش شروع ہو جاتی ہے جس کا وہ اظہار کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ لیکن قتیل میں خون کے ساتھ پیار اور اس سے یک گونہ لذت وسکوں یابی کا استنباط حیرت انگیز حد تک اس کی مساکیت کا آئینہ دار ہے۔ اس کا ذہن قتل کرنے کے تصور سے گریزاں ہے تو ہو لیکن قتل ہونے اور قتل کر دیے جانے کے جذبے سے خالی نہیں۔۔۔۔۔ اس کا تخلص قتیل بھی بہت کچھ اس کی ذات کا آئینہ ہے اور شیعیت کی طرف اس کا رجحان بھی ہمیں اس طرح کی ذہنی خود آزاری اور ایذا طلبی کا مظہر معلوم ہوتا ہے۔ [۱۱]

بہرحال یہ درد و کسک ایک نفسی و طبعی رجحان بن کر قتیل کے فارسی کلام میں جاری و ساری ہے۔ وہ نثر میں درباری زندگی پر بے لاگ تبصرے کرتا ہے اور معاصرین پر با آواز بلند تنقید کرتا ہے۔

اپنی نفسیاتی الجھنوں کے سبب وہ آہستہ آہستہ زندگی کی رنگینیوں اور دلچسپیوں سے گریزاں ہوتا

چلا گیا۔ قتیل کی تصانیف کے ضمن میں ڈاکٹر وحید قریشی نے بڑی جاں کاوی کا ثبوت دیا ہے اور اس کے قلمی نسخوں تک رسائی حاصل کی ہے۔ قتیل کی تصنیفات مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ شجرۃ الامانی۔ اِس کے مختلف نسخے مندرجہ ذیل ہیں۔

(ا) قلمی نسخے

۱۔ ریو صفحہ ۷۹۴ حصہ دوم ورق ۲۱ تا ۳۴۔

۲۔ ریو صفحہ ۷۵۷ ایک نسخہ مع قتیل کی دوسری کتابوں کے یہ معاصر نسخہ ہے جو ۱۲۲۹ ہجری میں لکھا گیا۔

۳۔ ریو صفحہ ۱۰۴۳ حصہ دوم ورق ۱۳ تا ۳۴۔

۴۔ لالہ بھوانی داس کے ہاتھ کا لکھا ہوا نسخہ عبدالمالک صاحب آروی کے کتب خانے میں ہے جو ۱۱ جمادی الثانی ۱۲۳۹ ہجری میں لکھا گیا۔

ب۔ مطبوعہ نسخے

۱۔ آزاد کلکشن کا مطبوعہ نسخہ ۱۲۶۷ ہجری پنجاب یونیورسٹی لائبریری۔

۲۔ کانپور ۱۲۸۲ ہجری۔

۳۔ کانپور ۱۲۸۹ ہجری۔

دیوان قتیل

۱۔ بانکی پور جلد سوم صفحہ ۲۶۲ تا ۲۶۳

تیرہویں صدی کا قلمی نسخہ،

۲۔ بانکی پور جلد سوم صفحہ ۴۳۵

تیرہویں صدی کا قلمی نسخہ اچھے نستعلیق میں لکھا ہوا آب ذدہ ترتیب و مواد کے اعتبار سے بالکل اوپر کے نسخے کی طرح ہے۔

۳۔ ریو صفحہ ۷۲۶

ذی الحجہ ۱۲۳۳ ہجری کا قلمی نسخہ نستعلیق

بود برقی دگر در جلوہ ہا جانانہ مارا

۴۔ پنجاب یونیورسٹی لائبریری، قلمی نسخہ نمبر ۱۴۸۔ یہ نسخہ ۲۰ مارچ ۱۹۱۶ء کو پنجاب یونیورسٹی نے خریدا۔ اس میں دو دیوان شامل ہیں۔ جو ایک ہی ہاتھ کے لکھے ہوئے ہیں۔ دیوان کے علاوہ نہر الفصاحت، چار شربت، رقعات، مظہر العجائب، دریائے لطافت ہفت تماشا، معدن الفوائد، ثمرات البدائع، دیباچۂ دیوانِ تمنا، قانونِ مجدد، فرمانِ جعفری (یہ کتاب ڈاکٹر وحید قریشی کے مطابق نہ کسی کیٹیلاگ میں موجود ہے نہ لائبریری میں) البتہ اس کتاب کا تذکرہ خود قتیل نے ثمرات البدائع میں اپنے دیوان کے ساتھ کیا ہے۔ مظہر العجائب کے شائع شدہ خاتمے میں ماخذ کا ذکر کرتے ہوئے قتیل کے دو افسانوں کا ذکر بھی کرتا ہے۔ لیکن جن واقعات کا تذکرہ ہے۔ ان کا ذکر اس سے قبل ثمرات البدائع میں موجود ہیں۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے فٹ نوٹ میں یہ تصریح بھی کی ہے کہ قتیل کی بعض کتابیں شیرانی کلیکشن پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں بھی ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کا اگلا وقیع مقالہ خسرو کا نظریۂ اسلوب اورینٹیل کالج میگزین، ماہ نومبر ۱۹۵۰ میں شائع ہوا۔ ڈاکٹر وحید قریشی کا یہ مضمون روایت پسندی مگر جدت طرازی کا شاہکار ہے۔ اس مضمون میں انہوں نے ابتداً ہی میں واضح کر دیا ہے کہ الفاظ اور معنی کو جدا جدا رکھنے کا رجحان ختم ہونا چاہیے۔ وہ اپنی تنقید میں بھی الفاظ و معنی کو لباس اور جسم قرار دینے کے حامی نہیں۔ بلکہ الفاظ و معانی کے جدا کیمپ بنانے کے تصور کو فارسی پر عربی کے اثرات کا نتیجہ سمجھتے ہیں اور حقیقت میں یہ ان کی بلند نظری اور مطالعے کا عمق ہے۔ وہ عربی روایت، انگلستان کی ادبی مشکل پسندی کے رجحان اور فارسی کے پُرشکوہ میلانات کی جڑیں ان مختلف معاشروں کے ماضی اور تاریخ میں تلاش کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں عربی خطابت نے زبان میں الفاظ کی گھن گرج اور تاثیر کے جذبے کو نمایاں کیا۔ انگلستان میں پڑھنے کے رواج نے الفاظ اور معنی کو الگ الگ نہ ہونے دیا۔ جب کہ فارسی زبان درباری شان و شکوہ کو الفاظ میں منتقل کرتا رہا۔ شاہ پرستی کا ایرانی تصور ادب میں بھی زبان کے نقوش کو بدلنے میں کامیاب ہو گیا اور اسلوب کے نظریے نے وہ رخ بدلا جو خسرو تک پہنچ کر وہ ہو گیا کہ صنعت پرستی کے رجحان نے فروغ پایا۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے خسرو کے زمانے تک صنعت گری کے رجحان کو ایک باقاعدہ روش کا درجہ دیا

ہے جو ایک ایسا رواج قرار پا گئی کہ ہندوستان، ایران اور توران کے ادیب اس میں الجھے رہے اور علم بیان کو مزید فروغ حاصل ہوتا رہا۔ Rhetoric اسی کا پھیلاؤ ہے۔

ہے ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

جہاں ایک بندھے ٹکے راستے پر سفر کے بجائے نثر کی دو واضح قسمیں وجود میں آ چکی ہوں اور پڑھنے والے اس امتیاز کو سمجھنے اور محسوس کرنے لگیں تو یہ علامت ہے کہ اب دونوں اسلوب یا تو ساتھ ساتھ چلیں گے یا پھر ایک پر دوسرا غالب آ کر پہلے کو ختم کر ڈالے گا۔ ادبی تحریکیں بھی اسی طرح ایک دوسرے کا ردعمل ثابت ہوا کرتی ہیں۔ تاریخی روایات کے گہرے مطالعے کے بعد ڈاکٹر وحید قریشی ''خسرو کے نظریہ اسلوب'' کو متعین کرتے ہیں۔ اگرچہ اس دور میں ادیب ہیئت پر مواد کی فوقیت کا ذکر کر رہے تھے اور اس پھیلاؤ سے بچنے کی تلقین کرتے تھے۔ لیکن خود بھی اس میلان سے چھٹکارا نہیں پا سکتے تھے۔ کیونکہ وہ اسلوب کو ایک سوچے سمجھے طریقہ اظہار کے علاوہ طریقۂ خطاب بھی تسلیم کرتے تھے۔ ان کے ہاں بھی معانی اور الفاظ کو دو مادی وجود قرار دینے کا رجحان موجود تھا اور یہ ایک ایسا خطرناک رجحان ہے جس کے مطابق مواد کو مٹی کی کوئی مادی چیز تصور کر لیا جاتا ہے۔ جسے شاعر ادیب ایک معمار کی طرح شکل عطا کرتے ہیں۔ اس طرح معانی اور الفاظ کا بنیادی رابطہ اپنی اہمیت کھو دیتا ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی خود چونکہ اسی اسلوب کے قائل ہیں اور خود اپنی نثری تخلیقات میں سادہ اور رواں اسلوب اپناتے ہیں۔ یوں بھی ایک نقاد کی تنقید لفظوں کے الٹ پھیر اور پیچاک میں الجھے بغیر اپنے مطالب و مقاصد حاصل کر لیتی ہے۔ جب کہ زبان اظہار کا واضح ترین وسیلہ ہے۔ اگر یہ اپنے جوہر یعنی اظہار کو پسِ پشت ڈال دے تو یہ صرف دوسروں کو دھوکا دینے کے مترادف ہے۔ کیونکہ لوگ ادب پاروں کو محض رعایت لفظی کی خوشنما ترکیبوں اور جمالیاتی قدروں کے فروغ کا آلہ سمجھنے لگتے ہیں۔ یہی حال خسرو کے عہد میں ہمیں نظر آتا ہے۔ درس گاہوں میں پڑھایا جانے والا نصاب بھی اس سے مبرا نہ تھا اور اس دور میں طلبا کو مقامات حریری زبانی یاد کرائی جاتی تھی۔ اس دور کا معاصر ایرانی ادب ہندوستانی پر سیاسی حالات کی وجہ سے اثر پذیر نہیں ہو رہا تھا بلکہ منگولی دور میں خود فارسی ادب کے میلانات تبدیل ہو رہے تھے۔ خسرو کی افتادِ طبع کے ضمن میں ڈاکٹر وحید قریشی ان کی نفسیات اور طبیعت کے رجحانات کی بات کرتے ہوئے ان کی

انفرادیت کو بنیادی وجہ بناتے ہیں۔ وہ روشِ عام سے ہٹ کر چلنے کے عادی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے اسلوب کی آرائش و زیبائش کے لیے کوشاں ہیں۔ وہ مفردات اور مرکبات کی منطقی توجیہہ پیش کرتے ہیں اور لفظی رعایتوں کو اپنی عبارت کے لیے ناگزیر خیال کرتے ہیں علاوہ ازیں وہ اپنی ذات اور کلام کی مقبولیت کے خواہاں تھے۔ اپنی وضع برقرار رکھنا چاہتے تھے۔ نثر میں لفظی جلال و جمال ہی اس مقصد کو پانے کا واحد راستہ تھا۔ نثر کے علاوہ نظم میں بھی خسرو نے لفظوں کی ظاہری ساخت کو اجاگر کرنے والی صنعتوں سے کام لیا۔ مثلاً تجنیس، ترصیع، تصحیف اور توشیخ وغیرہ۔ وہ لفظوں کو معنی کا لباس خیال کرتے ہیں۔ یوں تشبیہات و استعارات سے اپنے فن کی آراستگی کر کے ایک ایسا راستہ اپناتے ہیں جس میں ایک طرح کی فنی بے اعتدالی کا راستہ کھل جاتا ہے اور عبارت کی سطحی آرائش ادیب کا مقصد بن جاتی ہے۔ فن برائے فن کا نظریہ فروغ پاتا ہے۔ امیر خسرو کے ہاں بھی ایسے الفاظ کا استعمال پایا جاتا ہے۔ جس کے کثیر مترادفات موجود ہوں۔ تاکہ زیادہ سے زیادہ عبارت آرائی کا امکان پیدا کیا جا سکے اور ذہنی قوتوں کو اظہار کے کئی مواقع میسر آ سکیں۔ ڈاکٹر وحید قریشی خسرو کے اس رجحان پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> خسرو کے ہاں لکھتے وقت دو مختلف (Mental processes) کام کرتے ہیں۔ انفرادیت کا یہ ایک ایسا غلط استعمال ہے جس کی ہم کسی صورت تعریف نہیں کر سکتے۔ ایک ادیب جہاں اپنے عہد اور بعد کی نسلوں کو متاثر کرتا ہے وہاں وہ اپنے ماحول اور قبل کے دور کا غلام بھی ہوتا ہے۔ اس لیے ہم امیر کو بُرا بھلا نہیں کہہ سکتے۔ وہ جس ماحول میں پروان چڑھے اس میں انفرادیت کا ایسا کھوکھلا اظہار ہی ممکن تھا۔ خسرو باوجودیکہ اسلوب کے صحیح تصور کا احساس خفی رکھتے تھے ادب کے دھارے کا رخ نہ موڑ سکے اور فصاحت و بلاغت اور صنائع بدائع کے انہیں تصورات کا سہارا لینے پر مجبور ہوئے جنھوں نے فارسی نثر کو متواتر ایک ہزار سال تک ایک ہی انداز پر بہائے لیے جانے کی قسم کھا رکھی تھی۔ ۱۲

ان مقالات میں آخری مقالہ ''اردو کے جدید تر شعرا'' کے عنوان سے ہے۔ اس مضمون میں ڈاکٹر وحید قریشی نے قدیم و جدید کی آویزش اور روایت کی تغیر پذیری کو موضوع بنایا ہے۔ اردو شاعری کے ان پنہاں

گوشوں کو نمایاں کیا ہے۔ جو تاریخ اور وقت کے دھاروں میں بہتے ہوئے مستقبل کے سمندر میں جا گرتے ہیں۔

اُردو شاعری میں نوعیت واقعات بدلنے سے تصورِ غم نے کیا کیا رُوپ بدلے ہیں اور کون کون سی شکلیں اختیار کی ہیں۔ڈاکٹر وحید قریشی نے اپنی تنقید میں ان امور کا جائزہ بھی لیا ہے۔قنوطیت کی اس کہنہ روایت نے کبھی شاعروں کی ذہنی و نفسی وارداتوں کی حیثیت حاصل کی اور کبھی غم دوراں کا لبادہ اوڑھا۔قنوطیت کی اس وراثت نے کبھی سیاسی حالات کی پیچیدگی کا اثر قبول کیا اور کبھی کرب اور جھنجھلاہٹ کی صدا بن کر نظموں میں ظاہر ہوا۔ اگر اس غم میں اعصاب زدگی نہ ہو اور یہ ٹھہراؤ اور توازن پیدا کرے تو ادب کی ایک اہم قدر بن کر ابھر سکتا ہے۔لیکن اعصابی بحران کی شکل اختیار کر لے تو مریضانہ اندازِ نظر کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

اس مضمون میں چند نئے اور ترقی پسند رجحانات رکھنے والے شاعروں کا ذکر ملتا ہے جن میں مختار صدیقی، یوسف ظفر، قتیل شفائی، ساحر لدھیانوی، ظہیر کاشمیری، ضیا جالندھری، فکر تونسوی کے کلام اور فن کا تجزیہ موجود ہے۔ ان شعرأ نے قدیم و جدید کی آمیزش سے روایت کے سرمائے کو ایک نئے قالب میں ڈھالا ہے۔ ان کے کلام کا تجزیہ کرتے ہوئے ڈاکٹر وحید قریشی نے سماجی و عمرانی تنقید کے اصولوں کو برتا ہے۔ ان شعرأ کے کلام کو سیاسی تناظر میں دیکھا ہے اور دوسری جنگ عظیم سے پیدا ہونے والی سماجی و معاشرتی صورت حال کو اس کا پسِ منظر بتایا ہے۔ یہ کلام شعوری نظام کی بنیاد پر قائم ہے اور اس نظام کی بدولت اس شاعری میں توازن موجود ہے۔ نئے ماحول میں نئی شعری روایات کو استعمال کر کے نئے شعری سانچے تیار کیے گئے۔ جذبات کے اظہار میں ''تلازمۂ خیال'' کے ذریعے نئے شعری پیمانے تیار کیے گئے۔ یہاں جذبات کی عقلی ترتیب اور تسلسل کو مدنظر رکھا گیا۔ دوسری عالمگیر جنگ دور انحطاط سہی۔ لیکن اس دور میں بھی چند نئے شاعر ابھر آئے۔ جنہوں نے اپنے لیے نئے منفرد راستے اپنائے۔ نئی امیجری اُبھری اور اظہار کے نئے اسالیب نے پرانے اندازِ فکر و نظر کو بدل کر رکھ دیا۔ حالات اور قریبی ماحول بڑی تیزی سے بدلنا شروع ہوا۔ صوتی بصری اور رسمی Imagery کے رنگ روپ بدل گئے۔

یہ بات خاص طور پر غور طلب ہے کہ ہار، جیت ہی کے رجحان نے قوتِ باصرہ کی اس قلم کاری کو فروغ دیا ہے۔ یہ راشد اور فیض کا دور تھا۔ جس نے روشنی اور تاریکی کی چپقلش سے بڑے سنسنی خیز مناظر تخلیق کیے۔ کیا یہ جسم میں گہری دلچسپی لینے کا نتیجہ تو نہیں۔ اگر ایسا ہے تو روشنی اور تاریکی کا ہار، جیت سے تعلق بدیہی بات

ہے۔ براہ راست اس شعوری نظام کا اثر یہ تھا کہ راشدؔ و فیضؔ کے دور میں ہمیں پہلی دفعہ تجزیاتی انداز نظر (Analylitical out look) ملا۔۔۔ تجزیہ احساس، جذبے یا شعور کی نبض پر ہاتھ رکھ کر ایک ایک دھڑکن کو اس طرح پیش کرنا ہے۔ کہ وحدت نمایاں ہو جائے یعنی ایک موڈ کا مکمل اظہار ہو جائے۔

ڈاکٹر صاحب سب سے پہلے مختار صدیقی کے کلام کا تجزیہ کرتے ہیں۔ جن کے دور میں ہندی آمیز اُردو کی داغ بیل پڑی۔ یہ نیا اسلوب بیان ان کے کلام کو کھردری سی سطح عطا کرتا ہے۔ لیکن روایت کے گہرے مطالعے نے ان کے کلام کو کامیابی سے ہمکنار کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ مختار صدیقی قیوم نظر اور ان کے عہد کے دیگر کئی شعرأ نے میرؔ کے رنگ میں نیا رنگِ تغزل اپنانے اور رائج کرنے کی کوشش کی ہے۔ میرؔ کے اثر نے مختار صدیقی کے کلام کو آفاقی رنگ عطا کرنے کے علاوہ ان کے احساسات و جذبات کو عمومی رنگ بھی دیا ہے۔ لیکن اس کوشش میں مختار صدیقی کی انفرادیت کا رنگ پھیکا پڑ گیا ہے۔

شاعری میں مختار صدیقی کا اصل کارنامہ جو ڈاکٹر وحید قریشی نے بحیثیت نقاد اس مضمون میں دریافت کیا ہے۔ وہ قدیم راگوں کا شعری جامہ ہے۔ انہوں نے عروض کو موسیقی سے اخذ کر کے نیا آہنگ دینے کی کوشش کی ہے۔ اس طرح موسیقی اور شاعری کو ایک دوسرے کے قریب لانے کی کوشش کامیاب ثابت ہوئی ہے۔ اس ضمن میں خیال، درباری، بلمپت، خیال چھایا، میں اصوات کا زیر و بم تخیلی تجربے کی شکل میں شعر کی صورت اختیار کرتا چلا جاتا ہے۔

فکر تونسوی اپنی شاعری میں براہ راست اقبال سے اثرات قبول کرتے نظر آتے ہیں اور ڈاکٹر وحید قریشی نے اس اثر پذیری کو انسانیت کی بقا اور فلسفیانہ سوچ کا ایک انداز قرار دیا ہے۔ جو فکرِ ذات اور قلندرانہ تفکرات کا پتہ دیتا ہے۔ ان کی تراکیب میں حرکت کا تصور زندگی کے متحرک نظریے کو پیش کرتا ہے۔ ان کی پیش کردہ تشبیہات کنائے اور استعارے فطرت سے لیے گئے ہیں۔ اسی لیے ان میں زندگی اور حرکت موجود ہے۔ یہ کلام میں بھی توانائی اور تابندگی پیدا کرتے نظر آتے ہیں۔ فکر تونسوی کی علیحدہ جذباتی دنیا آباد ہے۔ کن، اپنی پوجا، نیند، سوئمبر، برہمچاری، خلوص، جینئس اور مہرے ان کی اچھی نظمیں ہیں۔

ضیا جالندھری کی شاعری کو ڈاکٹر وحید قریشی نے حلقۂ اربابِ ذوق اور گورنمنٹ کالج لاہور کی تربیت کا

اثر قرار دیا ہے۔ ان کے کلام پر ایذرا پاؤنڈ کا اثر بھی موجود ہے۔ شام کے منظر کو ان کے کلام میں خاص اہمیت حاصل ہے۔ شام اور رات کا دھند لکا ان میں خوف اور جمود کے تاثر کو جنم دیتا ہے۔ جب کہ چاندنی رات انہیں اپنی ذات کی عریانی اور کشمکش کا شعور کرتی ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی کے تجزیے کے مطابق ضیا جالندھری کی نظم ''زمستاں کی شام'' ایک عہد آفریں نظم ہے۔ اس میں اختتام تک ایک مرکزی کردار ہے۔ وہ غیر شعوری طور پر ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ سے متاثر دکھائی دیتے ہیں۔ ظہیر کاشمیری شاعری کے علاوہ تنقید کے میدان میں بھی نمایاں دکھائی دیتے ہیں۔ یہاں خود ڈاکٹر وحید قریشی نے اپنا نظریۂ تنقید بھی واضح کیا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے شاعر کے لیے تنقیدی بصیرت کا ہونا اس کی کامیابی کی دلیل قرار دیا ہے۔ ویسے بھی آج کا نقاد ہیئت کو مواد کے تابع قرار دیتا ہے۔ اب شاعری کا عمل خود شاعر کے ذہنی عمل کے ماتحت ہے۔ ظہیر کاشمیری نے لفظوں کے ڈرامائی اور صوتی تاثر سے بھرپور کام لیا ہے۔ وہ ایک خاص طرزِ استدلال سے مناظر کی زمین ہموار کرتے ہیں اور پھر انہیں جذباتی رنگِ نو عطا کرتے ہیں اور اپنی فنی چابک دستی کی بدولت پامال موضوعات کو نیا پن عطا کرتے ہیں۔ ان کے ہاں مہیب اور پر اسرار کیفیت پیش کرنا حقائق کو روحانی اور ارفع بنانے کا ذریعہ ہیں۔ وہ تاریخی شعور رکھتے ہوئے اپنی نظموں میں ایسی فضا قائم کر لیتے ہیں۔ جو مغل کلچر سے ہم آہنگ نظر آتی ہے۔ مغل فن تعمیر سے لگاؤ کی وجہ سے ان کی نظموں میں ایوان، طاق، سفالے جھروکے، اور زمرد کے جلوخانے میں تصویریں ابھرتی ہیں۔ بین الاقوامیت، قانون، فرد اور ریاست، آدم، ظہیر کی بلند پایہ نظمیں ہیں۔ ڈاکٹر وحید قریشی ظہیر کاشمیری کو مغل کلچر میں دلچسپی کی وجہ سے دوسروں سے جداگانہ انداز کا حامل شاعر قرار دیتے ہیں۔

قتیل شفائی کی نظم میں ڈاکٹر وحید قریشی کو ایک بڑا شاعر بننے کے تمام امکانات نظر آتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے اس تجزیے کو وقت نے ثابت بھی کیا اور قتیل شفائی نے ایک عظیم نظم گو اور گیت نگار کے طور پر شہرت حاصل کی۔ ان کے کلام میں ان کی ادبی انفرادیت کے واضح اشارے موجود ہیں۔

ساحر لدھیانوی کی تلخیاں، رومان اور حقیقت کے مابین کشمکش ہے۔ ان کے ہاں رومانی تخیل کے باوصف اندازِ نظر کی گہرائی اور پیچیدگی موجود ہے۔ ان کے کلام میں منطقی تسلسل و ترتیب موجود ہے۔

ڈاکٹر وحید قریشی کے یہ جائزے ان کے تنقیدی شعور کا ارتقا بھی ہیں اور فکر و خیال کی گہرائی کا موجب بھی۔ اسی اندازِ نظر کی بدولت وہ ان نقادانِ ادب میں شامل ہیں۔ جو کسی خاص گروہ، دبستان یا مسلک کا جزو

بنکر خود کو محدود نہیں کر لیتے بلکہ ہر طرح کے نئے افکار کے لیے اپنے ذہن کے دریچے وا رکھتے ہیں اور ہر نئے نظریے کو فراخ دلی سے قبول کرتے ہیں۔ اسی ردو قبول میں ان کی تنقیدی عظمت کا راز مضمر ہے۔

تنقیدی اعتبار سے ڈاکٹر وحید قریشی کی ایک اور تصنیف جو نہایت اعلیٰ تنقیدی بصیرت کی حامل ہے وہ ہے 'جدیدیت کی تلاش میں' یہ مجموعہ ۲۶ مضامین پر مبنی ہے۔ ان مضامین میں ہر جدت پسند شاعر کے کلام پر روشنی ڈالی گئی ہے اور اس کے کلام کو موضوع بنا کر اس کا فنی و فکری تجزیہ کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی تنقید نے جہاں ادبی و لسانی روایات کو مد نظر رکھا ہے۔ وہاں سماجی ردعمل اور تحریکوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ بلکہ ہر طرح کے محرکات کا تجزیہ بڑی ہمہ گیر حیثیت سے کیا گیا ہے۔ ''جدیدیت کی تلاش میں'' مقبول اکیڈمی لاہور نے ۱۹۹۰ء میں شائع کی۔

اس ضمن میں سب سے پہلا شاعر نظیر اکبر آبادی ہے۔ جسے جدیدیت کا پیش رو کہہ کر ڈاکٹر صاحب نے ایک نئے تنقیدی مباحثے کی بنیاد رکھی ہے۔ نظیر نے ان بنے بنائے سانچوں سے بہت کم کام لیا۔ جو اُردو شاعری کی روایت کا حصہ بن چکے تھے۔ نظیر نے مقامی اثرات پر زور دیا۔ اپنے نظام فکر کی بدولت شعری سانچے دریافت کیے اور مادی شکلوں کی مصوری کے ذریعے انہوں نے خدا اور کائنات کے بارے میں روحانی واخلاقی مسائل کو پیش کیا۔ نظیر اور ان کے بعد دیگر شعرا کا نفسیاتی و ذہنی تقابل کرتے ہوئے ڈاکٹر وحید قریشی فرماتے ہیں:

> نظیر معیار پرست نہ تھے۔ شیفتہ اور ان کے رفقا معیار پرست تھے۔ یہیں آ کر نظیر اور شیفتہ، نظیر اور غالب، نظیر اور مومن کا فرق رونما ہوتا ہے۔ ان شعرا نے حیات و کائنات کو ایک خاص معیار سے دیکھا ہے۔ اس کے حوالے سے فلسفیانہ تصورات کا ایک طویل سلسلہ ان کی شاعری اور افکار میں گندھا ہوا پایا جاتا ہے۔ وہ فکری طور پر اپنی فلسفیانہ آدرش کے دستِ نگر ہیں جو اسی مجلسی تربیت کا نتیجہ ہے۔ جس میں یہ لوگ رہتے بستے تھے۔ اس کے مقابلے میں نظیر کا تعلق نئی نسل سے تھا۔۔۔ نظیر اکبر آبادی کے عمومی موضوعات زبان کے بارے میں ان کے رویے اور شعری روایات سے بغاوت نے اصلاح پسندوں کی نئی کھیپ کو بہت متاثر کیا۔[۱۳]

گویا نظیر نے شعری سرمائے میں نئی زبان، نئے لہجے اور موضوعات کی بنیاد رکھی۔ انہوں نے مواد اور زبان دونوں کو مدنظر رکھا۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے اظہار و بیاں اور طریق کار دونوں اعتبار سے نظیر اکبر آبادی کے ہاں جدت تلاش کی ہے۔

نظیر اکبر آبادی کے کلام کے غائر مطالعے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ نظیر کا ذخیرہ الفاظ سب سے زیادہ ہے۔ ان کے موضوعات میں تنوع اور رنگا رنگی پائی جاتی ہے۔ اگرچہ وہ مادی اور حقیقت پسندانہ تصورات رکھتے ہیں۔ لیکن زندگی کے بارے میں صوفیانہ مسلک اپناتے ہیں اور اخلاقی قدروں اور انسانی رویوں کے بارے میں مثبت پہلوؤں پر زور دیتے ہیں۔ وہ چابکدستی سے اپنے فن کو مصرعوں میں منتقل کرتے ہیں۔ ان کے موضوعات، زبان و بیان کے مروجہ اور مقررہ تنگنائے میں نہیں سماتے۔ اس لیے وہ زبان و بیان کے نئے سانچے دریافت کرتے ہیں۔ اسی میں ان کی فنی عظمت اور جدت کا راز پوشیدہ ہے۔

زبان و بیان کے سانچوں کے تذکرے میں جب جدت لفظ آتا ہے تو نظیر اکبر آبادی کے بعد ڈاکٹر وحید قریشی کو اکبرالہٰ آبادی کی ظرافت میں زبان و بیان کی نت نئی صورتیں متشکل ہوتی نظر آتی ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ الفاظ کے ذریعے معنی آفرینی نے اکبر کے ہاں رعایت لفظی اور ایہام کا لبادہ اوڑھا۔ اگرچہ یہ صنعت گری تھی۔ لیکن تخلیقی اپج سے مالا مال تھی۔

کیونکہ ان کے ہاں مطالب کو بنیادی اور لفظوں کو ثانوی حیثیت تھی اور یہی خصوصیت انہیں اہل لکھنؤ سے ممتاز کرتی ہے۔ ان کی بظاہر ہلکی پھلکی ظرافت اتنی ہلکی نہیں بلکہ ان کے پسِ پشت گہرے اور پیچیدہ اثرات کارفرما ہیں۔ ان کے کلام میں رعایتِ لفظی تو ضرور ہے لیکن ڈاکٹر وحید قریشی انہیں ان معنوں میں جدید کہتے ہیں کہ اکبرالہٰ آبادی نے بنی بنائی مروج زبان کے سانچوں کو توڑ پھوڑ کر نئی لسانیات تشکیل دی اس کے نتیجے میں جو لفظی و معنوی گہرائی پیدا ہوتی ہے۔ اس کی بدولت مطالب کو بنیادی لیکن الفاظ کو ثانوی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔ اکبر کا نام اودھ پنچ کے نامہ نگاروں میں شامل رہا اور اس تحریک کے دیگر ذہنی رجحانات سے بھی اکبر متاثر تھے۔ معاشرتی زندگی اور سیاسی کوائف کے بیانات میں اکبر نے اپنے جذبات و ہیجانات کا بھرپور اظہار کیا۔ اس کے ساتھ سرسید تحریک کے بعض رجحانات کو بھی داخلی طور پر قبول کیا۔ لیکن اکبر بعض عوامل کو صرف خارجی طور پر قابل قبول نہیں سمجھتے تھے۔ مثلاً مذہب کے عمل کو شدت سے اساسی حیثیت دیتے ہیں۔ اس کا

مطلب یہ نہیں کہ اکبر رجعت پسند ہیں۔ وہ سرسید تحریک کے بعض بنیادی رویوں سے متفق نہیں۔

اکبر کو خاص طور پر سرسید کے مذہبی نظریات سے اختلاف ہے۔ سرسید کے ساتھیوں کو بھی ان کے مذہبی نظریات سے اتفاق نہ تھا۔ اکبر کے اندیشے کبھی غلط ثابت نہ ہوئے۔ اکبر نے اپنی ظرافت نگاری میں ان خدشات کا واضح اظہار کیا تھا۔ وہ اپنی شاعری میں انسانی زندگی کی ناہمواریوں، افعال اور افکار کے تضادات کو پیش کرتے ہیں۔ ان کے پائے کا طنز نگار ابھی تک اردو شاعری میں سامنے نہیں آیا۔

اگلا مضمون مولانا محمد علی جوہر کی شاعری ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی کہتے ہیں کہ دیوانِ جوہر دیکھتے ہوئے حسرؔت موہانی اور اقبال کا خیال ضرور آتا ہے۔ لیکن مولانا محمد علی جوہر کے ہاں سیاسیات نظر نہیں آتی۔ بلکہ ان کی شاعری پر عاشقانہ رنگ گہرا ہے۔ ان کا بچپن داغ سے متاثر رہا۔ لیکن وہ زندگی سے فرار حاصل کرنے کے لیے شاعری نہیں کرتے۔ ان کی شاعری میں نرم اور دھیما انداز موجود ہے۔ توحید اور نبی پاک ﷺ سے محبت ان کے کلام و فکر کا بنیادی جوہر ہے۔

مضطر خیر آبادی کی شاعرانہ خصوصیات بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر وحید قریشی نے انہیں اپنے دور کا مقبول ترین شاعر قرار دیا۔ لیکن ان کا کلام دستبردِ زمانہ سے محفوظ نہ رہ سکا۔ ان کی حمد و نعت کا مجموعہ ''نذرِ خدا'' کے نام سے شائع ہوا۔

مضطر خیر آبادی تصوف کے موضوع کو اپناتے ہوئی خودی و بیخودی ساقی، میخانہ اور انا الحق کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ ان کا لہجہ نرم و ملائم ہے۔ لیکن ان کے ہاں موضوعات کی بہت وسعت موجود نہیں۔ ان کے بیان کردہ مطالب میں دلربائی کے بسیط مفاہیم اور پہلو موجود ہیں۔

اختر حیدر آبادی کی شہرت بحیثیت نظم نگار کے ہے۔ انہوں نے جس ماحول میں آنکھ کھولی وہ لسانی تشکیلات کا دور تھا۔ ان کی نظموں کا پہلا مجموعہ اسرار کے نام سے شائع ہوا۔ ان کے کلام میں بانکپن ہے اور شوخی وطراری بھی۔ مزدور اور سرمایہ دار، فلسفی اور عالم عصرِ حاضر کا انسان یہ مسائل ان کی شاعری میں بے حد اہمیت رکھتے ہیں۔ ان کے مجموعے میں 'منکرانِ خدا سے خطاب' بڑی اہم نظم ہے۔ ان کی کتاب نوائے مشرق ہمارے ادبی سرمائے میں اہم کتاب ہے۔ شاعر کے نزدیک اسلام ہماری معاشرتی زندگی کی بنیادی حقیقت ہے۔ اختر کی

شاعری میں عقیدے اور فن میں ہم آہنگی موجود ہے۔

ڈاکٹر وحید قریشی شعراء کے ان وسائل کو سراہتے ہیں جنہیں وہ شاعرانہ حسن و جمال کو برتنے کے لیے استعمال میں لاتے ہیں۔ ان کی تنقید کو سائنٹیفک کہا جاسکتا ہے کیونکہ وہ مختلف زاویوں سے ادب پاروں پر روشنی ڈالتے ہیں۔ جمالیات، نفسیات، عمرانیات اور تاریخ کسی پہلو کو نظرانداز نہیں کرتے اور اس طرح کسی شاعر کے فن کی قدر و قیمت متعین کرتے ہیں۔ جدیدیت کی تلاش میں ندرت میرٹھی کے کلام کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر صاحب ندرت میرٹھی کے لفظوں، محاورات اور مسلماتِ شاعری کے ذریعے عاشق کا انوکھا روپ پیش کرتے ہیں جس میں زندگی کے حقائق کا گہرا شعور تو نہیں لیکن عشق و محبت کے مروجہ مطالب پر قناعت کا رویہ موجود ہے۔

؎ یاد آئیں جس قدر ستم آرائیاں
اتنے ہی دل کے داغ اُبھرتے چلے گئے
ساقی نے بھی پلا کے سنبھالا ہمیں بہت
ہم بھی نشے میں اور بکھرتے چلے گئے

؎ جب چاہا اک اشارے سے مدہوش کر دیا
مجھ کو تری نگاہ نے مے نوش کر دیا

فاخر ہریانوی پر مضمون لکھتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے رومانوی تحریک کے جن مراحل کا ذکر کیا ہے وہ رومانی تحریک کے جذباتی اُتار چڑھاؤ کا پتہ دیتے ہیں۔ زندگی کے بارے میں فاخر ہریانوی کے خیالات ان کی شاعری میں ظاہر ہیں۔ ان کی نظموں میں زندگی کا مقصد نمایاں ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ فاخر نے مناظر فطرت کے بیان میں رومانی شاعر کا ذہن و دل استعمال کرتے ہوئے خارجی مناظر اور پرندوں پر نظمیں لکھیں۔

ملک منظور حسین منظور کی غزل گوئی اور نظم گوئی دونوں ہی لائق توجہ ہیں۔ انہوں نے غزلیات کا مجموعہ ''کیف دوام'' کے نام سے شائع کیا۔ وہ ایک خاص نظام اخلاق اور ضابطۂ حیات پر یقین رکھتے ہیں

اور اپنے عقائد کو جذباتی وارفتگی اور دیانت سے پیش کرتے ہیں۔ ان کی شاعری ناصحانہ سہی لیکن ڈرامائی انداز کی حامل ہے۔

ضمیر جعفری نے اُردو ادب میں ایک مزاح نگار کی حیثیت سے شہرت پائی لیکن مقامی عناصر نے ان کی شاعرانہ لسانیات کو نیاپن عطا کر دیا۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے اپنی اپج کی بدولت ضمیر جعفری کی مزاحیہ شاعری کی بجائے ان کی سنجیدہ اور صوفیانہ شاعری کو اپنے جائزے میں جگہ دی ہے:

؎ بڑا مشکل تھا ارباب غرض کی بھیڑ میں چلنا
خود اپنے آپ پر اپنے قدم رکھتا گیا ہوں میں

؎ ہم اگر دشتِ جنوں میں نہ غزل خواں ہوتے
شہر ہوتے بھی تو آواز کے زنداں ہوتے

عبدالحمید عدمؔ نے غزل کی اس وجد آفریں جادوگری کو اپنانے کی سعی کی اور اس کی نقش گری کو دورِ حاضر کے تقاضوں کے ہم آہنگ کر دیا۔

؎ ہمجولیوں کے ساتھ جوانی کی رات تھی
پھولوں کا تذکرہ تھا ستاروں کی بات تھی

اِن شعراء کے علاوہ ڈاکٹر وحید قریشی، نعیم صدیقی، حبیب جالب، طفیل ہوشیاری پوری، مخمور جالندھری، قتیل شفائی، مرزا محمد منور، الطاف پرواز، اکبر کاظمی، رفعت سلطان، راسخ عرفانی، سلیم گیلانی کی نعتیہ شاعری، عارف عبدالمتین، ڈاکٹر افضل اقبال، شہادت دہلوی کے کلام کا جائزہ لیتے ہیں۔ ان شعراء کے کلام میں انہیں قدیم میں جدیدیت کے امکانات نظر آتے ہیں۔

اسی کے ساتھ ساتھ جدیدیت کے آئینے میں وہ سید فیضی، مختار صدیقی، فکر تونسوی، ضیا جالندھری، ظہیر کاشمیری، قتیل شفائی، ساحر لدھیانوی، عاف عبدالمتین، مجید امجد، جابر علی سید، منیب الرحمٰن، عزیز حامد مدنی، کرشن موہن، جمیل واسطی، نریش کمار شاد، مبارک احمد، ناصر کاظمی، احمد راہی کو دیکھتے ہیں۔

افسانوی تنقید کی تاریخ گو مختصر نہیں لیکن قدیم ضرور ہے جس مصنف نے تخلیق کے میدان میں قدم رکھا۔ اس کے تنقیدی شعور نے ہی تخلیق کی راہ پر اس کی رہنمائی کی۔ تخلیق کا وجود ہی تنقید کے وصف کو اُجاگر کرتا ہے کیونکہ تنقید ہی باقاعدہ تخلیق کو منظم صورت میں پیش کرنے کے عمل کو اُجاگر کرتی ہے۔ ہر شے کی افادیت کے نقطۂ نظر سے شاعری کی اپنی اہمیت ہے۔ اس کا اپنا تہذیبی اور سماجی پسِ منظر ہے اور افسانے کے اپنے مخصوص امکانات ہیں۔ انہی مخصوص امکانات اور تہذیبی عوامل کا جائزہ ڈاکٹر وحید قریشی نے اپنی تحقیق و تنقید میں لیا ہے۔ ان کے مقالات کا مجموعہ ''افسانوی ادب'' ادب پاروں کے جائزوں پر مشتمل ہے۔ اس میں ۱۹۴۵ء سے ۱۹۸۶ء تک کے تحریر کردہ تنقیدی مضامین موجود ہیں۔ یہ کتاب پانچ حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ فورٹ ولیم کالج کے افسانوی ادب سے متعلق ہے۔ دوسرا حصہ ان ڈرامہ نویسوں کے بارے میں ہے جنہوں نے ڈرامے اور افسانے کو اپنا موضوع بنایا۔ ڈاکٹر وحید قریشی کے ان تنقیدی جائزوں کا خاص پہلو یہ ہے کہ ان میں دور سرسیّد کے بعد سے لے کر اب تک ادبی رجحانات کی عکاسی کی گئی ہے۔

تیسرے اور چوتھے حصے میں جدید افسانوی ادب کے دو اہم رجحانات کے حوالے سے پانچ افسانہ نگاروں کا تجزیہ پیش کیا ہے۔ یعنی ہمارے افسانہ نگاروں میں پائے جانے والے دیگر رجحانات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ پانچواں حصہ بے حد دلچسپ اور منفرد ہے کیونکہ یہ بچّوں کے افسانوی ادب سے متعلق ہے۔ یہ مقالات ڈاکٹر وحید قریشی کی ناقدانہ بصیرت کے غماز ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نقاد ہی نہیں محقق نقاد ہیں اور اسلوب بیان ایسا اپناتے ہیں کہ ان کی تحریر خشک بے جان تنقید بن کر نہیں رہ جاتی بلکہ اس میں علمی و ادبی چاشنی پائی جاتی ہے۔ اس منفرد اسلوب میں شعریت بھی ہے اور طنز و مزاح بھی۔ ''افسانوی ادب'' میں ڈاکٹر وحید قریشی کے اندازِ تنقید کا جائزہ لیتے ہوئے مرزا ادیب لکھتے ہیں:

> ڈاکٹر صاحب کا انداز روایتی نہیں ان کے یہاں تحقیق اور تنقید ہم قدم ہیں۔ وہ واقعات سے اتنا ربط نہیں رکھتے جس قدر واقعات کے سائنسی تجزیے سے۔ وہ ایک مصنف کی تصنیف یا تالیف کے حوالے سے اس کے دل و دماغ کا مطالعہ کرتے ہیں اور اس ضمن میں اس سے غالب رجحانات کا احاطہ اس تفصیل سے کرتے ہیں کہ مصنف کی باطنی اور تخلیقی شخصیت اپنے سارے پہلوؤں کے ساتھ آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ ان کے

> ہر مقالے میں جہاں فکری توانائی اور حقیقت شناسی کے جوہر ملتے ہیں۔ وہاں ان کا رویہ اس انداز کا ہوتا ہے کہ وہ اپنے قاری کو زیرِ نظر تصنیف کے بعض ایسے گوشوں سے بھی روشناس کرا دیتے ہیں جن کا مطالعہ سے پیشتر قاری تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ معلوم سے نامعلوم کی طرف سفر کرتے ہیں اور اپنے قاری کو ساتھ ساتھ لیے جاتے ہیں۔[۱۴]

تنقید سے مراد ہی کسی ادیب یا شاعر کی تخلیق، کاوش یا فن پارے پر تبصرہ کرتے ہوئے غیر جانبدارانہ رائے ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے تجزیہ، تحلیل، تقریظ اور محاکمہ گویا ہر پہلو سے افسانوی ادب کا جائزہ لیا ہے اور کسی بھی ادبی تخلیق کے حسن و لطافت کو گرفت میں لانے کے لیے تنقید ہی بہترین ذریعہ ہے۔ لیکن ڈاکٹر وحید قریشی کی تنقید کسی بھی ادب پارے کے حسن و جمال کو مزید بڑھا دیتی ہے۔ ان کی تنقید کا ہر انداز فن پارے کے حسن و قبح کی چھان پھٹک کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کے نفسیاتی محرکات کا سراغ بھی لگاتا ہے۔ تاریخی اور سوانحی پہلوؤں کو بھی نظر انداز نہیں کرتا۔ ان کا تاریخی شعور ابدیت کے ساتھ ساتھ احساس پر بھی مشتمل ہے۔ دراصل ڈاکٹر وحید قریشی نے تجزیاتی عمل کو اپنی تنقید کا ضروری حصہ قرار دے دیا ہے وہ نہ صرف لفظی تجزیاتی عمل پر یقین رکھتے ہیں بلکہ معنوی تجزیے کی روایت کے علمبردار بھی ہیں۔

میر امن کی ''باغ و بہار'' پر ڈاکٹر وحید قریشی نے سب سے پہلے تجزیے کا آغاز کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اس داستان کے آئینے میں دلی کے درو دیوار اور اس کے اشخاص و افراد کی تصویریں دکھائی ہیں۔ اس کے ساتھ مصنف کی اپنی ذات اور زمان کا واضح عکس بھی میں اس میں موجود ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے خیال میں اس داستان کی اہمیت دو جہت ہے۔ ایک طرف اس زمانے کے رسم و رواج اور دوسری طرف طرزِ معاشرت۔ اِسی داستان کی ایک اور قدر و قیمت یہ ہے کہ یہ ہمارے اجتماعی لاشعور کا ایک نہایت اہم حصہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے داستان کو اسی صنف کے تقاضوں کے مطابق پرکھنے کی سعی کی ہے کیونکہ داستان گو کے پیشِ نظر ناول کی تکنیکی عملی باریکیاں نہیں ہوتیں اس لیے ناول کی تکنیک کی روشنی میں داستان اور اس کی فنی خصوصیات کا جائزہ لینا مناسب نہیں کیونکہ داستان کی بنیاد تخیل اور خطابت پر ہے اور اس کے عناصر کو روزمرہ سچائیوں سے سروکار نہیں۔ پھر زندگی کے بارے میں ان کا رویہ منطقی نہیں بلکہ جذباتی ہوتا ہے۔ جبکہ ناول کا تانا بانا زندگی کے حقائق کے اردگرد بنا جاتا ہے۔ تخیل کی منزل، حقائق کی منزل سے ذرا الگ ہو کر چلتی ہے اس طرح زندگی کے ٹھوس حقائق

تعمیر و تاویل کی بدولت جاذب نظر ہو جاتے ہیں۔

اگلی داستان میر بہادر علی حسینی کی ''اخلاقِ ہندی'' ہے جس کے اکثر کردار پرندے اور چرندے ہیں۔ لیکن وہ انسانی مسائل و آلام کو ہی پیش کرتے ہیں۔ یہاں سیاسی صورتحال کی پیچیدگی اور زندگی کے اخلاقی اصولوں کو پیش کیا گیا ہے۔ اِنسانی سیرت کے یہ استعارے تنقید حیات ہیں۔ یہاں لڑائیاں جھگڑے محض انسانی انا کی تسکین کے لیے کیے جاتے ہیں۔ جبکہ عقل مندی ہر مسئلے کا حل ڈھونڈ لیتی ہے۔ آمرانہ فضا میں راجہ کے منہ سے نکلا ہوا ہر لفظ تقدیر کا حکم کھتا ہے۔ مچھلیاں، شجر و حجر، چرند پرند سب اِنسان کو نیکی کا درس دیتے ہیں۔ ان داستانوں کے ذریعے مصنفین نے فورٹ ولیم کالج میں زیرِ تعلیم بالغ اذھان کو ہندوستانی سوسائٹی کے بنیادی رجحانات سے آگاہی ملی۔

ڈاکٹر وحید قریشی نے حکیم احمد شجاع کی اسلامی ادب کی تحریک اور ادب کو اسلامی تعلیمات کے وسیلے سے پیش کرنے کی سعی کی طرف توجہ مبذول کرائی ہے۔

حکیم احمد شجاع کے ذہن کی تشکیل قرانِ پاک نے کی اور ان کے اظہار میں خلوص اور بیان میں ناقدانہ بصیرت موجود ہے۔ ان کا عہد اور ان کا ماحول ایک دوسرے میں ضم ہے۔ اسی کے ساتھ ان کے ذہن کی تعمیر میں ان کے ماحول کا بڑا اہم کردار ہے۔ حکیم احمد شجاع نے افسانہ، ڈرامہ اور شاعری تینوں اصناف میں طبع آزمائی کی۔ وہ معیار پسند ہیں اور ادب میں اصلاح کے قائل ہیں۔ اگر احمد شجاع نے افسانے میں پریم چند اور سجاد حیدر یلدرم کے اسلوب کو قبول کیا تو ان کی ڈرامہ نگاری آغا حشر کی تربیت کا نتیجہ ہے۔ لیکن احمد شجاع نے اپنا رُخ شاعری اور دینی کتب کی جانب موڑ لیا اور ان کی رائے میں اِنسانی معاشرے کی بنیادی قدر اخلاق ہے۔

مرزا ادیب کا نام اُردو مصنفین میں رومانوی تحریک کے حوالے سے نمایاں ہے۔ ان کے ڈراموں میں زندگی کی رنگارنگی کے عناصر موجود ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی مرزا ادیب کے ڈراموں میں اس دور کی سیاسی، سماجی اور فکری تحریکوں کی جھلک دیکھتے ہیں اور یوں عمرانی تنقید کے پردوں میں ان حقائق کے متلاشی ہیں جو مرزا ادیب کے فن پر اثر پذیر ہیں۔ ان کے ڈراموں کے ساتھ۔ ساتھ ان کے افسانے بھی زندگی کے داخلی المیوں کی تصویر پیش کرتے ہیں۔

ان کی کردار نگاری خاصی توجہ طلب ہے۔ وہ جسمانی خامیوں والے کرداروں کو نمایاں طور پر پیش کرتے ہیں۔ ''آنسو اور ستارے''، ''لہو اور قالین''، خاک نشین''، ''ستون'' اور ''فصیلِ شب'' ان کے ڈراموں کے بہترین مجموعے ہیں۔ صحرا نورد کے خطوط، سے ان کو شہرت ملی۔ ''مٹی کا دیا''، ''حسرتِ تعمیر'' افسانوں کے مجموعے ہیں۔ ان تمام مجموعوں میں مرزا صاحب نے اپنی ترقی پسند سوچ کو پیش کیا ہے لیکن ترقی پسند رجحانات کے بجائے اپنی تنہائی، خوف، محرومی اور اپنے ماضی کو موضوع بنایا ہے۔ ڈرامہ نگاری کے میدان میں ابصار عبدالعلی اپنے ریڈیائی اور ٹیلی ویژن کے ڈراموں کی بدولت شہرت حاصل کر چکے ہیں وہ کرداروں کے داخلی احساسات کو خارجی سطح پر مناظر سے ہم آہنگ کرتے ہیں ان کے مکالموں میں توانائی موجود ہے۔

افسانہ نگاری پر تنقید کرتے ہوئے ڈاکٹر وحید قریشی کا اگلا موضوع فضل الرحمٰن خاں کے افسانے ہیں اور فضل الرحمٰن خان نے جنس کے جذبے کو اِنسانی زندگی میں افراد اور معاشرتی کرداروں کے تال میل سے پیدا ہونے والا خیر کا جذبہ کہا ہے۔ ان کے کردار عام زندگی سے مستعار لیے گئے ہیں۔ ان افسانوں میں سماجی شعور موجود ہے۔ ان کی زبان ان کے سماج اور ماحول سے مطابقت رکھتی ہے۔

جان ماسٹر کا ناول بھوانی جنکشن اینگلو انڈین طبقے کے مشاغل اور سیاسی تحریکات اور انقلاب کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ سراغ رسانی سے متعلق ناول ہے، اور پوری طرح پڑھنے والے کی توجہ کو اپنی جانب مبذول رکھتا ہے۔ اس ناول کو پاکستان کے لیے سید قاسم محمود نے اُردو میں ترجمہ کیا لیکن ترجمہ رواں اور پُرلطف ہے۔

عنایت اللہ کے چار ناولٹ ڈاکٹر وحید قریشی کا موضوع بنے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب زبان و بیاں کے فنی وفکری جائزے کے بعد ناولٹ نگار کی زندگی کے بارے میں بصیرت کی داد دیتے ہیں اور عنایت اللہ کے فن کے اس پہلو کو سراہتے ہیں جس میں انہوں نے شہری اور دیہاتی زندگی کے ہر پہلو کی تصویر کشی کی ہے۔ جذبات نگاری بھی ان کے ہاں عروج پر ہے وہ انسانی قدروں میں ایثار کو بلند قدر کے طور پر دیکھتے ہیں۔

''محدب شیشہ'' مسعود مفتی کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ہے جس میں مذہبی اقدار کے بارے میں ان کا مثبت رویہ سامنے آیا ہے۔ ان افسانوں میں افسانہ نگار کے ذاتی اعتقادات اور رجحانات سامنے آتے ہیں۔

اگلا مضمون سائرہ ہاشمی کے ناول ''درد کی رُت'' پر ہے۔ جس کا موضوع نوجوان لڑکے لڑکیوں کے ذہنی

مسائل ہیں۔ سائرہ کے ذاتی احساسات ہی اس ناول میں درپردہ ابھرتے ہیں۔ ان کا موضوع فرد اور معاشرے کے درمیان انسان کی کشمکش ہے۔ یہ ناول سیاسی اور سماجی طور پر پاکستان کی تاریخ سے بھی وابستہ ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی سائرہ ہاشمی کی اس کوشش کو سراہتے ہیں کہ جس اپج سے انہوں نے ناول پر سیاست اور سماج کو طاری نہیں کیا بلکہ کرداروں کی عملی تشکیل میں مسائل کو محض پس منظر بنایا ہے۔ اس طرح کہانی کا نیاپن اور انفرادیت برقرار رہتی ہے۔

ذکاء الرحمٰن کا ''دودِ چراغِ محفل'' لکھنؤ کے قدیم و جدید تمدن کی درمیان کڑی ہے لیکن ناول کی تعمیر میں زمان و مکان کے باہمی ربط کو پیشِ نظر نہیں رکھا گیا اور اس طرح عدم توازن کی کیفیت جنم لیتی ہے۔

منصور قیصر کے افسانوں کا مجموعہ ''بے چراغ بستی'' ہے جو ان کے تیس برس کا کل سرمایہ ہے۔ اس میں وہ تجریدیت اور علامتیت کے طریق کار کا استعمال کرتے ہیں۔ وہ شدید جذبوں کے ادیب ہیں۔ ڈاکٹر وحید قریشی ان کے تخلیق کردہ ادب کو ہماری معاشرتی اور سیاسی زندگی کا آئینہ قرار دیتے ہیں۔ ان کے ہاں جذباتی انتشار موجود ہے لیکن یہ رجحان معاشرتی موضوعات پر تبصرہ کرتے وقت نمایاں ہو جاتا ہے۔

ڈاکٹر وحید قریشی کا اگلا مضمون صدیق سالک کا ''پریشر ککر'' ہے۔ جس کا ہیرو معاشرے سے ٹکرا کر اپنی ذات کی کرچیاں سمیٹنے میں مصروف ہو جاتا ہے۔ معاشرے کے مکر و فریب اور سیاسی چالبازیوں کے الاؤ اس ناول میں دہکتے نظر آتے ہیں۔

جدید افسانہ نگاروں میں منشا یاد کا نام ایک خاص اہمیت کا حامل ہے۔ انہوں نے بیانیہ انداز میں نئے تجربے کیے اور اپنے بعض تلازمات کے ذریعے وہ قاری کے دل و دماغ کو اپنے سحر میں لیتے ہیں۔ ان کی افسانوی دُنیا میں کچھ استعارے مستقل حیثیت رکھتے ہیں۔ لاشیں، قبریں، جنازوں کی کثرت، آہ و زاری، آسیب زدہ بچہ وغیرہ موت کا خوف انہیں پریشان رکھتا ہے۔ لیکن مٹی سے محبت ان کے فن کا سرمایہ ہے۔ عرش صدیقی کی حیثیت افسانہ نگار کی ہے۔ ان کے افسانے متوسط طبقے کو ظاہر کرتے ہیں۔ نیکی اور بدی کی جنگ ان کا خاص موضوع ہے۔ ان کے کرداروں میں احتجاج اور سمجھوتے کے رنگ موجود ہیں۔ ڈاکٹر وحید قریشی کے خیال میں ہم آہنگی کی فضا کی بدولت ایک خاص ربط موجود ہے۔

رفیق چودھری کے افسانے ڈاکٹر وحید قریشی کا اگلا موضوع ہیں۔ ان پر تنقید کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ حزم اور احتیاط نے ان کے افسانوں میں ایک توازن اور ربط کی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ رفیق چودھری کے موضوعات زندگی اور اس کے حقائق سے عبارت ہیں۔

ڈاکٹر احراز نقوی نے ۱۹۶۴ء میں افسانوں کا مجموعہ ترتیب دیا جس میں کل تیرہ افسانے ہیں۔ تین پاکستان کے افسانہ نگاروں کے اور دس بھارت کے اس مجموعہ کے شروع میں اُردو افسانے کے ارتقاء اور آخر میں مجموعے میں شریک افسانوں کا تجزیہ کیا گیا ہے۔

آزاد کا ایک درسی شہکار، اُردو کی پہلی کتاب، ڈاکٹر وحید قریشی کا اگلا مضمون ہے۔ جس میں ڈاکٹر صاحب نے محمد حسین آزآد کے قلم کی اس خوبی کا اعتراف کیا ہے کہ جس کی بدولت وہ بچّے کی ذات، اس کی ذہنی سطح اور اس کی جذباتی زندگی کا ادراک کر لیتے ہیں۔ ان کے ہاں فصاحت کے ساتھ ساتھ پڑھنے والے کی ذہنی سطح کا شعور بھی موجود ہے۔

یہ ایک درسی کتاب ہے لیکن محمد حسین آزآد نے اس میں خشکی اور بے ربطی پیدا نہیں ہونے دی بلکہ وہ اپنے تخلیقی عمل کو ایک بے تعلق ناظر کی طرح دیکھتے ہیں۔ ڈاکٹر وحید قریشی محمد حسین آزآد کا نفسیاتی تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> انہوں نے اپنے شخصی اسلوب کے بعض پہلوؤں مثلاً استعارہ در استعارہ کو ترک کیا۔ لیکن وہ اپنے بعض شخصی رجحانات کو کام لائے۔ گردوپیش سے بے اطمینانی، امراض کی کثرت، اور جذباتی زندگی میں اتھل پتھل نے آزاد کو بصری تصویروں (Visual Images) کا دلدادہ بنا دیا ہے۔ یہ رجحان ان کے ہاں ابتدا ہی سے تھا۔ حالات نے اسے اور بھی اُبھار دیا۔ وہ دُنیاوی زندگی سے زیادہ ذہنی زندگی بسر کرنے والے ادیب تھے۔ [۱۵]

آزاد بچّوں کے لیے بھی لکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی کتابوں میں تازگی اور رچاؤ موجود ہے۔ وہ بچّوں کے لیے ابتدا میں بول چال کی زبان لکھتے ہیں لیکن درسی ضروریات کو تخیل کے زور میں بھی فراموش نہیں کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ اُردو کی پہلی کتاب آج بھی اپنے موضوع پر بہترین کتاب ہے۔

اگلا مضمون وحید قیصر کے گیارہ افسانوں کا مجموعہ ہے۔ یہ بھی بچّوں کے ذہن کو مدنظر رکھ کر لکھی گئی ہے۔ وحید قیصر نے بچّوں کے لیے اخلاقی درس و تدریس کو ہلکے پھلکے انداز میں بیان کر کے ان کی اصلاح کردار کی طرف توجہ دی ہے۔ وحید قیصر اس دُنیا کو حسین اور دلنواز بنانے کے خواہش مند ہیں۔ انھوں نے بچّوں کی کہانیوں کو ایک نیا پیکر عطا کیا ہے۔

بچّوں کے ادب کے ضمن میں ڈاکٹر وحید قریشی نے بیگم ثاقبہ رحیم الدین کی دو کتابوں کو موضوع بحث بنایا ہے بیگم ثاقبہ رحیم الدین کا کمال یہ ہے کہ بچّوں کے لیے کہانی لکھتے وقت خود بچّوں کی ذہنی سطح پر اُتر کر تخلیقی عمل کو محسوس کرتی ہیں اور اسے مزید جاندار بناتی ہیں۔ وہ اپنے موضوعات کا رشتہ واقعات و حالات سے براہِ راست جوڑ لیتی ہیں۔ خشک اور بے جان واقعات میں دلچسپی کا عنصر پیدا کرنے میں کمال رکھتی ہیں۔ ان کہانیوں میں غور و فکر اور حب الوطنی کے جذبات موجود ہیں۔ یہ ہلکے پھلکے انداز میں لکھی گئی کہانیاں ہیں۔

اگلا مضمون ''بچّوں کا ادب'' ہے۔ اس میں ادب کی غرض و غایت پر بحث کی گئی ہے۔ خاص طور پر بچّوں کے ادب میں یہ سوال کہ کیا لکھا جائے کن موضوعات اور مسائل کو بنیاد بنایا جائے۔ ادب کے وسیلے سے بچّوں کو ان کے ماحول اور معاشرے سے کس طرح ہم آہنگ کیا جائے۔ بچّوں کی داخلی اور خارجی زندگی میں کس طرح ربط تلاش کیا جائے اور انھیں حقائق سے روشناس کرایا جائے۔ یہ سب اہم مگر بنیادی سوالات ہیں۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے جہاں رنگارنگ موضوعات اپنائے وہاں بچّوں کے ادب کے موضوع کو بھی اپنا کر اسے ایک نیا رنگ اور جدت عطا کی۔

اُردو ادب کی مختلف اصناف کی تنقید کے علاوہ تنقید ہی کے موضوع پر ڈاکٹر وحید قریشی کی ایک اور تصنیف ''اُردو ادب کا ارتقاء۔۔۔۔ ایک جائزہ'' ہے۔ یہ کتاب القمر انٹر پرائزز، اُردو بازار لاہور نے ۲۰۰۶ء میں شائع کی۔ کتاب کا پیش لفظ ''سخنے چند'' کے عنوان سے پروفیسر ڈاکٹر تحسین فراقی نے تحریر کیا جس میں انھوں نے اُردو ادب کے ابتدائی دکنی دور سے آج تک کے اُردو ادب کے مختلف مزاجوں اور پہلوؤں کو پیش کیا۔ اس تجزیے میں اس حقیقت کا اعتراف کیا گیا ہے کہ اتنی مختصر کتاب میں ڈاکٹر صاحب نے اُردو ادب کے خدوخال کو متعین کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ دکنی اور پنجابی ادب کی مماثلت کا دلچسپ احوال اجمالاً لکھا گیا ہے اور اس کتاب میں پاکستان کی تہذیبی، سیاسی، معاشی اور عمرانی صورتحال سے منسلک ایک مربوط منظرنامہ موجود ہے۔

یہ کتاب بیس ابواب پر مشتمل ہے۔ عنوانات مقرر نہیں کیے گئے بلکہ ارتقاء موجود ہے اور اسی ارتقاء کی کڑیاں ہر باب میں نظر آتی ہیں۔

باب اول میں اُردو زبان کے آغاز کے متعلق مختلف نظریات بیان کیے گئے ہیں۔ پنجاب سرحد اور سندھ کے علاقے کو ڈاکٹر وحید قریشی اُردو کا مؤلد بتاتے ہیں۔ اُردو زبان کی تشکیل میں حصہ لینے والے عناصر کے ضمن میں ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ ہند آریائی روایت اور وسط ایشیائی عجمی روایت شامل ہیں۔ مسلمانوں کی آمد تک سماجی زندگی کا شیرازہ ان علاقوں میں بکھر چکا تھا۔ علیٰحدگی کے میلانات کی وجہ سے مشترک زبان کے امکانات معدوم تھے۔ مقامی باشندوں سے روابط کے لیے صوفیائے کرام کو مقامی زبانوں سے کام لینا پڑا۔ اس سے بالواسطہ اُردو زبان کو فائدہ پہنچا۔

ڈاکٹر وحید قریشی تاریخ کی روشنی میں اپنی ادبی وعلمی تنقید کا سفر طے کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں دکن میں مسلمانوں کی آمد علاؤ الدین خلجی کے زمانے سے شروع ہوئی۔ اُردو ادب کی مستقل روایت صوفیائے کرام کی تبلیغِ اسلام سے قائم ہوئی۔ اُردو کے ابتدائی صوفیانہ نمونوں پر فارسی اور عربی کا اثر ملتا ہے۔ بیجاپور اور گولکنڈہ کی حکومتوں نے ادب کے لیے مرکز کی حیثیت اختیار کر لی۔ دکنی حکومتیں مذہباً شیعہ تھیں۔ اس لیے ان کی سرپرستی میں جو شاعرانہ ادب تخلیق ہوا۔ اس میں دکنیت کا پہلو صاف ظاہر ہے۔ جبکہ بیجاپور اور گولکنڈا میں مثنوی کو فروغ ملا۔ بعد ازاں تینوں جگہوں پر غزل کا چرچا ہوا۔ صوفیا کی تربیت میں فارسی وعربی زبان کو خاص اہمیت حاصل تھی اس لیے مقامی زبان کو ذریعہ اظہار بنانے کے باوجود صوفیائے کرام کی زیادہ توجہ فارسی تک محدود رہی۔

ڈاکٹر وحید قریشی نے اُردو زبان کے مرکز دکن کی ادبی حیثیت کے علاوہ سیاسی حیثیت کو بھی واضح کیا ہے۔ محمد بن تغلق کا ۱۳۲۶ء میں دکن میں دارالحکومت کی بنیاد رکھنا اُردو زبان کی تشکیل وتعمیر کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ یہ تاریخی حقیقت ہے کہ افواج اور افواج سے متعلق بہت سے لوگ دولت آباد جا پہنچے اور سلطنت کی راجدھانی ہونے کی بنا پر شمالی ہندوستان کی بہت بڑی آبادی جنوب میں منتقل ہوگئی۔ مسلمان فوج کے ساتھ اُردو زبان بھی دکن پہنچی۔ خواجہ گیسودراز اور بعض دیگر صوفیا بھی جنوب میں جا پہنچے۔ لیکن جب اکیس برس بعد علاؤ الدین بہمنی نے مرکز سے بغاوت کر کے سلطنت بہمنی کی بنیاد رکھی تو اہل دکن کے شمالی ہندوستان سے سیاسی وثقافتی روابط کمزور پڑ گئے۔ اس سے مقامی عناصر نے فروغ پایا۔ دورِ بہمنی میں اُردو ادب کی ترقی ہوئی۔

اس عہد کے بارے میں ڈاکٹر وحید قریشی لکھتے ہیں:

> ۱۳۵۱ء سے ۱۵۹۰ء تک اُردو ادب کا مذہبی دور ہے جس میں بے شمار نظمیں اور رسالے لکھے گئے اور ان کا مقصد مذہب اور تصوف کی مبادیات سکھانا تھا۔ ادبی وفنی حسن کاری نہیں تھا۔ لیکن اس کا موقع بھی جلد آ گیا۔ ۱۵۹۰ء کے بعد اُردو کا ادبی دور شروع ہوا۔ اس زمانے میں اُردو کو درباری سرپرستی حاصل ہوئی۔ [۱۲]

عادل شاہی اور ان کے متوازی قطب شاہیوں نے جب اپنا اقتدار قائم کیا تو اُردو زبان و ادب کی بڑی سرپرستی کی۔

اس دور میں اصنافِ ادب اردو میں بڑی وسعت پیدا ہوئی۔ اس ادب میں سادگی تھی لیکن مقامی تمدن، ہندو مذہب اور رسم و رواج کی خوبصورت تصویریں ملتی ہیں۔ بعض ہندوانہ قصوں کے اثر کو ڈاکٹر وحید قریشی اس دور میں ہندو ادب کے اردو ادب پر اثرات کی وجہ سمجھتے ہیں۔ ان کے خیال میں ہندی تشبیہات، استعارات، تماثیل، محاورات، ہندو دیو مالا کا اظہار کھل کر ہوا اور ان کے اثرات کو مسلمانوں کی تحریر کردہ مثنویوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ دکنی حکومتیں شیعہ تھیں۔ لہٰذا مرثیے کی صنف کو بطور خاص ترقی ملی۔ لیکن ان مثنویوں اور مرثیوں پر فارسی ادب کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔ تصوف میں صوفیانہ اصطلاحات کو غزل میں بھی دیکھا اور محسوس کیا جا سکتا ہے۔ بلکہ آخری دور کی محبوب صنف ہی غزل تھی اور اس میں شعرا نے شعوری طور پر ان عناصر کو شامل کیا۔ جو مسلمانوں کی مشترکہ میراث کے طور پر ترکی سے لے کر برصغیر تک پھیلے ہوئے تھے۔ ولی نے فارسیت کی روایت میں تغزل کے عناصر کو شامل کیا۔ بلکہ اردو شاعری میں اپنی نشوونما کے ابتدائی دور ہی سے فارسی کی بدولت وہ رچاؤ اور پختگی آ گئی کہ اردو زبان میں جاندار روایات کے اظہار کے سانچے تخلیق کیے جانے لگے۔ اردو کے کلاسیکی شعرا نے بے جان تقلید کی بجائے اپنی ذات کے حوالے سے فارسی ادب سے اپنا ناتا جوڑا اور اردو شاعری اپنی ابتدائی زندگی ہی میں قابل قدر نمونوں سے مالا مال ہو گئی۔ اردو شاعری میں فارسی اسالیب سے مدد لی گئی۔ حتیٰ کہ علم بیان اور صنائع بدائع بھی فارسیت سے مستعار تھے۔ لیکن اردو میں آ کر انہیں ایک نئی زندگی، روشنی اور توانائی ملی۔ فارسی شعرا کے تصور حسن و عشق کو اردو کے قالب میں ڈھالا گیا۔ کئی فارسی اشعار کو ہو بہو اردو میں منتقل کیا گیا۔ باب چہارم میں صفحہ ۱۹ اور صفحہ ۲۰ پر ڈاکٹر وحید قریشی نے وہ اشعار پیش کیے ہیں جنہیں فارسی سے اردو میں منتقل کیا گیا ہے۔ لیکن اس کو وہ 'متبدل بندی' کا نام دیتے ہیں۔ روحانی اور عشقیہ واردات

اور محبوب کے سراپا کے بیان میں اردو شعرا نے فارسی غزل سے اکتساب فیض کیا ہے۔ شعرا نے مثالی واقعات اور مثالی کرداروں کو تخیلی سطح پر زندہ کر کے بیان کیا ہے۔ اس دور کی مجلسی زندگی کو اس عہد کی شاعری میں زندہ جاوید دیکھا جا سکتا ہے۔ متعلقات کے ساتھ ساتھ مناسبات کے لیے بھی اردو شعرا نے فارسی غزل گو شعرا کی طرف دیکھا اور ان کی روش کو اپنایا۔

ڈاکٹر وحید قریشی نے اردو شعرا کے گہرے مطالعے اور فارسی روایت کے مشاہدے سے مناسباتِ عشق، مناسباتِ حسن، مناسبات فقر، مناسباتِ امارت، مناسباتِ باغ و بہار، مناسبات برشگال اور مناسباتِ علم کی فہرستیں دے دی ہیں۔ اس طرح سمندر کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔ گویا یہ تمام تر رجحانات دو صفحات میں سمو کر اردو ادب کے ارتقاء کا جائزہ لینے والوں کے لیے مختصر الفاظ میں طول وطویل بحث کو سمیٹ دیا ہے۔

جن مناسبات کا تذکرہ یہاں ڈاکٹر وحید قریشی نے کیا ہے وہ ولی کے زمانے تک اردو شاعری میں رچ بس گئے تھے اور ایرانی سماجی زندگی کی منہ بولتی تصویریں اردو غزل کے آئینے میں منعکس تھیں۔

تمام رجحانات سے بڑھ کر اردو غزل نے تصوف کے اثرات کو ایران سے لیا۔ ان اثرات کو بطور خاص مثنوی، رباعیات اور غزل میں دیکھا اور محسوس کیا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے غائر مطالعے کے بعد فارسی کی ان اصطلاحات کی فہرست بھی دی ہے جو اردو تصوف میں فارسی تصوف کے زیر اثر آئیں فارسیت کے ان اثرات کے علاوہ جنوب وشمال میں اصناف سخن میں بھی اضافہ ہوا اور مقامی اصناف سخن میں صوفیا کے منظوم اقوال گفتار نامے، چکی نامے، فال نامے، دوہے اور سورٹھ، کافی، چوپائی، سی حرفی، فکری، اشلوک، ساکھی، بارہ ماسے، زختہ، ملمع اور جھولنے یہ تمام اصناف ایسی ہیں جن پر اردو میں بھی طبع آزمائی کی گئی۔ لیکن آہستہ آہستہ فارسی کے زیر اثر مثنوی، رباعی، قصیدہ اور غزل نے اردو میں رسوخ حاصل کر لیا۔ اردو میں انجذاب کے عمل کو پنجابی اثرات نے تیز تر کر دیا۔ افواج میں پنجابی فوجیوں کی معقول تعداد تھی۔ دلی کی زبان پر پنجاب کا اثر تھا۔ ان اثرات و بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر وحید قریشی کہتے ہیں:

> زبان کے اعتبار سے دکنی نظم اور نثر میں 'نے' علامتِ فاعل کا بکثرت استعمال پنجابی اثر کو ظاہر کرتا ہے۔ اسی طرح اردوئے قدیم میں قواعد کا نظام بھی اسی حیثیت کی غمازی کرتا ہے۔ کہ زبان کا لسانی روپ پاکستان کی زبانوں سے بشدت متاثر ہے۔ بقول

حافظ شیرانی، اردو کی ساخت، وضع قطع اور قواعد وضوابط پنجابی بالخصوص ملتانی سے مماثلت رکھتے ہیں۔ پنجابی اور اردو کی صرف نحو میں ۲۳ قاعدے مشترک ہیں۔ ۱۷

اس سلسلے میں ڈاکٹر وحید قریشی کی یہ کوشش مستحسن اقدام کی حیثیت رکھتی ہے جس میں انہوں نے پنجابی اور اُردو کی صرف نحو میں ۲۳ قاعدے جو مشترک ہیں ان کا ترتیب وار جائزہ لیا ہے۔ یہاں ان کی تنقید تحقیق کی ہمرکاب ہو جاتی ہے اور مدلل تنقید بن جاتی ہے اور اس بحث سے انہوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اُردو زبان ابتدا سے لے کر دلی کی ادبی روایات کے آغاز تک صرفی ونحوی لحاظ سے پاکستان کی زبانوں سے مختلف نہ تھی بلکہ ان زبانوں کا گہرا رنگ اُردو پر چڑھا ہوا تھا۔ ذخیرہ الفاظ پر اس اثر کو بخوبی محسوس کیا جاسکتا ہے۔ لیکن جو الفاظ رائج ہونے کے بعد متروک ہو گئے ڈاکٹر وحید قریشی نے بڑے خوبصورت انداز سے انہیں ''خوابیدہ الفاظ'' کہا ہے۔ یوں ڈاکٹر صاحب کی تنقید ادبی انداز اختیار کر لیتی ہے۔

اورنگزیب تک آتے آتے فارسی میں ایہام گواور تمثیل نگار شعراء کی ایک پوری نسل نے سامنے آ کرفن سے پڑھنے والوں کو متاثر کیا۔ ۱۷۰۷ء میں اورنگزیب کا انتقال ہوا۔ لیکن اس وقت تک اُردو دلی اور آس پاس کے علاقوں میں پھیل چکی تھی۔ دلی میں اُردو شاعری کا پہلا دور ایہام گوئی کا ہے۔ دوسرا دور میرؔ وسوداؔ کا دور کہلاتا ہے۔ تیسرا دور بیک وقت شعرائے لکھنؤ کا ہے اور اس کے ساتھ دبستانِ دہلی کا بھی ہے۔ یہ اُردو ادب کا زرّیں دور ہے۔ اس دور میں اردو شاعری اپنے عروج پر تھی۔

ایہام گوئی کی ابتدا ۱۷۱۹ء سے ہوئی جس میں محمد شاہی محل کی عیاشیوں کے ردعمل کے طور پر ایہام کی تحریک نے خارجی رجحانات کو ظاہر کیا۔ لیکن خان آرزو، سودا اور مرزا مظہر جان جاناں نے پھر سے تازہ گوئی کی روایت کی بنیاد رکھی۔ بیدلؔ اور ان کے معاصرین کے رنگ کے خلاف بغاوت کی گئی۔ لیکن مغلیہ سلطنت کے سیاسی حالات خراب ہونے کے بعد اور نادرشاہ کے حملے کی وجہ سے حالات کی دگرگوں حالت نے شعراء کو زندگی کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنے پر مجبور کر دیا۔ اب انہوں نے فرار کا راستہ اختیار کرنے کی بجائے زندگی سے آنکھیں چار کیں اور درحقیقت یہی وہ موڑ ہے جس نے اُردو شاعری کا مزاج متعین کر دیا۔ اُردو غزل میں داخلی رجحانات نے فروغ حاصل کرلیا

اور درد و گداز کو غزل کے لیے لازم و ملزوم قرار دے دیا گیا۔ میؔر نے غم و الم کو آفاقی لہجہ عطا کیا۔ میر دردؔ نے تصوف کو غزل کے رگ و پے میں جاری و ساری کر دیا۔ اس طرح ایک ایسی روایت بن گئی جس نے اُردو غزل کو ایک نیا مقام عطا کر دیا۔ اس دور میں مزاج اور لہجے کے اعتبار سے ایک نئی روایت فارسی غزل کے سرمائے کو ساتھ لے کر آگے بڑھی۔

بعد ازاں سیاسی حالات نے اور بھی تنزل کی صورت اختیار کی۔ اب نادر شاہ کے حملوں کے بعد مرہٹوں کی یورش تھی۔ پنجاب میں سکھوں نے سر اٹھایا اور احمد شاہ ابدالی نے کئی حملے کیے۔ پشاور سے دہلی تک کا علاقہ برباد ہوگیا۔ دبستان دہلی کے شعراء عازم سفر ہوئے بیشتر کا مسکن لکھنؤ قرار پایا۔ یہاں سکون تھا۔ خارجی زندگی میں دلکش چکا چوند تھی۔ یہ شعرا اسی دلکشی میں کھو گئے۔ میر حیدر علی حیراں، جعفر علی حسرت، قلندر بخش جرأت، سیّد انشاء اور میر حسن کے کلام میں داخلی و خارجی عناصر موجود ہیں۔ یہ دبستان لکھنؤ کا پہلا دور ہے۔ اب شاعری زندگی سے فرار کا راستہ تھی اور ان شعراء کا کلام یہ لکھنوی دور زبانِ محض کا دور ہے البتہ مرثیہ گوئی کے رجحان نے ماضی کی شاندار تاریخ کے سہارے مرثیہ گوئی کی روایت قائم رکھی۔ آخر میں لکھنؤ کی تمدنی زندگی کو پسِ منظر کے طور پر استعمال کیا جانے لگا۔

دہلی اور لکھنؤ کے درمیان انتہا کی رقابت موجود تھی۔ لسانی تحریک کے خلاف ردِعمل دبستانِ دہلی کو خارجیت سے داخلیت کی طرف لے جا رہا تھا۔ یہاں دہلوی شاعری کے اس دور کا دوسرا مرحلہ شروع ہوا۔ ۱۸۵۷ء سے پہلے غزل کے علاوہ مثنویاں بھی لکھی گئیں۔ اس دور کی معاشرتی زندگی کی تصویریں پیش کی گئیں۔ میر حسن کی سحرالبیان اور دیا شنکر نسیم کی گلزار نسیم اس قبیل کی عمدہ مثالیں ہیں۔

نثر کے علاوہ اس عہد میں نثری ارتقاء کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر وحید قریشی کہتے ہیں کہ ۱۷۰۷ء سے ۱۸۵۷ء تک کی نثر میں کربل کتھا کے بعد شاہ عالم ثانی کی لکھی ہوئی طویل داستان (عجائب القصص) اہل دہلی کی ادبی کارگزاری کا بہترین ثبوت ہے۔ لکھنؤ میں سید انشا نے کیتکی کی کہانی کے علاوہ ''سلک گوہر'' لکھ کر لسانی تجربوں کی بنیاد رکھی۔ رجب علی بیگ سرور کی فسانہ عجائب لکھنوی مزاج کی درست ترجمان ہے۔

نثر میں نثر مصنوع اور نثر عاری دو تحریکیں ہیں۔ اُردو میں نثر کا باقاعدہ آغاز انگریزوں کی آمد سے ہوا۔ ۱۸۰۰ء میں کلکتے میں فورٹ ولیم کالج قائم ہوا جس میں شعبہ ہندوستان نے بیش بہا تصنیفی کام

کیا۔ کالج کے مصنفین میں میرامن کی ''باغ و بہار'' اہم ترین تصنیف ہے۔ اُردو ادب کے ارتقاء میں اس کالج میں کرائے گئے تراجم سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر وحید قریشی کے اس جائزے سے یہ حقیقت ظاہر ہوتی ہے کہ مجموعی طور پر اس دور کا شعروادب جس تمدنی زندگی کا عکاس ہے۔ اس میں ادبی اور فنی لحاظ سے بڑی کشش پائی جاتی ہے۔ پھر اُردو زبان آغاز میں جن لسانی روایات کی آمیزش سے پیدا ہوئی تھی۔ وہ سرحد، پنجاب اور سندھ کی لسانی روایات تھیں لیکن ۱۷۰۷ء سے ۱۸۵۷ء تک اُردو زبان وادب کی تشکیل ان عناصر سے ہونے لگی جن میں ان علاقوں کا حصہ نہ ہونے کے برابر تھا۔

پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ دہلی اور لکھنؤ کے ادب پر جاگیرداری طبقے کی اجارہ داری تھی۔ جنہوں نے بعد ازاں خود کو اہل زبان کہلانا شروع کر دیا۔ اگرچہ اہل لکھنؤ اور دہلی کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ دونوں روایات نے عجمی اور وسط ایشیائی عناصر پر بھروسہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ لکھنؤ کا آخری زمانہ اور دہلی کا اختتامی عہد ایسے ادوار ہیں جب ادب سے روح غائب ہونا شروع ہوگئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دلی اور لکھنؤ کا ادب جاگیرداری رجحانات کے تابع ہے جبکہ پنجاب اور نواحی علاقوں کا ادب ''عوامی ادب'' ہے جس کی ترویج میں اہم ترین کردار صوفیائے کرام کا ہے۔ اسی روایت کے زیرِ اثر پنجابیت اصل حدود اور علاقے سے نکل کر دوسرے علاقوں میں پہنچ گئی۔ حافظ محمود شیرانی کے مطابق اٹھارہویں صدی عیسوی کا اختتام پنجاب میں شعروشاعری کا دور ہے اگر پنجاب کی ادبی تاریخ کو سیاسی حالات کی روشنی میں دیکھا جائے تو اس کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

۱۷۱۴ء سے ۱۷۹۹ء تک اور ۱۷۹۹ء سے ۱۸۴۹ء تک اس دور میں سکھوں کی حکومت بھی تھی۔ لیکن رنجیت سنگھ نے ۱۷۹۹ء میں مربوط حکومت قائم کی۔ سیاسی حالت کے زوال کے ساتھ ساتھ ادبی کارگزاری بھی تنزل کی طرف گامزن ہوگئی۔ سرحد اور سندھ کی اُردو شاعری بھی مقامی اثرات کے ماتحت رہی۔ بلوچستان میں درباروں سے متعلق شعراء کا کلام ادبی روایت کا اہم ترین حصہ بنتا رہا۔

۱۸۵۷ء کی حد فاصل نے ادب میں قدیم و جدید کے مابین تفاوت پیدا کر دیا۔ پھر یورپ کی مادی ترقی نے ہندوستان کو محض ایک تجارتی منڈی بنا کر رکھ دیا۔ ان حالات کا اثر ادب پر بھی ہوا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد بیداری کی لہر اٹھی۔ اقبال کے زمانے میں روحانی تحریک اور پھر ترقی پسند تحریک سامنے

آئی۔ ۱۹۰۰ء سے حالی اور ان کے ساتھیوں کو قبولِ عام حاصل ہوا۔ پنجاب میں سرسید کی شہرت کے بارے میں حالی نے کہا ہے پنجاب نے سرسید کی آواز پر لبیک کہا۔ سرسید اور ان کے رفقاء نے ایک نئی ادبی تحریک کی بنا ڈالی۔ اس میں پسِ پردہ مفاہمت کا جذبہ کارفرما تھا۔ روحانی اقدار کو پسِ پشت ڈال کر صرف مادی اقدار کو سامنے لایا گیا۔ اکبر نے تحریک علی گڑھ کے اسی پہلو کو نشانہ تنقید بنایا۔ لیکن علی گڑھ تحریک کی یہ خدمت ناقابلِ فراموش ہے کہ ادب اور زندگی کے گم شدہ تعلق کو اسی تحریک نے دوبارہ تلاش کیا اور ادب کو زندگی کا آئینہ قرار دیا۔ اصناف کے میدان میں مزید وسعت آئی۔ اس ضمن میں داغ دہلوی کا اثر بھی قیام پاکستان تک ہر شاعر کے کلام میں موجود تھا۔ انجمن پنجاب کے شاعروں نے بھی آہستہ آہستہ اُردو نظم کو متاثر کیا۔ اس میں فطرت اور سادہ گوئی کا رجحان پیدا ہوا۔ ۱۹۰۰ء سے ۱۹۳۰ء تک پنجاب میں شائع ہونے والے رسائل اور جرائد نے بھی خطۂ پنجاب کو ادبی حیثیت عطا کر دی۔ کلامِ اقبال کی گونج نے بھی پنجاب کی آواز کو پورے برصغیر کے ہر گوشے میں پھیلا دیا۔ پنجاب میں ادب اور شعر کے واضح رجحانات میں قدیم طرز کی غزل گوئی بھی ہے اور جمالیات کے تصورات کی آمیزش بھی۔ روحانی تصورات بھی ہیں اور حقیقت پسندی بھی۔ اقبال فکر اور رومانیت کے دونوں تصورات کو ساتھ لے کر چلتے ہیں۔

شاعری کے علاوہ نثر میں بھی ترقی پسند تحریک کی وجہ سے وسعت پیدا ہوئی۔ رومانی تحریک کے زیرِ اثر بھی نثر لکھی گئی۔ رومانی تحریک کا اثر دلوں اور روحوں پر ہوا لیکن ترقی پسند تحریک نے ذہنوں کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ مارکسی اور اشتراکی خیالات کی ترویج کی بدولت اس تحریک کی مخالفت بھی کی گئی۔ اسی دور میں حلقہ اربابِ ذوق نے بھی اردو ادب میں توازن کی ایک نئی روایت قائم کی۔ لیکن یہ نثر کے مقابلے میں شاعری کی تحریک تھی۔ اس تحریک نے مغرب کے سرمایۂ علمی سے بھی استفادہ کیا۔

اُردو ادب نے عقلیت سے رومانیت کا سفر بھی طے کیا اور پھر ملت کے تصور سے قومیت تک کا سفر کر کے نئے راستے دریافت کیے۔ اب ہر کردار نے اپنے طبقاتی لبادے بھی اوڑھے۔ اُردو کو مسلمانوں نے برصغیر میں اپنے اظہار کا بنیادی وسیلہ بنایا اور ادب پاروں میں پاکستان کو دینی ریاست بنانے اور قائداعظم کے الفاظ میں اسلام کی تجربہ گاہ بنانے کا اصول دریافت کیا گیا۔ ثقافتی مسائل پر بھی قلم اٹھایا گیا۔ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۷۰ء

کے زمانے کو دو حصوں میں تقسیم کی جا سکتا ہے۔

(اُ) ۱۹۴۷ء سے ۱۹۶۰ء

(ب) ۱۹۶۰ء سے ۱۹۷۰ء

پہلے دور میں آویزش ہے جبکہ دوسرا دور سیاسی دباؤ کا دور ہے۔ بیان پر پابندی کی وجہ سے ادب نے بالواسطہ راستے اختیار کیے۔ غزل میں سیاسی و سماجی مسائل کو بنیاد بنایا گیا۔ علامت نگاری اور اساطیری مواد کو سامنے رکھ کر اہم تجربات کیے گئے۔ دیومالا کے حوالے سے افسانے لکھے گئے۔

سقوطِ ڈھاکہ کے حوالے سے نثر میں بہت کچھ لکھا گیا لیکن نظم میں اس کے اثرات زیادہ نظر نہیں آتے۔

ڈاکٹر وحید قریشی نے اُردو کا انشائی ادب کے نام سے کلاسیکی و جدید ادب کا ایک مجموعہ بھی مرتب کیا ہے جس میں رجب علی بیگ سرور سے لے کر آج تک کے ادبا کی کاوشیں شامل کتاب کی گئی ہیں۔ اس کتاب کو استقلال پریس نے چھاپا۔ اس میں قدیم انشائی ادب، مضمون نگاری اور جدید انشائی ادب کے حوالے سے دیگر اصناف کو شامل کیا گیا ہے یہ انتخاب ڈیڑھ صدی کے ادب کے سفر پر محیط ہے۔ لہٰذا اسے سامنے رکھتے ہوئے اُردو ادب کے ارتقاء کے سفر کو ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ اس انتخاب میں ڈاکٹر صاحب نے کوشش کی ہے کہ ادبی سرمائے کی چھان بین کر کے انتہائی ادب کے نمونے اکٹھے کیے جائیں۔ اس انتخاب کے دوران ڈاکٹر وحید قریشی نے رنگارنگ ادب پاروں کی شمولیت سے اپنے انتخاب کو وقیع تر بنا دیا ہے۔

☆☆☆

حوالہ جات (باب پنجم)

١ پیش لفظ ''مثنوی سحر البیان'' از میر غلام حسن، حسن دہلوی، مرتب: ڈاکٹر وحید قریشی، لاہور اکیڈمی، لاہور، ۱۹۶۶ء، صفحہ ۱۶۔ ۱۷۔

۲ اُردو نثر کے میلانات از ڈاکٹر وحید قریشی۔ مکتبہ عالیہ لاہور، ۱۹۸۶ء، صفحہ ۴۵۔۔

۳ ایضاً۔ صفحہ ۹۵۔

۴ وحید قریشی ڈاکٹر۔ تنقیدی مطالعے۔ کارواں پریس لاہور، ۱۹۶۷ء، صفحہ ۹۳۔

۵ ایضاً۔ صفحہ ۱۰۰۔

۶ ایضاً۔ صفحہ ۱۰۴۔

۷ وحید قریشی ڈاکٹر۔ دیباچہ مطالعۂ حالی دارالادب لاہور۔ ۱۹۴۱ء۔ صفحہ ۹، ۱۰۔

۸ وحید قریشی ڈاکٹر۔ مطالعۂ حالی۔ صفحہ ۲۵۔

۹ ایضاً۔ صفحہ ۶۶ تا ۶۷۔

۱۰ ایضاً۔ صفحہ ۱۹۴۔ ۱۹۳۔

۱۱ ایضاً۔ صفحہ ۱۹۳۔

۱۲ ضمیمہ اورینٹل کالج میگزین لاہور مقالہ مرزا محمد حسن قتیل۔ مئی ۱۹۴۸ء۔

۱۳ وحید قریشی ڈاکٹر، خسرو کا نظریۂ اسلوب اورینٹل کالج میگزین، نومبر ۱۹۵۰، صفحہ ۳۲۔ ۳۱۔

۱۴ وحید قریشی ڈاکٹر، جدیدیت کی تلاش میں، مقبول اکیڈیمی لاہور، ۱۹۹۰، صفحہ ۱۳۔

۱۵ ڈاکٹر وحید قریشی ''افسانوی ادب'' حرفِ اول از مرزا ادیب بقول اکیڈمی لاہور ۱۹۹۳ء۔ صفحہ ۴۔

۱۶ ایضاً۔ صفحہ ۱۹۔

۱۷ وحید قریشی ڈاکٹر۔ اُردو ادب کا ارتقاء۔ ایک جائزہ۔ القمر انٹر پرائزز، اُردو بازار لاہور۔ ۲۰۰۶ء۔ صفحہ ۱۱، ۱۲۔

۱۸ ایضاً۔ صفحہ ۳۵۔

☆☆☆

باب ششم

ڈاکٹر وحید قریشی اور نظریۂ پاکستان

ڈاکٹر وحید قریشی نے اردو تحقیق اور تدریس کے ساتھ ساتھ گذشتہ برسوں میں قومی نوعیت کے مسائل پر بھی بھرپور توجہ دی ہے۔ انہوں نے متعدد ایسے مقالات لکھے ہیں۔ جن میں ہمارے قومی مسائل، نظریاتی بنیادوں، تاریخی عوامل اور سیاسی عناصر کا گہرائی سے جائزہ لیا گیا۔ ان کے کام میں فکر و نظر کا تنوع پایا جاتا ہے۔ وہ ان اہلِ علم محققین میں سے ہیں جو بڑی پائیداری اور استقامت کے ساتھ وطن عزیز کی تاسیس کے بعد اس کی نظریاتی سرحدوں کا دفاع کرتے رہے۔ انہوں نے تحریکِ پاکستان کے تاریخی، تہذیبی، فکری اور دینی پسِ منظر کا جائزہ لیا ہے۔ انہوں نے علامہ اقبال اور قائد اعظم جیسے اکابرین رہنماؤں کے سیاسی نظریات اور قومیت کے تصورات کو بنیاد بنا کر ہمارے ملی احیائ کا روشن باب رقم کر دیا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ یہ رہنما برصغیر کی مسلم قوم کو محض ایک علاقائی اور وطنی و نسلی قوم نہیں جانتے بلکہ وہ اسے ایک امت تصور کرتے ہیں۔ علامہ اقبال نے تو مغرب کے گمراہ کن تصور قومیت کے عواقب و انجام سے بر وقت مسلمانوں کو خبر دار کیا اور اپنی اجتماعی خودی کے تحفظ پر زور دیا۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے تاریخ کے طالبعلم اور استاد ہونے کی حیثیت سے علامہ کے سیاسی افکار اور پاکستان کے اساسی اور ترکیبی عناصر پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ مسلمان قوم میں اجتہاد کی روش کو بھی اسلامی اقدار کا پابند قرار دیتے ہیں۔ اقبال کے ان اشعار سے اسناد حاصل کرتے ہیں۔

آزادی افکار سے ہے ان کی تباہی
رکھتے نہیں جو فکر و تدبر کا سلیقہ

ہو فکر اگر خام تو آزادئ افکار
انسان کو حیوان بنانے کا طریقہ

اس قوم میں ہے شوخیِ اندیشہ خطرناک
جس قوم کے افراد ہوں ہر قید سے آزاد

گو فکرِ خداداد سے روشن ہے زمانہ
آزادیِ افکار ہے ابلیس کی ایجاد

گویا اجتہاد کے لیے فکر کی پختگی کی شرط لازم ہے۔ یہ ایک ایسی داخلی بندش ہے جو معاشرے کے اقتدار اعلیٰ کو بے راہ روی سے روک سکتی ہے اور اسے ایک دستور العمل کے تابع بنا سکتی ہے۔

وہ اِن داخلی عناصر کا وجود مسلمان معاشرے کے لیے خیرِ کُل سمجھتے ہیں۔ جو اس کو تازگی افکار بخشیں اور اس کو بیرونی خطرات کے خلاف مضبوطی اور استحکام بخشیں۔

اِسلامی اور پاکستانی معاشرے میں ڈاکٹر صاحب نے جن افراد کو حکمران عناصر کے طور پر دیکھنا چاہا ہے۔ اس کے لیے مندرجہ ذیل اوصاف حمیدہ سے متصف ہونا ضروری ہے:

> معاشرے میں جدید عناصر کی آمیزش آہستہ آہستہ وارد ہو۔ عمل پیرا افراد اعلیٰ کردار کے مالک ہوں۔ نیز جن اوصاف حمیدہ کا وجود خلیفے یا امام کے لیے ضروری ہے۔ ان کا اطلاق اس جماعت پر بھی ہو گا جو امامت یا خلافت کی امین ٹھہرے گی۔ جب اسلامی تعلیمات کا مقصد وحید اعلیٰ کردار کی تشکیل و تکمیل ہی ہے تو پھر قانون ساز ادارے کے افراد کس طرح ان اوصاف کے خلاف عمل کر سکتے ہیں۔ جن کی اہمیت کو افراد ملت کے لیے ضروری قرار دیا گیا ہو۔[1]

ڈاکٹر وحید قُریشی اپنی تصنیف ''اقبال اور پاکستانی قومیت میں'' اپنے مضمون ''مسندِ خلافت یا مجلس قانون ساز۔۔۔ فکرِ اقبال کی روشنی میں'' میں مسلمانوں کے ملی تشخص میں مسئلہ خلافت کی اہمیت کو واضح کرتے ہیں۔ ترکی میں خلافت کے خاتمے نے عالم اسلام میں مسلمانوں کو اضطراب اور بے چینی سے دو چار کر دیا۔ یہی وہ نازک لمحہ تھا۔ جب اسلامی نظریہ قومیت کے مضبوط ایوانوں میں مغربی تصور قومیت بار پانے میں کامیاب،

ہونے لگا۔ جب کہ اقبال کا خواب اور نظریہ بقا یہ تھا کہ مسلمان ممالک الگ الگ ابھرتی ہوئی جمہوریتوں کی بجائے واحد مجلسِ اقوام بن کر نمودار ہوں۔ مسلمانوں کے ملی تشخص میں حائل ہونے والی قومیت کے مغربی تصور کی حوصلہ شکنی ہی مسلمانوں کو ایک واحد ملت کے تصور کی طرف لے جا سکتی ہے۔

اقبال وطن کے نفسیاتی پہلو کو تو مانتے ہیں۔ لیکن ملت واحد کا تصور زیادہ تقویت بخش ہے اور اسی کے ذریعے مسلمان فکری بنیادوں پر نسلی اور علاقائی عصبیتوں سے رہائی پا سکتے ہیں۔ بصورتِ دیگر دین و دنیا اور سیاست وکلیسا کے الگ الگ ہو جانے سے عالمِ اسلام بھی اس انحطاط کا شکار ہو جائے گا۔ جس کی زد میں مغربی تہذیب وتمدن آ چکا ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر وحید قریشی نے مقالات اقبال مرتبہ سید عبدالواحد معینی اور پروفیسر نکلسن کے نام اقبال کے خطوط کا حوالہ دیا ہے اور اس امر کی وضاحت کی ہے کہ علامہ نے تا حیات اسلامی جمہوریوں کو ایک براوری بن جانے کا درس دیا۔ ان کے خیال میں نسلی عصبیتوں، علاقائی اور ملکی عصبیتوں کو کھیلنے کا موقع اس وقت ملتا ہے۔ جب ریاست کے تار و پود سے اخلاقی اور دینی عناصر کو خارج کر دیا جائے اور لادینی تصورات فروغ پانے لگیں۔ اقبال نے خلافت کے مسئلے پر اس لیے زور دیا کہ وہ مسلمانوں کو ایک نظریاتی پلیٹ فارم پر جمع ہو جانے کا مشورہ دیتے ہیں لیکن خلافت کا فردِ واحد جب اختیارات کو احسن طریق پر استعمال نہ کر سکے تو یہ اختیارات فرد کی بجائے جماعت کو منتقل ہو جانے چاہئیں۔ اس طرح جمود کی بجائے حرکت وعمل کی کیفیت جنم لے گی۔ بے راہ روی سے بچنے کا طریقہ وہ ضابطہ آسمانی ہے جس کی رُو سے خلیفہ بھی اپنے اعمال کا اتنا ہی جوابدہ ہے۔ جتنا رعایا کا۔ کوئی دوسرا فرد خلیفہ قانون سے بالاتر نہیں۔ لیکن ایشیاء میں سیاسی مسائل اور تاریخی جبر کی وجہ کچھ اور ہے۔ جس کا اظہار ڈاکٹر وحید قریشی یوں کرتے ہیں:

> یہ امر تکلیف دہ ہے کہ داخلی ہم آہنگی کے لیے کسی اصول کی تلاش میں ہماری تمام مساعی ناکام ہو چکی ہیں۔ یہ ناکامی کیوں؟ غالبًا ہمیں ایک دوسرے کی نیت پر شبہ ہے اور در پردہ ہم ایک دوسرے پر غلبے کے خواہاں ہیں یا پھر باہمی تعاون کے ارفع مقاصد کی خاطر ہم حالات کی دی ہوئی ان اجارہ داریوں کو چھوڑنے کو تیار نہیں اور یوں اپنی انانیت کو قومیت کے پردے میں چھپاتے ہیں۔ بظاہر تو وسیع القلبی پر مبنی وطنیت کا پرچار کیا جاتا ہے۔ لیکن در پردہ ذات پات اور مخصوص قبائل سے وابستگی کی بنا پر تنگ نظری ملی ہے۔

شاید ہم یہ حقیقت تسلیم کرنے کو تیار نہیں کہ ہر طبقہ کو اپنے مخصوص ثقافتی روایات کے مطابق آزادانہ نشوونما کا حق ہے۔۲

ہندوستان میں مسلمانوں کے علاوہ بھی بہت سے مذاہب کے لوگ بستے تھے لیکن وطنیت کے وسیع تر نقطۂ نظر کے مطابق یہ کہنا کہ مخصوص طبقات پر مبنی صوبوں کی تشکیل نہ کی جائے۔ یہ کہنے کے مترادف ہوگا کہ بین الاقوامی نقطۂ نظر کے لحاظ سے جداگانہ قومیں نہیں ہونی چاہئیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ قوموں کی مکمل خودمختاری کے بغیر بین الاقوامی مملکت کی تشکیل بھی مشکل ہو جاتی ہے۔ اب رہا پاکستان بننے کے بعد اس کی ثقافتی، تمدنی اور تہذیبی بنیادوں کا مسئلہ تو یہ تینوں اساس کرتی ہیں۔ اسلام کے سنہری اصولوں پر۔ اس لیے کہ مسلمانوں کی حب الوطنی ارضی اور مادی نہیں بلکہ دینی احکامات اور معتقدات کی بجا آوری کے لیے وطنی تشخص پر منحصر ہے۔ اس کا عام فرد کی زندگی میں یہ مقام ہوتا ہے کہ وہ ثقافتی اور تاریخی روایات کے ساتھ زندہ رہ سکے۔ ایک ایسا الگ وطن جس میں ارضی رشتوں کے ساتھ ساتھ تہذیبی رشتوں کو بھی استوار کیا جا سکے۔ اقبال اگر مسلمانوں کے لیے الگ وطن کی تمنا کرنے لگے۔ تو وہ ان معنوں میں کہ مسلمان تاریخی روایات اور کلچر کو محفوظ و مامون کر سکیں۔ اپنے افکار اور امکانات کے ساتھ جی سکیں۔ اپنی معاشرتی زندگی میں توازن کی بنیادیں تلاش کر سکیں۔ درحقیقت مسلمانوں کو وطن اس لیے درکار تھا کہ وہاں اپنے معتقدات کی حفاظت کا سامان مہیا کر سکیں۔ اس الگ مملکت کے خلاف ہندو، انگریز سازشیں تو کی گئیں۔ کبھی پین اسلام ازم کا الزام عائد کیا گیا تو کبھی یہ کہا گیا کہ اگر ہندوستان کے شمالی حصے الگ وحدت بن گئے تو ہندوستان کی سرحد کا کیا ہوگا۔ کبھی اسے مسلمانوں کا سیاسی منصوبہ قرار دیا گیا۔ لیکن ان تمام الزامات کا اصل مقصد مسلم دنیا پر یورپی جارحیت کا جواز مہیا کرنا تھا۔ بہرحال اقبال کی نظر میں اب واحد حل الگ مملکت کا قیام ہی تھا۔ جس کی بنیاد اسلامی نظریہ ہونا چاہئے اس کا جواز بھی یہ تھا کہ ہندوستان کے مسلمان بحیثیت قوم ایک الگ قسم کی قوم تھے اور ایسی تاریخی روایات کے حامل تھے جن کی مثال کہیں اور نہیں ملتی۔ وہ اپنے ثقافتی خطوط پر اپنی نشوونما کرنا چاہتے تھے۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے بالائی اور زیریں ایوانوں میں اپنے حقوق کے تحفظ کے لیے ۳۳ فی صد نمائندگی کا مطالبہ کر دیا۔ بہرحال مذہب کے علاوہ اپنی روایات اور ثقافت کے جن بنیادی عناصر کے لیے تشکیلِ پاکستان کا مطالبہ کیا گیا وہ اسلام، اردو زبان، ارکان مذہب، اسلامی نظریہ حیات اسلامی نظام تعلیم، اسلامی قانون، آزادی رائے کے مسائل سب شامل تھے۔

اسلام کے بعد اس ضمن میں اردو زبان کی باری اس لیے پہلے آتی ہے۔ کہ یہ رابطے کی زبان ہونے کے ساتھ ساتھ ہماری قومی شناخت اور ملی تشخص کا واحد ذریعہ تھی۔ زبان وسیلۂ اظہار ہے۔ زبان ہی طرزِ حیات اور طرزِ فکر کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ لیکن غور کا مقام ہے کہ کون سی اردو زبان وہ زبان جو مہاجرین اپنے ساتھ دہلی اور لکھنؤ کا سرمایہ افتخار بنا کر ساتھ لائے یا کہ پاکستان کی سرزمین میں اپنے جڑیں بنا کر رہنے والی زبان جو چاروں صوبوں کو ساتھ لے کر چلی ہے۔ کیونکہ ہمارا ماضی ہمارا حال نہیں۔ نئی لسانی تشکیلات کا مسئلہ زبان کے ساتھ ساتھ اردو کلچر، علاقائی کلچر اور ملی کلچر کا بھی مسئلہ ہے۔

نئی لسانی تشکیلات اور پاکستانی قومیت میں رابطے کی زبان کے بارے میں بحث کرتے ہوئے ڈاکٹر وحید قریشی بڑی حقیقت پسندی اور مستقبل شناسی سے کام لیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> اردو زبان کو پاکستان کی ملکی زبان قرار دیتے ہوئے اس بات کا احساس و ادراک بھی ناگزیر ہے۔ کہ اردو کو صوبائی زبانوں سے ایسا رشتہ استوار کرنا چاہیئے کہ مغائرت کی جگہ اتحادِ فکر و عمل کی راہیں ہموار ہوں۔۔۔ اگر اردو زبان کی طنابیں کس کر اسے زندہ حوالوں کی بجائے مردہ حوالوں کا پابند کیا گیا۔ اگر اردو کے مقامی بول چال سے قریب آنے کا فطری عمل دلی اور لکھنؤ سے سند ڈھونڈنے کی لاحاصل کوشش میں صرف ہو گیا۔ اگر اردو کو بطور زندہ زبان اپنی جڑیں پاکستان کی سرزمین میں پیوست کرنے کا موقع نہ ملا تو مستقبل کا مؤرخ ہمیں کبھی معاف نہیں کرے گا۔ اردو میں قومی اور بین العلاقائی اور رابطے کی زبان رہنے کی پوری صلاحیت ہے۔ لیکن وہ اردو دلی اور لکھنؤ کی اردو نہیں ہوگی۔ پاکستان کی اردو ہو گی۔ وہ جسے مقامی روزمرے، مقامی محاورے، مقامی تذکیر و تانیث اور مقامی معاشرتی زندگی کا عکاس ہونا پڑے گا۔[۳]

دراصل ملکی سالمیت اور پاکستانی قومیت کی خاطر زبان کے کردار کو نظر انداز کرنا ممکن نہیں۔ ڈاکٹر وحید قریشی کے خیال میں اردو محض اب قومی و سرکاری زبان ہی نہیں۔ دلوں اور ذہنوں میں رابطے کا وسیلہ بھی ہے۔ برصغیر میں آزاد فہم ریاست کے مطالبے کے دوران زبان کا مسئلہ بھی توجہ طلب تھا۔ اردو زبان اپنے اندر عربی و فارسی کی مہک سموئے ہوئے تھی اور ان زبانوں کی روایات کو ساتھ لیے چل رہی تھی۔ گویا اس کی عام فضا اسلامی

رنگ میں رنگی ہوئی تھی۔ قائد اعظم نے بھی اپنی تقاریر میں اردو زبان کی اہمیت کو بار بار باور کرایا۔ پاکستان بننے کے بعد پاکستانی قومیت اور ملی تشخص کے مقاصد پورے کرنے کے لیے اردو زبان کو ہر صوبے میں متعارف کرانا اور اس کی اہمیت کو تسلیم کرنا ضروری تھا۔ کیونکہ علاقائی قومیت اپنی جگہ ایک الگ حقیقت تھی۔ سماجی سطح کے زندہ حقائق کا لسانی سطح پر حل ضروری تھا۔ کیونکہ اردو پاکستان کے کسی خطے کی زبان نہ تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس امر سے بھی انکار ممکن نہیں کہ اردو واحد بین الصوبائی زبان بھی تھی۔

اس کے ذریعے صوبے باہمی اشتراک اور ہم آہنگی پا سکتے تھے۔ اردو بول چال کا کوئی واضح حلقہ ہوسکتا تھا تو وہ کراچی اور اس کے آس پاس کا علاقہ ہے۔ باقی پاکستان میں اشتراک کی زبان لسانی، سماجی اور سیاسی سطح پر حل طلب مسئلہ ہے۔ کیونکہ مرکز گریز رجحانات نے دوسرے میدانوں کے علاوہ لسانی مسائل کو بھی علاقائی اور صوبائی حدود کے حوالے سے دیکھنا شروع کر دیا تھا۔ اب ضرورت اس امر کی ہے کہ پاکستان کی قومیت کی تشکیل میں رخنہ نہ پڑے۔ علاقائی اور صوبائی عصبیتیں حالات کو اور بھی پیچیدہ نہ بناسکیں۔ یہ معاشرہ کسی بحران کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ پاکستان میں لسانی مسائل تین مختلف اطراف میں کارفرما رہے ہیں۔ ایک رُخ خالص ادبی اور علمی ہے۔ دوسرا رُخ سماجی افکار سے مربوط ہے۔

تیسرے کا تعلق سیاسی مسائل کے ساتھ ساتھ ہے۔ اس عمل کے علاوہ اردو کے مسائل سیاسی تحریکات سے بھی وابستہ رہے۔

اردو زبان کو پاکستان کی قومی زبان بنانے کا عزم تحریکِ آزادی میں ایک فعال عنصر کے طور پر شامل تھا۔

اب اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ زبان کی ترویج اور اشاعت نظامِ تعلیم کے ساتھ مربوط و منسلک ہے۔ اب اردو کو ذریعہ تعلیم بنا دیا گیا اور اس کے ساتھ ساتھ اس بات پر بھی زور دیا گیا کہ ہمارا نظامِ تعلیم ہمارے سماجی، اقتصادی اور مذہبی مسائل کا حل پیش کر سکے۔ لیکن چونکہ ہماری ریاست ایک نظریاتی ریاست ہے۔ اس لیے یہاں اسلام اور اسلام سے وابستگی رکھنے والے ذہنوں کی اشد ضرورت ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے جہاں ہماری ریاست کے بنیادی عناصر کا ذکر کیا ہے۔ وہاں ایسا نظامِ تعلیم بھی اب رائج کرنے کی ضرورت پر زور دیا ہے جو کہ ہماری روایات و اقدار اور ثقافت و مذہب کی قدروں سے ہم آہنگ ہو۔

کیونکہ پاکستانی معاشرے کی بنیاد اسلام پر ہے لیکن نئے نظامِ تعلیم کو عملی شکل دینے کا واضح تصور ابھی موجود نہیں۔ معاشرتی تبدیلیاں نئے مسائل لائی ہیں۔ اب کئی چیزیں نظریاتی طور پر مثالی لیکن عملی طور پر مردہ ہیں۔ اسی طرح بہت سی چیزوں کی تفاصیل میں جانے سے ان کا اصل مقصد ختم ہو جاتا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے۔ کہ نہ تو یکسر قدیم نظام کی نفی کر دی جائے۔ نہ ہی جدید تعلیم کو خامیوں کا مجموعہ قرار دیا جائے۔ بہرحال مذہب کے خاص ستون پر ہمارے تعلیم کی بلند و بالا عمارت کو کھڑا کرنا ڈاکٹر وحید قریشی کے خیال میں وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔

> آج کی متمدن دنیا میں جب علوم و فنون پہلے کے مقابلے میں کہیں زیادہ وسعت اختیار کر چکے ہیں اور زندگی اتنی سادہ نہیں جتنی قرونِ وسطیٰ میں تھی۔ تو تصادم اور آویزش کا عمل بھی تیز تر ہو چکا ہے۔ اس سارے بحران سے باہر نکلنے کی ایک ہی صورت ہے کہ ہمارے ہاں ایسا نظامِ تعلیم رائج ہو۔ جس کی بنیاد قرآن اور سنت پر ہو اور اس کی تفصیلات دورِ حاضر کی معاشرتی زندگی کے حوالے سے متعین کی جائیں۔[۴]

ڈاکٹر وحید قریشی خود ایک ماہرِ تعلیم ہیں اور پاکستانی قومیت کے مسئلے میں تعلیم کے مسائل کو سلجھانا بے حد ضروری سمجھتے ہیں۔ ان کے خیال میں مغرب سے درآمد کردہ نظامِ تعلیم ہمارے ملک کی روایات اور اس کے مخصوص حالات کے منافی ہے۔ یہ ناکام ترین نظام ہے۔ ہمارے لیے وہی نظام بہتر ہے جو ہمارے مسائل حل کر سکے۔ پہلی قسم کے مسائل کا تعلق پرانے نظامِ تعلیم سے ہے۔ جو درحقیقت میکالے کے ذہن کی اختراع تھا اور جس کی ذہنی فضا انگلستان میں تھی۔ اس نظامِ تعلیم کا مقصد حکومت کی مشینری چلانے کے لیے کلرک پیدا کرنا تھا جبکہ پاکستان ایک نظریاتی ریاست ہے۔ اس میں اعلیٰ ترین انداز پر عامل اور بلند نصب العین رکھنے والے افراد کی ضرورت ہے۔ میکالے کے نظامِ تعلیم کے مطابق ایسے افراد پیدا کرنا وقت کی ضرورت تھا جو جسماً دیسی لیکن ذہناً انگریز ہوں ایسی غلامانہ ذہنیت برطانوی استعمار کو تقویت دینے کا سبب ہو۔ پاکستانی معاشرے کی بنیاد اسلام پر ہے۔ قومی تعلیمی کمیشن ۱۹۶۱ء نے بھی اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے۔ قومی تعلیمی کمیشن نے جس نظامِ تعلیم کی سفارش کی ہے اس نے پرانے نظام کی نفی کر دی ہے۔ اس میں امتحان کے میکانکی طریق کی

مخالفت کی گئی ہے اور تعلیم و تدریس کے عملی پہلوؤں پر زور دیا گیا ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی کے خیال میں نظامِ تعلیم میں تبدیلی کے ساتھ ساتھ مشرقی زبانوں کی بقا کا مسئلہ بھی اہم ہے۔ ان کے مطابق برطانوی اقتدار سے قبل دور مغلیہ میں مشرقی زبانوں کو جو اہمیت حاصل تھی اور جسے ابتدا میں انگریزی حکومت نے اپنی بنیادیں مستحکم کرنے کا ذریعہ بنایا۔ میکالے کے بعد ختم ہوگئی۔ اب مشرقی زبانوں کے خلاف کھلم کھلا عمل شروع ہو گیا۔ ان کے خیال میں حکومت کو اپنی رقم مغربی علوم کی ترویج پر صرف کرنا چاہتے اور ہندوستان کے غیر متمدن باشندوں کو تہذیب یافتہ بنانے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ اس ضمن میں بعض مثالی زبانوں کے بارے میں زہرناک قسم کے جملے کہے گئے اور مغربی علوم کی حوصلہ افزائی اور اشتراکی زبانوں اور علوم کی مخالفت کے رواج کی بنیاد پڑ گئی۔ تہذیبی اور ثقافتی طور پر زندہ کہلانے کے لیے اپنی زبانوں کی حفاظت بڑی اہم شے ہے۔ جس کے بغیر وحدت کا خیال پارہ پارہ ہو جاتا ہے۔ میکالے نے ایک پودا لگایا جو اب منافرت کے برگ و بار سے لد گیا تھا۔ ابتدا میں طے یہ ہوا تھا کہ پنجاب یونیورسٹی کی تشکیل اور اورینٹیل کالج کا قیام مشرقی زبانوں کے احیاء کے لیے کیا گیا۔ مگر بعد میں مشرقی علوم کی نمائندہ حیثیت قائم نہ رہ سکی۔ ایک اسلامی معاشرے میں جیسا کہ پاکستان ایک نظریاتی ریاست ہے میں چند بنیادی سوالات قومی و ملی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ مثلاً اس معاشرے میں مذہب کو کیا دخل ہے۔ زبانوں کی کیا اہمیت ہے؟ نظامِ تعلیم کیسا مناسب ہے۔ نوجوان نسل کی ذہنی پرداخت کیونکر ممکن ہے۔

ایسے سوالوں کا جواب ہمیں مذہبی طرزِ حکومت اور اسلامی نظام کے نفاذ کے ذریعے تلاش کرنا چاہیئے۔ ڈاکٹر وحید قریشی ایک انٹرویو میں حسن رضوی کے سوال کے جواب میں فرماتے ہیں:

> میں سمجھتا ہوں کہ تحریکِ پاکستان محض جغرافیئے کے حصول پر مبنی نہیں تھی۔ بلکہ اس وقت اس کی روشنی میں جو دعوے کیے گئے تھے ان کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کے لیے ایسا خطۂ ارض تلاش کیا جائے جہاں وہ اقدار کے مطابق اپنی زندگی بسر کرسکیں۔ یہ دوسری بات کہ ملک حاصل کرنے کے بعد ان لوگوں کے ہاتھ میں زمامِ اختیار چلی گئی جو اس بات پر یقین نہیں رکھتے تھے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اپنا نصب العین نظروں سے اوجھل ہوتا رہا اور اس صورتحال میں پاکستان کو ہمیشہ بہت سے مد و جزر کا سامنا رہا ہے۔ ۵

دراصل پاکستان بنانے کے ذمہ دار متوسط طبقے کے افراد تھے جبکہ اختیارات ملکی سرمایہ دار طبقے کے ہاتھ میں چلے گئے۔ جس کی وجہ سے ہمارا نصب العین ہمارے سامنے نہ آ سکا۔ بہرحال ایک زندہ ثقافت رکھنے والے ملک پاکستان میں زبانوں کی تدریس کے مقاصد میں تین اہم نقطہ نظر سامنے آتے ہیں۔ ایک کاروباری، دوسرا تہذیبی اور ثقافتی اور تیسرا علمی۔ اس کے ساتھ ساتھ افراد قوم کو اپنے قومی ورثے کو ہمدردانہ نقطۂ نظر سے دیکھنے کی عادت بھی پیدا کرنی چاہیے۔ ڈاکٹر وحید قریشی کی رائے میں مشرقی علوم کو ان کا حق ملنا چاہیے۔ جو غیر ملکی حکومت ان سے اپنے سیاسی اہداف کو حاصل کرنے کے لیے چھین چکی ہے۔ تعلیم ہماری قوم کے مستقبل کا سوال ہے۔ کردار کی تعمیر میں مدد و معاون ہونے والے افکار و خیالات کو بھی جگہ ملنی چاہیے۔ اب ملی و مذہبی تصورات کو قوم کے ذہن نشین کرانے کی ضرورت ہے۔ محکمہ تعلیم کے موجودہ نصاب میں نظر ثانی کی اشد ضرورت ہے۔ ابتدائی درجوں میں زبان کی تدریس کمزور بنیادوں پر استوار ہے۔ بول چال کی شائستہ زبان سکھانے کے لیے ذہنی سطح کے مطابق برموقعہ محل کے الفاظ استعمال کرانے کی ضرورت ہے۔ درس و تدریس کی دنیا عملی زندگی سے قریب تر ہونی چاہیے۔ مشرقی زبانوں کے نصابات میں طالبعلم کا قریبی ماحول شامل ہونا چاہیے۔ حقیقت یہ ہے کہ پاکستان کا تصور ایک خاص پسِ منظر کا حامل ہے۔ اس کے بنیادی نظریات ہمارے مذہب اور تصورات کو لے کر آگے بڑھتے ہیں۔ مادی اور روحانی قدروں کا امتزاج مستقبل کے پاکستانی مزاج کو تشکیل دینے میں اہم کردار کرے گا۔ اسی طرح علمی و دینی سرمائے اور ایک خاص نقطۂ نظر کو اپنے نصاب کا اہم حصہ بنانا ہمارا فرض ہے۔

ڈاکٹر وحید قریشی نے تعلیمی جائزے میں پاکستانی قومیت کی نئی تشکیل میں تعلیم اور نصاب کو خاص اہمیت دی ہے۔ جدید پاکستانی ذہن کی تعمیر کے لیے مذہبی و اخلاقی اقدار و نظریات کی ترویج ضروری ہے۔ دیگر زبانوں کی تعلیم و تدریس ہمارے ماحول اور معاشرت کے عین مطابق ہونی چاہیے۔ زبانوں کے وسیلے سے اپنے ملی سرمائے تک رسائی حاصل کرنے کا رجحان پیدا کرنے کی کوشش چاہیے۔

مشرقی علوم کے نئے نصاب کی ضرورت ہر درجے پر ہے۔ ایف۔اے اور بی۔اے کے نصاب میں مواد پر زیادہ زور ہونا چاہیے۔ لیکن یہ کام بتدریج کرنے کی ضرورت ہے۔

فارسی چونکہ مسلمانوں کے تشخص کی علامت تھی جسے انگریز نے ہٹا کر در پردہ اپنے خوف و ہراس کا

اظہار کیا لیکن اب ایک آزاد وطن کے آزاد شہری ہونے کے ناتے ہمیں اس امر کا احساس کرنا چاہئے۔ بلکہ اس زبان کو ایک مسلم شناخت کا ذریعہ سمجھ کر اپنے طالب علموں کو سمجھائیں اور اس کے نصاب کو لسانیات کے تقاضوں کے ہم آہنگ کر لیں:

> اقبال کے علاوہ پاکستانی طلباء کے لیے پاک و ہند کے فارسی ادب کا وہ عظیم سرمایہ جس میں ہمارے علمی خزانے موجود ہیں داخل نصاب کر چاہئے۔ ہمارے نصاب میں کلاسیکی فارسی نظم و نثر کا معتدبہ حصہ پاک و ہند کے فارسی ادب پر مشتمل ہونا چاہئے۔ اسی طرح ایران کے جغرافیے اور ایران شناسی کی بجائے پاک و ہند میں فارسی ادب کی تاریخ کا موضوع زیادہ مناسب ہوگا۔ نئے نظام میں کلاسیکی ادب اور قدیم علمی سرمائے کو مناسب جگہ دیے بغیر ہم اپنی ملت کی تشکیل نہیں کر سکتے۔ [۲]

اسی طرح ان گمراہ کن کتابوں کا مسئلہ بھی حل کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ جو امدادی کتب بن کر علمی تگ و دو کے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ بن گئی ہیں۔ ہمارے علوم کو ہمارے لیے تہذیبی اور روحانی سرمائے کی باز یافت کا ذریعہ بن جانا چاہئے۔ پورے نظام تعلیم میں مضامین کی درجہ بندی کی ضرورت ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی تمام علوم اور جملہ مضامین کو دین کے ساتھ اپنا رشتہ استوار کرنے کی ضرورت پر زور دیتے ہیں۔ قرآن کی روشنی میں کائنات کے مطالعے کی اہمیت طلباء کے ذہنوں میں راسخ کی جائے۔

۱۹۴۷ء کے بعد سے جتنے بھی تعلیمی کمیشن بیٹھے ان میں سے ہر ایک نے اس صداقت کو اپنایا کہ پاکستان کی نظریاتی ریاست میں نظام تعلیم ایک اہم اور مؤثر کردار ادا کرتا ہے۔ لیکن اس اقرار کے باوجود انگلستان اور امریکہ کے نظام تعلیم کی پیروی کی گئی۔

آج سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی نے فاصلے سمیٹ دیے ہیں۔ اعتقادات اور مادی افکار متصادم ہیں۔ لیکن اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ جسے پوری کائنات میں زندگی کی حقیقت کے طور پر قبول کیا جانا چاہئے۔

ڈاکٹر وحید قریشی نے اس امر پر زور دیا کہ دین و دنیا، روح اور مادہ، ظاہر اور باطن ناقابلِ تقسیم اکائی ہیں اور ان کو الگ نہیں کیا جا سکتا۔ مادہ اور روح میں دوئی پیدا نہیں کی جا سکتی ہے۔ ہماری روحانی اور اخلاقی

اقدار دائمی ہیں اور تمام تعلیمی ضروریات کو اسی مرکزی نقطے کے گرد گردش کرنا ہوگی تاکہ طلباء کے ذہن میں انتشار پیدا نہ ہو اور فرد کی داخلی و خارجی زندگی میں فاصلہ پیدا نہ ہوسکے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر صاحب اقبال کے تصورِ تعلیم کو مثالی قرار دیتے ہوئے ان اشعار کا حوالہ دیتے ہیں۔

؎ علم را برتن زنی مارے بود
علم را برجاں زنی یارے بود

؎ علم را مقصود اگر باشد نظر
می شود ہم جادہ و ہم راہبر

علم تفسیرِ جہانِ رنگ و بو
دیدہَ و دل پرورش گیرد ازو

شیخِ مکتب ہے اک عمارت گر
جس کی صنعت ہے روح انسانی

نکتہَ دلپذیر تیرے لیے
کہہ گیا ہے حکیم قاآنی[۶]

ہمارے وطن میں سیاسی حالات اور سماجی تغیرات نے قومی مقاصد اور اصل زندگی کے درمیان بُعد پیدا کر دیا ہے۔ ذہنی زندگی اسلامی جبکہ بیرونی زندگی یورپ کے اصولوں کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ہے۔

بہر حال دل و نگاہ کے ساتھ ساتھ علوم کو مسلمان کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی کا خیال ہے کہ اسلام ایک مؤثر عنصر کے طور پر ہمارے شعبۂ تعلیم میں داخل ہونا چاہئے۔ اساتذہ کرام کے ساتھ ساتھ والدین اور معاشرے کو بھی اپنا کردار نبھانا چاہئے۔ دین و دنیا کو باہم مربوط ہونا چاہئے۔ مسلمانوں کے عقائد و افکار کو باطنی و خارجی دونوں اشکال میں صورت گر ہونا چاہئے۔ گویا تعلیم کے بارے میں بنیادی رویے کو بدلنے کی اشد ضرورت ہے۔ موجودہ بحران سے باہر نکلنے کی یہی صورت ہے۔

ڈاکٹر وحید قریشی نے اس مقالے میں کئی اہم سوالات اٹھائے ہیں جن کا تعلق ہماری تہذیبی، ثقافتی اور مذہبی زندگی سے تو ہے لیکن مستقبل قریب میں پیش آنے والے ذہنی، اخلاقی اور اجتماعی بحرانوں سے بھی ہے۔ مثلاً علوم کی درجہ بندی کیسے کی جائے۔ دینی علوم کو دیگر علوم کے مقابلے میں کیا اہمیت دی جائے۔ ذریعہ تعلیم کون سی زبان ہو۔ ظہور پاکستان کے بعد سے زبان کے مسئلے کو حل کرنے کی ذمہ دارانہ کوششیں نہیں کی گئیں۔ اردو کو پاکستان میں ایک نئی اور الگ تہذیبی صورتحال کا سامنا ہے۔ مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان دو الگ قومی زبان رکھنے والے خطے بن گئے۔ سقوطِ مشرقی پاکستان کے بعد سے لسانی مسئلہ مغربی پاکستان کے صوبوں کا مسئلہ ہو گیا ہے۔

حصولِ پاکستان کے بعد تعمیرِ پاکستان کی ضرورت تھی۔ جبکہ ہم نازک اور بنیادی سوالوں میں الجھے رہے اور جواب حاصل نہ کر پائے۔ ہم ایک ترقی پذیر ملک کے باشندے ہیں۔ جن کا مقصدِ حیات وطن کی تعمیرِ نو اور خوشحالی کا حصول ہونا چاہئے۔ لسانی معاملات ہوں یا تعلیمی سب کو وطن کے مفاد کی روشنی میں حل کیا جانا چاہئے۔ عربی و فارسی کی تدریس میں بھی ہمارے وسیع تر ملی تشخص کا خیال رکھنا چاہئے۔ یہ دونوں زبانیں ہمارے اجداد کی زریں روایات کی علم بردار ہیں۔ اسلامیات کے نصاب کو بھی دینی و ملی تقاضوں کے مطابق تبدیل ہونا چاہئے۔ ملک میں ایک تعلیمی نظام رائج کرنے کی ضرورت ہے تاکہ ہم کثیر المقاصد ہونے کے انتشار سے بچ کر قدامت اور جدیدیت کے مابین توازن برقرار رکھ سکیں اور تعلیم کے غرض و غایت، اور مذہب کے اصول وضوابط کے ساتھ آنے والی نسلوں کو احترام آدمیت کا سبق دیں۔ تاکہ وہ پاکستان کے باوقار پُر اعتماد، اور ذمہ دار شہری بن سکیں۔

قیامِ پاکستان کے بعد مسلمانوں کو اس ملک میں کئی مسائل کا سامنا تھا۔ فکری اور تہذیبی سطح پر جو

انقلاب رونما ہو رہے تھے۔ وہ کسی طوفان کی آمد کا پتہ دیتے تھے۔ مغربی علوم و اقدار غلامی کے دور میں ہی اس خطے پر اپنا رنگ جما چکے تھے اور یہاں کے اذہان ابھی اس اثر سے نکلنے نہیں پائے تھے اور اپنے نظام اخلاق و مذہب میں توڑ پھوڑ کے عمل کو خاموشی مگر بے حسی سے برداشت کر رہے تھے۔ یہ ہمارے نظام اخلاق پر شدید دباؤ کے عمل کو بھی ظاہر کرتا ہے۔ اخلاقی اقدار کا انحطاط اور فکری سطح پر نئے مسائل کا پیدا ہو جانا اس امر کی علامت ہے کہ ہم بیسویں صدی میں علم کی حدود کی بے پناہ وسعتوں کے پیچھے کہیں گم ہو کر نہ رہ جائیں۔ کیونکہ ملک و ملت کی تہذیبی و اخلاقی تنظیم پہلی ترجیح ہونی چاہئے اور مغربی علمی سرمائے سے استفادہ دوسرا عمل۔ پاکستان کے فکری، لسانی اور تعلیمی مسائل بے شمار سہی۔ لیکن ان کے اسباب و عوامل کا تجزیہ تاریخ کے اس موڑ پر ناگزیر قرار دیا جاتا ہے۔ اب فہم و فراست کے ذریعے ہی حقائق کی درست تعبیر و توضیح کی راہیں کھل سکتی ہیں۔ کیونکہ آج کی مہذب اور متمدن دنیا میں علم و فن بے حد وسعت اختیار کر چکے ہیں۔ داخلی اور خارجی سطح پر ہمیں نت نئی آویزشوں کا سامنا ہے۔ اقتصادی اور سیاسی مسائل دنیا کو درپیش ہیں۔ تسخیر کائنات اور سرمایہ و محنت کی آویزش، سائنسی ایجادات۔ اس سارے بحران سے نمٹنے کے لیے انسانیت کو قرآن و سنت سے رجوع کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمارے وطنِ عزیز کی بنیادیں دینِ اسلام پر استوار ہیں۔ اس کے لیے سوائے قرآن و سنت کے اور کوئی نظام مفید اور کارگر ثابت نہیں ہو سکتا۔ یوں بھی تعلیم کا مقصد ہی انسان کو بہتر انسان بنانا ہے۔ ہمارا وطن دنیا کی سرزمین پر پہلی نظریاتی ریاست ہونے کا اعزاز رکھتا ہے۔ یہاں اسلام کو زندگی کی اعلیٰ ترین قدر کے طور پر قبول کیا جاتا ہے۔ لیکن مذہب کی یہ بنیادی اہمیت تسلیم کر لینے کے باوجود اسے زندگی کے حقیقی مسائل میں ایک مؤثر قوت کے طور پر قبول نہیں کیا۔ اس طرح ان بنیادی اور اساسی مسائل نے جنم لیا۔ جو کسی بھی قوم کو داخلی اور باطنی انتشار سے دوچار کر سکتے ہیں۔

اس سطح پر آ کر ڈاکٹر وحید قریشی کے سامنے کئی سوالات ہیں۔ پاکستان کی قومیت کی تشکیل کن خطوط پر ہو؟ پاکستانی قومیت کے عناصر ترکیبی کیا ہیں؟ ہمارا نظام فکر کس طرح دوسرے ممالک اور ریاستوں سے مختلف ہے۔ ہماری روحانی اور مادی قدریں کون سی حدود کی حامل ہیں۔ البتہ یہ حقیقت تو طے ہے کہ مسلمانوں کا قومی تشخص اخلاقی، روحانی اور مذہبی اقدار پر منحصر ہے جغرافیائی حدود کا پابند نہیں۔

ان حقائق کو جاننے کے لیے ضروری ہے۔ کہ بہت آغاز میں جا کر قائداعظم کی مساعی اور تحریکِ

پاکستان کا جائزہ لیا جائے اور حال کے مسائل وافکار کی پردہ کشائی کی جا سکے۔ کہ وہ کون سے حالات تھے۔ جن میں پاکستان کا مطالبہ کر دیا گیا۔ ڈاکٹر وحید قریشی فرماتے ہیں:

> قائدِ اعظم نے تاریخی شعور کی مدد سے گاندھی جیسے سیاست دانوں کی ہر چال کا مقابلہ کیا۔ لارڈ ویول کی برصغیر سے روانگی کانگریس کی بہت بڑی کامیابی تھی۔ کرپس سے پسِ پردہ جو نامہ و پیام ہو رہے تھے۔ نیز ریڈ کلف ایوارڈ میں جانبداری کے جو کھیل کھیلے گئے ان سب کا مقابلہ اس عظیم رہنما نے کیا اور سات برس کی مختصر مدت میں وہ لڑائی جیت لی جس کے لیے مسلمان صدیوں سے اپنے آپ کو مجبور اور بے دست و پا محسوس کر رہے تھے۔ قائدِ اعظم نے پاکستان کی نظریاتی بنیادوں کی مدد سے مسلمانوں کو منظم اور متحد کر کے ایک ایسا راستہ دکھایا کہ پاکستان دنیا کے نقشے پر ایک حقیقت بن کر ظہور میں آ گیا۔ مطالبۂ پاکستان کی نظری بنیادوں کو عملی شکل دینے میں قائد اعظم کی مساعی کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ ۷

قیام پاکستان اسلامی تصور قومیت کا عملی پیکر ہونا چاہیئے۔ لیکن عقیدے اور عمل کے درمیان تفاوت نے ایسا ہونے سے روکا۔ معاشرتی سطح پر جو بحران پیدا ہوتا ہے۔ وہ قوم کی جڑوں میں گہرائیوں تک اُتر جاتا ہے۔ افہام وتفہیم کی فضا قائم کیے بغیر اس وطن میں ترقی کی راہیں مسدود ہونے کا امکان پیدا ہونے کا خطرہ ہے۔ ملکی سالمیت اور پاکستانی قومیت کے لیے جہاں اہم ترین عناصر وعوامل میں حکومت، مذہب اور نظام تعلیم کے پہلو ہیں۔ بالکل اسی طرح زبان کا کردار بھی شامل ہے۔ قائد اعظم نے اپنی تقاریر میں اردو کی مذہبی اور ثقافتی حیثیت پر زور دیا اور حصول پاکستان کی جدوجہد میں اسے قومی زبان کے طور پر اختیار کرنے کا فیصلہ کیا گیا کیونکہ اسلامی عقائد کی وارث زبان تھی۔ یہ مختلف صوبوں کے درمیان رابطے کی زبان بھی ہے اور یہ زبان ہی بالآخر ہمیں تہذیبی اقدار کی طرف لے جا کر متحد کرتی ہے۔

علاوہ ازیں جہاں تاریخی حقائق اور تحریکوں کی بات چلتی ہے وہاں ہماری قومی شخصیات بھی قومی و ملی سرمایہ ہیں اور اس سرمائے کو محفوظ کرنے اور اس کا حق ادا کرنے کا واحد طریقہ یہ ہے۔ کہ ان کی زندگیوں کو کتابوں کے سینے میں محفوظ کیا جائے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر وحید قریشی کی کتاب 'قائد اعظم اور تحریکِ پاکستان'

خاص اہمیت کی حامل ہے۔ جس میں انہوں نے مختلف موقعوں پر پڑھے جانے والے مضامین کو یکجا کر دیا ہے۔ یہ مضامین مؤقر جرائد میں شائع ہوئے۔ ان مضامین میں ایک فکری ربط موجود ہے۔ ان میں پڑھنے والوں کو اپنے بہت سے سوالات کے جوابات بھی مل جاتے ہیں۔ اس کتاب کے ذریعے تحریکِ پاکستان کے مختلف مراحل اور مشکلات بھی سامنے آ جاتی ہیں اور اس کی حفاظت اور بقا کی تفصیل بھی۔ جو اس خطے میں اس وقت سب سے زیادہ ضروری ہے۔

ڈاکٹر وحید قریشی کی شخصیت کی بے شمار جہتیں ہیں جن میں ایک سب سے اہم جہت ان کے بلند پایہ اور صاحب طرز ادیب ہونے کی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تاریخ کے ریگزاروں پر قدم رکھتے ہوئے بھی ان کے اسلوب میں خشکی اور کہنگی پیدا نہیں ہونے پاتی۔ ان کا قلم یکساں ادبی شان کے ساتھ اس میدان میں بھی رواں دواں رہتا ہے۔ قائداعظم جیسی عظیم شخصیت پر بھی قلم اٹھاتے ہوئے ان کے اسلوب کی عظمت اور تحریر کا شکوہ اپنا آپ منواتا ہے۔

انہوں نے ''قائداعظم اور تحریکِ پاکستان'' میں کئی خفیہ گوشوں کی نقاب کشائی کی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ قائداعظم کی سوانح عمریوں کا ذکر بھی کیا ہے۔ انہوں نے اس عظیم شخصیت کے بارے میں اس ضرورت کو محسوس کیا کہ قائداعظم کی تقاریر اور اخباری بیانات کا بہت سا سرمایہ غیر مدون صورت میں بکھرا پڑا ہے۔ یہ ہماری قومی ضرورت ہے کہ قومی سطح پر اس سارے ذخیرے کو مرتب کر کے شائع کیا جائے۔ اس کتاب کے مضامین میں ڈاکٹر وحید قریشی نے تحریکِ پاکستان کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ بھی لیا ہے اور قائداعظم کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو بڑے مرتب انداز میں پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب تاریخ کا گہرا ادراک اور مطالعہ رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریروں میں علمیت، تاریخی شعور، پاکستان کی ملی اور اخلاقی قدروں کا گہرا تجزیہ موجود ہے۔ ان کی تحریر میں ایک مؤرخ کا سپاٹ انداز موجود نہیں۔ ادبی شان یہاں بھی برقرار رہتی ہے۔ وہ کئی میدانوں کے رہوار ہیں۔ اس لیے ان کی تحریروں میں افسانوی نثر، محققانہ شان، فلسفیانہ اندازِ نظر، نفسیاتی اور تجزیاتی انداز نمایاں ہے۔

تاریخی حقائق کے بیان میں ڈاکٹر وحید قریشی کا قلم ایک ادیب کا فنکارانہ قلم بن جاتا ہے۔ جو ادبی شان سے حقائق کی بازیافت اور ان کے بیان کا فریضہ ادا کرتا چلا جاتا ہے۔ ان کی تحریر میں ادبیت کا یہ رنگ ملاحظہ ہو۔

۱۴ اگست کی صبح ایک نئی سرزمین کا پیغام لے کر آئی اس سے پہلے اور بعد کے درمیان کچھ ایسے رشتے بھی تھے جن میں ماضی کی کچھ تلخ یادیں خواہشات کے دھندلے خاکے اور احساسات کا ایک سرا ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء سے منسلک ہے۔ مارچ کے وہ دن لاہور میں کچھ اسی طرح کے احساسات کی آماجگاہ تھے۔ غم اور خوشی کے ملے جلے جذبات جنہوں نے ۱۴ اگست کی صبح کو ذہن میں انگڑائی لی تھی سات برس پہلے کی ایک صبح سے گہری مماثلت رکھتے تھے لاہور کے گلی کوچوں میں خاکساروں کے خون کے چھینٹے چمک رہے تھے۔ سوگوار دن اور سوگوار شامیں ایک عجیب بے حسی سے سر ٹکرا رہی تھیں۔ ۱۹۴۰ء کے یادگار جلسے کی تیاریاں تکمیل کے مراحل میں تھیں۔ ۸

ڈاکٹر وحید قریشی نے قائداعظم کے ساتھ اپنی عقیدت کو اپنی حد تک محدود رکھتے ہوئے اس کتاب کے مضامین پر غالب نہیں آنے دیا بلکہ انہوں نے قراردادِ پاکستان منظور ہونے کے بعد کے ۷ سالوں کی جدوجہد کو حرف بہ حرف تاریخی شواہد اور حقائق کے ساتھ مدلل انداز میں بیان کیا ہے۔ انہوں نے اس حقیقت کا اعتراف بڑے غیر جانبدارانہ انداز میں کیا ہے کہ تحریکِ آزادی کے سلسلے میں سب سے زیادہ منظم کام ہندوستان میں ہوا ہے مثلاً جگدیش شرما کی:

India's Struggle for independence

اور اسی مرتب کی مہاتما گاندھی جواہر لال اور انڈین نیشنل کانگریس پر تین جلدوں پر مشتمل کتابیات کی ترتیب کا کام۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے عصرِ حاضر کے عظیم رہنما قائدِ اعظم کی تقاریر بیانات اور خطوط کے ذخیرے کو محفوظ کرنے کی تجویز بار بار پیش کی ہے اور اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ یہ عظیم ذخیرہ ابھی تک بکھرا پڑا ہے۔ مثال کے طور پر اخباری بیانات، سالانہ جلسوں کی روداد اور دیگر تاریخی دستاویزات ایسی یادگاریں ہیں۔ جن میں ہماری تحریک کی بنیادیں بکھری پڑی ہیں۔ اس منتشر صورت سے ایک منظم یادگار صورت بنائی اور اجاگر کی جا سکتی ہے۔

تحریکِ پاکستان کے حوالے سے کام کرنے والوں میں جمیل الدین احمد، قاضی سعید الدین اور ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کا نام اہم ہے۔ ان اصحاب کے علاوہ شریف الدین پیرزادہ کے۔کے عزیز اور ڈاکٹر وحید

الزماں نے بھی تحریکِ پاکستان کا تجزیہ کیا ہے۔ ایس۔ ایم اکرام کی کتاب Modern Muslim India and the birth of Pakistan میں یونینسٹ اکابر کی طرف جھکنے کا میلان بہت زیادہ ہے۔ تحریکِ پاکستان کے علاوہ قائداعظم کی سوانح عمریوں کا مرحلہ انتہائی اہم اور نازک ہے۔ لیکن تحریک پاکستان کی صحیح تاریخ جب تک مرتب نہ ہو سوانح عمری کا کام ملتوی رہنا ضروری ہے۔ قائداعظم سے متعلق تاریخی سرمائے کو نظر انداز کر کے ہم آنے والوں کے لیے درست سمت کا تعین نہیں کر سکتے۔

ہندوستان میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے الگ الگ عقائد اور تصورات نے دو قومی نظریئے کی بنیاد رکھی۔ ہندوؤں کے مستقل جارحانہ رویے نے ہندوستان کے مسلمانوں کو ایک ایسا فیصلہ کرنا پڑا جو تاریخی اعتبار سے دور رس نتائج کا حامل ثابت ہوا۔ تاریخی ترتیب قائم کرتے ہوئے ڈاکٹر وحید قریشی نے ابتدا سے ان امور کا سراغ لگایا ہے۔ جو الگ وطن حاصل کرنے کے لیے مسلمانوں کے پیشِ نظر رہے۔ مثال کے طور پر خود ہندوؤں کا معاندانہ رویہ جو برہمن برادری کا مزاج بن چکا تھا اور جس نے ہر مرحلے پر مسلمان اور اسلام دشمنی کی مثال قائم کی۔ مسلمان برصغیر میں فاتحین کی حیثیت سے آئے تھے۔ لیکن ہندوؤں کے مقابلے میں ایک اقلیت رہے۔ انہیں ہمیشہ اپنے تحفظ کی کوششیں جاری رکھنی پڑیں۔ اگرچہ اس دوران مسلمانوں کو سیاسی غلبہ حاصل رہا۔ لیکن ساتھ ہی انہیں یہ خیال بھی دامن گیر رہا کہ ان کی ایک جداگانہ حیثیت ہے۔ لیکن سیاسی غلبے کے باوجود وہ کبھی ہندوؤں کا تعاون حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ محمود غزنوی کے حملے سے لے کر عالمگیر کے عہدِ حکومت تک مسلمان ہمیشہ حاکم قوم رہے لیکن فتوحات کے اس لامتناہی سلسلے کے باوجود ہندوؤں کا طرزِ عمل اجنبیت کا تھا اور مسلمان اپنے الگ قومی تشخص کے بارے میں سنجیدگی سے غور کرتے رہے۔ اس کے بعد کچھ تاریخی عوامل و عناصر ایسے درپیش ہوئے کہ مسلمانوں کو اورنگزیب کے انتقال کے بعد مختلف حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ تیموری فرماں روا کی قوت کمزور پڑ گئی اور امن و سلامتی کی جگہ فتنہ و فساد نے لے لی۔ مرہٹے، جاٹ اور بعض دوسرے ہندو عناصر زور پکڑ گئے اور مسلمانوں کو اپنی بقاؔ کے بارے میں زیادہ توجہ سے سوچنا پڑا۔ پہلے مذہب الگ قوم ہونے کا حوالہ تھا۔ اب جغرافیائی حوالے سے یہ ثابت ہو گیا کہ مسلمانوں کی قومیت کی بنیاد مذہب ہے۔ کیونکہ ہندوستان میں ایک ہندوستانی قوم نہیں بلکہ کئی اقوام بستی ہیں جن کا تعلق مختلف مذاہب سے ہے۔ مغلیہ دور کے اختتام تک مسلمانوں میں یہ خیال جاگزیں ہو چکا تھا۔ کہ ہندوستان ایک قوم کا ملک نہیں بلکہ قوموں کے بڑے مجموعے پر

مشتمل ہے اور ہندوؤں کا اصل چہرہ تو ۱۸۵۷ء میں مسلمانوں کے سامنے آ ہی گیا۔ جب ہندوؤں کی حوصلہ افزائی انگریز قوم نے کی اور انہیں مادی ترقی میں مسلمانوں سے کہیں زیادہ مضبوط اور مستحکم بنا دیا۔ اس کے علاوہ ہندوؤں نے اپنے سیاسی مفاد کی خاطر مغربی تصور جمہوریت کے حق میں آواز اُٹھائی۔ لیکن سرسید احمد خان اور دیگر اکابرین رہنما ہندوؤں کی چالوں سے باخبر تھے اور اصل صورتحال بھانپ کر ان رہنماؤں نے مسلمانوں کو مقابلے کا محاذ بند کر کے اپنے تعلیمی، مادی اور معاشی پہلوؤں کو مضبوط بنانے کی تلقین کی۔ پھر اردو، ہندی جھگڑے نے بھی ان کی آنکھیں کھول دی تھیں۔ ہندو جمہوریت کا نعرہ بلند کر کے اپنی برسوں پرانی آرزو کو پورا کرنا چاہتے تھے اور اکثریت بن کر اقلیتوں پر حکمرانی کے خواب دیکھ رہے تھے۔ اس مقصد کے لیے وہ مسلمانوں کو بھی متحدہ قومیت کا سبق دے کر اکثریت میں مدغم ہونے کی تلقین برابر کرتے رہے۔ لیکن جب ہندوؤں نے یہ دیکھا کہ مسلمان برابر اپنے سیاسی تحفظات کا مطالبہ اور جداگانہ انتخاب کا حق مانگ رہے ہیں تو انہوں نے تشدد اور فسادات کا راستہ اپنایا اور ان واقعات نے اس حقیقت کو روزِ روشن کی طرح عیاں کر دیا۔ کہ مفاہمت کی کوئی راہ باقی نہیں رہی اور اپنے حقوق کو محفوظ کرنے کے لیے الگ ریاست کا قیام لازمی ہے۔ بہرحال اس فکری منزل تک پہنچنے کے لیے بھی سرسید احمد خان کی راست فکر نے مسلمانوں کو راہ سُجھائی۔ جنہوں نے سب سے پہلے ہندوؤں کے جمہوری ہندوستان کے خواب کو شک اور مصائب کا مجموعہ قرار دیا تھا۔ جب کہ قائد اعظم وہ رہنما تھے۔ جنہوں نے اس خواب کی تعبیر کے تمام راستے ہموار کر دیے۔ پاکستان کا پہلا خواب سرسید احمد خان نے ہی دیکھا۔ لیکن اس کے بعد اس خواب کو چند نسلوں تک ہمت اور کوشش سے بارآور کرنے میں وقت لگا۔ ڈاکٹر وحید قریشی لکھتے ہیں:

> دورِ سرسید کے بعد ہندی سیاسیات میں ادب اور تاریخ دونوں پر اکثریتی فرقے کے خیالات کا قبضہ ہو گیا۔ ہندو مغرب کے تصور قومیت کو اپنا چکے تھے۔ اب سیاسی کش مکش میں نیشلسٹ خیالات کی مانگ زیادہ ہوئی۔ لیکن یہ صرف ایک لہر تھی اور پڑھے لکھے طبقے تک محدود تھی۔ دوسری لہر جو مسلمانوں کی تمدنی اور مذہبی زندگی میں عوامی سطح پر کارفرما رہی وہ قومیت کے مغربی تصور کی نفی کرتی ہے۔ مسلمانوں کے تعلیم یافتہ طبقے کا غالب حصہ ہندوؤں سے اشتراک کے بارے میں مدت تک پُرامید رہا۔ تاہم مسلمانوں کی سیاسی جدوجہد میں ہندوؤں سے کوئی باعزت سمجھوتہ جیسے ناممکن ہوتا گیا۔ علیحدہ مملکت کا تصور بھی

> اس لحاظ سے ملی امنگوں سے ہم آھنگ ہوتا چلا گیا۔ ۱۹۴۰ء کی قراردادِ لاہور سے قبل اس طرح کے خیالات مسلمان لیڈروں میں خال خال ملتے ہیں۔ جن میں ہندوؤں سے علیحدہ ہو کر برصغیر کی تقسیم کی خواہش کا اظہار ہوا ہے۔ اس احساسِ خفی کو حقیقت میں بدلنے کا سہرا قائد اعظم کے سر ہے۔ [۹]

کانگریس نے اپنے عمل سے بارہا یہ ثابت کر دیا کہ وہ صرف ہندو اکثریت کے مفادات کا تحفظ کرنا چاہتی ہے لیکن اس کے باوجود کچھ مسلمان رہنماؤں نے خوش امیدی کی پٹی آنکھوں پر باندھے رکھی اور کانگریس کے تصور وطنیت میں فنا ہو کر نیشنلسٹ مسلمان کہلانے میں فخر محسوس کرتے رہے۔ کچھ مسلمان جدوجہد آزادی میں ناکامی کے تصور میں بددل بھی ہو چکے تھے لیکن جداگانہ تمدن اور مذہبی اقدار کا احساس البتہ غالب رہا۔ پھر اقبال جیسے نابغۂ روزگار شاعر نے مسلمان کو فکری اور جذباتی سہارا دیا اور وہ متزلزل ہونے سے بچ گئے اور جذباتی طور پر آپ کو منضبط اور یکجا کرتے رہے پہلی بار الگ وطن کا مطالبہ چوہدری رحمت علی نے ۱۹۱۵ء میں بزم شبلی میں پیش کیا۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے ڈاکٹر آئی۔ ایچ قریشی کی کتاب The struggle for Pakistan میں سے ان کے یہ الفاظ یوں پیش کیے ہیں:

> "North of India is muslim and we shall keep it muslim. Not only that we will make it a muslim state. But this we can do only it and when we and our North cease to be india. For it is a prequisite to it. Sooner we shed indianism the better for us and for Islam."[۱۰]

۱۹۳۰ء میں مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے پہلی بار واضح طور پر علامہ اقبال نے اپنے خطبے میں الگ ریاست کا تصور اور مطالبہ پیش کیا اور مستقبل کی امکانی صورتحال کی جانب اشارہ کر رہا اور مسلمانوں کے اسلامی نظریۂ قومیت کو بھی واضح کر دیا۔ قومِ رسولِ ہاشمی کی ترکیب کس انداز سے جداگانہ ہے۔ اس کی وضاحت علامہ اقبال نے بارہا کی۔ مسلمان کے نزدیک وطن پرستی، بت پرستی کے مترادف ہے۔ حب الوطنی کی بنیاد ارضی بنیادوں پر نہیں بلکہ اس کی لامکانیت میں مسلمان کی بقا اور ارتقاء کا راز پوشیدہ ہے۔ لیکن یہ اندازِ فکر صرف اعلیٰ

اجتماعی اور اسلامی مقاصد تک درست ہے۔ جہاں تک مسلمانوں کے لیے کسی خطے کا حصول تعلق رکھتا ہے۔ اس میں اس کا مقصد زمین کے ایک ٹکڑے کو زندگی کا مقصد بنا لینا ہرگز نہیں بلکہ مسلمانوں نے ایک خطہ زمین کا مطالبہ اس لیے کرنا ہے۔ کہ اس کو اسلامی تجربہ گاہ بنائیں اور اس تجربہ گاہ میں نظام اسلام اور خدا کا اقتدار اعلیٰ نافذ کرتے ہوئے نظامِ مصطفیٰ کی تشکیل کریں اور اپنے مذہب، تاریخی روایات اور کلچر کو محفوظ کر سکیں اور پھر امت مسلمہ میں پھیل کر اپنے کلچر اور مذہبی اقدار کی تعلیم و ترغیب دے سکیں۔ ان کا مقصد یہ ہو کہ خدا کی سرزمین پر خدا کے احکامات کا نفاذ کر سکیں۔ اقبال ۱۹۳۲ء تک اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے۔ کہ دو بڑی قومیں مسلمان اور ہندو برصغیر میں ایک ساتھ نہیں رہ سکتے۔ چنانچہ ۱۵ دسمبر ۱۹۳۲ء کو نیشنل لیگ لندن کے جلسے میں انہوں نے الگ ملک کے مطالبے کو پیش کیا۔ اس طرح گویا پاکستان کے مطالبے کو پہلی بار سیاسی پلیٹ فارم پر پیش کیا اور یہ ایک واضح نصب العین کے طور پر سامنے آیا۔ گویا وہ دو قومی نظریہ جس کی ابتدا سرسید نے ایک موہوم امید کے ساتھ کی تھی اب ایک نمایاں پیکر بن کر سامنے آ گیا۔ اس کے خدوخال ابھر کر یہ ہر دیکھنے اور محسوس کرنے والے کے دل میں اُتر گئے۔ اب ہندوؤں پر بھی یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہو گئی۔ کہ مسلمان ایک عظیم جدوجہد کے لیے کمربستہ ہو گئے ہیں اور ان کے نزدیک وطن کی حیثیت مسلم ہے۔ ایک ایسا وطن جہاں ان کے مذہبی اقدار اور کلچر کے تحفظ کی ضمانت مل سکے۔ نیشنل لیگ لندن کے جلسے ۱۹۳۲ء کے بعد ۲۶ مئی ۱۹۳۷ء کو ایک خط کے ذریعے علامہ اقبال نے قائداعظم کو بھی الگ وطن کے مطالبے کے بارے میں لکھا۔ چنانچہ مارچ ۱۹۴۰ء میں قائد اعظم نے اپنے تاریخی خطبے میں واضح الفاظ میں اپنے اور مسلمانانِ برصغیر کے مؤقف کو بیان کر دیا۔ ان کے الفاظ انتہائی ٹھوس اور تقریر بے حد مدلل تھی۔ گویا یہ مسلمانوں کی تاریخ کا درخشاں کارنامہ تھا۔ کہ اس اجلاس میں جو قرارداد منظور ہوئی وہ بعد ازاں قراردادِ پاکستان کہلائی۔

اس کے بعد محض سات برس کے قلیل عرصے میں دنیا کے نقشے پر مملکتِ خداداد پاکستان کا نام ابھرا۔ جو اپنی نوعیت کا منفرد اور پہلا تجربہ تھا۔ قائداعظم نے ہر خطرے کی موجودگی میں یہ جرأت مندانہ اقدام کیا۔ ہندو اور انگریز دونوں جماعتوں کی موجودگی میں ہر چال کو ناکام بنانا اور ان کا مقابلہ کرنا قائد اعظم جیسے باحوصلہ اور جرأت مند رہنما ہی کا خاصہ تھا۔ انہوں نے ان دو چالاک گروہوں کی موجودگی میں اس حقیقت کو ثابت کر دیا کہ مسلمان قومیت کی ہر تعبیر کے مطابق ایک الگ قوم ہیں۔ اپنا الگ ملی تشخص، رکھتے ہیں۔

چنانچہ انہیں ایک اقلیت قرار دینا درست نہیں۔ اس ضمن میں ہمیں قائد اعظم کے اقوال اور علامہ اقبال کے افکار میں واضح مماثلت دکھائی دیتی ہے۔ اُس وقت جب ہندوستان کے مسلمان آزمائش کے نصف النہار پر کھڑے تھے۔ یہ دونوں رہنما ایک ہی انداز سے تاریخ کے اس دھارے کو دیکھ رہے تھے۔ دونوں کے اندازِ نظر جدا جدا تھے۔ مگر فکری سطح پر دونوں کے ہاں گہری مشابہت محسوس کی جاسکتی ہے۔ ایک نے فلسفیانہ اندازِ نظر کا مظاہرہ کیا اور دوسرے رہنما کے سامنے سیاسی تناظر میں پھیلے ہوئے حالات و واقعات ہیں۔ جو ایک ہی حقیقت کا پتہ دے رہے ہیں۔ اس صورتحال میں مسلمان قوم کی نجات کے لیے دونوں کو ایک ہی حل سُجھائی دیتا ہے۔

ڈاکٹر وحید قریشی ان دونوں رہنماؤں کے اندازِ فکر ونظر کا تجزیہ یوں کرتے ہیں:

> دونوں رہنما ایک ہی بنیادی حقیقت پر دو مختلف راستوں سے پہنچے۔ اقبال نے فلسفیانہ فکر کے وسیلے سے مسلمانوں کے ملی تشخص کو پہنچانا۔ وہ وطن کی محبت کو نفسیاتی حقیقت کے طور پر قبول کرنے کے بعد اس کی توسیع کرتے ہیں اور اسے ایک مجرد تصور کی شکل میں ڈھالتے ہیں۔ ان کا ذہنی سفر مکان سے زمان کی طرف ہے۔ قائداعظم نے سیاسی حالت کے ذریعے اسی مجرد تصور تک رسائی حاصل کی ہے۔ وہ آغاز 'وطن کی محبت' سے نہیں کرتے بلکہ 'طریق بودوباش' سے چلتے ہیں اور مجرد تصورات تک آجاتے ہیں۔ ان کے خیالات کا سیاق وسباق فلسفیانہ نہیں واقعاتی ہے۔ اقبال کے ہاں فکر اور قائد کے ہاں تجربے کا پلہ بھاری ہے۔ فکر اور تجربے کا یہ فرق دونوں کے اندازِ نظر پر اثر انداز ہوا ہے۔[۱۱]

۱۹۴۷ء میں قیام پاکستان عمل میں آ گیا اور اس کے پہلے گورنر جنرل قائداعظم مقرر ہوئے۔ ایک منتظم اور ضابطہ پسند گورنر جنرل کی حیثیت سے انہوں نے مجلسِ قانون ساز کے ذمے پاکستان کے آئندہ دستور کی ذمہ داری سونپ دی۔ جہاں تک ان کے ذاتی میلان کا تعلق ہے۔ وہ اسلامی تعلیمات کے اصولوں میں ڈھلے وفاقی دستور کو ہی پسند کرتے تھے۔ ان کے مطابق یہ خطہ زمین اسلامی اصولوں کی تجربہ گاہ کے طور پر حاصل کیا گیا تھا۔ چنانچہ یہاں کسی سیکولر یا لادینی اور تھیوکریٹک ریاست کے قیام کی گنجائش نہ تھی۔ اس ضمن میں ڈاکٹر وحید قریشی قائداعظم کی ۱۴ جولائی ۱۹۴۷ء کی پریس کانفرنس کی تقریر کا حوالہ دیتے ہیں:

"In any case Pakistan is not going to be a theoretic state to be ruled by priests with a divine mission. We have many non-Muslims----- Hindus, Christians and Parsies----- but they are Pakistanis. They will enjoy the same rights and privileges as any other citizens and will play their rightful part in the affairs of Pakistan." [۱۲]

ڈاکٹر وحید قریشی نے بڑے مثبت انداز میں تاریخ پاکستان کے اس باب کو رقم کیا ہے۔ جو ہماری تاریخ کا انتہائی حساس دور ہے۔ یعنی آغاز سفر کا دور۔

انہوں نے اپنی نگاہوں سے آزادی کی اس صبح کو دیکھا جو مسلمانوں کے لیے نوید مسرت لائی تھی اور پھر پنجاب اسمبلی کی سیڑھیوں پر ماسٹر تارا سنگھ کا تلوار کو نیام سے کھینچ لینا اور گورنمنٹ کالج کے نیو ہاسٹل کے دروازے کے باہر پولیس کی لاری کو جلتے دیکھنا۔ یہ سب وہ واقعات ہیں۔ جن کو ڈاکٹر صاحب نے بچشم خود دیکھا اور بعد ازاں اپنی تصانیف میں اس تاریخی روداد کو محفوظ کر لیا۔ جو آنے والی نسلوں کے لیے ایک محفوظ سرمایہ ہے۔ آتش زنی، قتل و غارت، اور مسلمانوں کے اپنے بچاؤ کے لیے مدافعتی حربے ایسے واقعات تھے۔ جو اس دور میں تشویش ناک صورتحال رکھتے تھے۔ آزاد وطن میں بھی تادیر ہندوؤں اور سکھوں کی من مانی جاری رہی اور سرحد پار بھی جو ظلم و ستم روا رکھا گیا۔ اس کے نتیجے میں پاکستان کی فضا بھی آتش فشاں ہوتی رہی۔ ان افسوس ناک مناظر اور مصائب کی داستانوں کو ڈاکٹر وحید قریشی نے نہ صرف نثری کتب اور تصانیف میں بلکہ اپنی شاعری میں سمویا:

کیا ختم ہوئے کیف و سرور و مستی
کیا ٹوٹ کر رہ گیا طلسم ہستی
اک شور سا اُٹھ رہا ہے عالم عالم
اک آگ سلگ رہی ہے بستی بستی [۱۳]

ڈاکٹر وحید قریشی نے مسلمانوں کی اس نظریاتی اور فکری اساس کا ذکر کیا ہے جو ابھی تک مسلمانوں اور پاکستان دونوں کو بچائے ہوئے ہے۔ کہ مسلمان اس ملک کے لیے قربانیاں دیتے رہے اور ان کے سامنے نصب العین یہ تھا کہ اپنے کلچر اور اقدار کی حفاظت کریں گے اور حفاظت کا طریقہ دو قومی نظریے کا حوالہ ہی ہوگا۔ آج بھی ہماری سیاسی، معاشرتی اور فکری زندگی کی جڑیں اس نظریے میں ہی پیوست ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے بڑا معروضی اور استدلالی انداز اپنا کر مسلمانوں کی جداگانہ ثقافتی اور فکری زندگی کو پیش کیا ہے۔ کہ اس کی جڑیں کس طرح ہمارے ماضی میں پیوست ہیں۔ ہماری تہذیبی سطح کے خدوخال ہی صدیوں کی تاریخی سوچ اور شعور کے مرہون منت ہیں۔ البتہ غیر اقوام نے مسلمانوں کے مفادات کو نقصان پہنچانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ باؤنڈری کمیشن کی دھوکا دہی کا راز طشت از بام ہوا اور قائداعظم نے اس ضمن میں اپنے ردعمل کا اظہار کیا۔ اس صورتحال کو مجبوراً قبول کیا گیا۔ ماؤنٹ بیٹن اور ریڈ کلف کی ہندونوازی کسی تبصرے کی محتاج نہیں۔ قائداعظم انگریز جیسی چالاک قوم کی فطری مکاریوں اور حربوں سے واقف تھے۔ ان کی سیاسی بصیرت اس حقیقت کا گہرا ادراک رکھتی تھی کہ ہندو اور انگریز اپنے وعدے سے پھر جانے کے بہانے ڈھونڈ رہے ہیں اور کسی بھی وقت آزاد مملکت کے قیام سے دستبردار ہو سکتے ہیں۔ یہ صورتحال قائداعظم اور دیگر قائدین کے لیے تکلیف دہ تھی۔ پنجاب اور بنگال کی تقسیم جس طرح ہوئی وہ سب کے لیے اظہر من الشمس ہے۔ کمیشن کی کارروائی بھی محض ایک ڈھونگ تھی۔ اس کی روداد ڈاکٹر وحید قریشی نے ''قائداعظم اور تحریکِ پاکستان'' میں شامل اپنے مضمون ''قائداعظم اور تقسیم برصغیر'' میں بخوبی کر دی ہے۔ آزادی کی یہ جنگ درحقیقت اس مقام پر آ کر ختم ہوئی جسے ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کا دن کہا جاتا ہے۔ اس کے لیے کن خارزاروں سے الجھنا پڑا، یہ صرف اس دور کے چشم دید گواہ یا تحریک کے اراکین ہی بتا سکتے ہیں۔ آنے والے وقت کا مؤرخ ان واقعات کی بنا پر درست تاریخ کا تعین کر سکے گا۔

اِن واقعات کے لیے ایک حوالہ یا ریفرنس قائداعظم کی سوانح عمریاں بھی ہیں۔ جن پر ایک جامع مضمون ''قائداعظم اور تحریکِ پاکستان'' میں شامل ہے اور جس کا عنوان ہے: ''قائداعظم کی پاکستانی سوانح عمریاں'' اس ضمن میں ڈاکٹر وحید قریشی نے قائداعظم سے متعلق مختلف زبانوں کے کتب و رسائل کا تجزیہ کیا ہے اور اس مقصد کے لیے ان کے پیشِ نظر مندرجہ ذیل کتاب رہی ہے۔

"Quaid-e-Azam Jinnah a selected Bibleography.

Muhammad Anwar, National publishing house Karachi,

1970 . PP 29-36. [۱۴]

ملکی اور غیر ملکی دانش وروں نے قائد اعظم کی بے شمار سوانح عمریاں لکھیں۔ ہندو مؤرخین نے بھی قائداعظم پر قلم اٹھایا اور ان کے سیاسی کردار کو اپنے انداز سے بیان کرنے کی سعی کی۔ لیکن ان میں اختلاف بھی پایا جاتا ہے۔ پھر مستند اور غیر مستند کا مسئلہ بھی درپیش رہتا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ حقیقی تحقیق کے جذبے کے تحت اصل سرمائے اور بنیادی ماخذ تک رسائی حاصل کی جائے اور قائداعظم جیسی شخصیت کو اس کے درست پیکر اور پس منظر کے ساتھ بیان کیا جائے۔

ڈاکٹر وحید قریشی نے تبصرے کے لیے قائد اعظم کی جن سوانح عمریوں کو منتخب کیا ہے۔ ان میں مندرجہ ذیل سوانح عمریوں کے نام دیے گئے ہیں۔

Meet Mr. Jinnah: A.A. Ravonf (1944) my leader: Z.A. Sulehri. The Greater Leader: S. Abdul Latif (1946) Jinnah: Hector Balitho (1954) Glimpses of Quaid-e-Azam, Jamal-ul-Din Ahmed (1960)

Quaid-e-Azam as i knew him M.A.H Isfahani (1966)

Quaid-e-Azam Jinnah. The story of a nation G. Allana (1967)

Jinnah and the making of Pakistan M.M Qureshi (1969). [۱۵]

ان کتابوں میں نہ صرف تاریخ کے ایک اہم دور کو موضوع بنایا گیا ہے بلکہ ان سے ہماری فکری، سماجی تاریخ متعین ہوتی ہے۔ لیکن بعض سوانح عمریوں میں قائد کی شخصیت کا مجموعی تاثر قاری کی گرفت میں نہیں آیا۔ اگرچہ ان سوانح عمریوں میں خطابت کا پُر شوکت اسلوب بھی ہے اور مثالیت پسندی کا رومانی انداز بھی۔ کہیں کہیں قائد پرستی نے بھی اپنا اثر دکھایا ہے اور قائداعظم کی ذات سے والہانہ لگاؤ اپنا رنگ دکھائے بغیر نہیں رہا۔ کہیں

ان سوانح عمریوں میں تاریخی ناول نویسی کا انداز نمایاں ہے۔ قائداعظم کی شخصیت کے سیاسی رخ کو مدنظر رکھا گیا ہے۔ زندگی کے دیگر اہم مواقع مثلاً پیدائش، تعلیم اور زندگی کے دیگر واقعات کو محض پڑھنے والوں تک پہنچانے پر اکتفا کیا گیا ہے۔ قائد کی شخصیت کے نفسیاتی عوامل کی طرف توجہ کر کے حقائق اور شخصیت کے درمیان عمل اور ردعمل کو موضوع نہیں بنایا گیا۔ ڈاکٹر وحید قریشی کی دلچسپی کا میدان نفسیات بھی ہے۔ چنانچہ انہیں نفسیاتی طریقِ استدلال کی کمی قائداعظم کی سوانح عمریوں میں نمایاں طور پر محسوس ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ وہ سماجی اور عمرانی تنقید کے اصولوں کی روشنی میں بھی اس دور کی لکھی ہوئی سوانح عمریاں دیکھتے اور ان کا تجزیہ کرتے ہیں۔ ۱۹۳۰ء کے قریب عالمی اقتصادی بدحالی، مسلمانوں کی سیاسی جدوجہد، خلافت کا خاتمہ اور مسلمانوں کی بے چینی، ابوالکلام آزاد، محمد علی جوہر، ظفر علی خان اور اقبال کی نظم و نثر کے پیغامات، اور مسلمان نوجوان طبقے کا جوش و ولولہ، اور حصول آزادی کی خواہش کی شدت اس دور کے خاص رجحانات ہیں۔ اس دور کے داخلی اضطراب نے کئی ایک تحریکوں کو جنم دیا۔ شہید گنج تحریک، تحریک کشمیر اور دیگر سیاسی، دینی تحریکیں، ادب میں رومانی تحریک وغیرہ۔ اس تحریک کے زیرِ اثر قائداعظم کی سوانح عمریاں لکھی گئیں۔ اس ضمن میں ڈاکٹر وحید قریشی یوں رقم طراز ہیں۔

> ”رؤف، سلہری اور جمیل الدین احمد حقائق کو رومانی زبان ہی میں بیان کرنا چاہتے ہیں اور انہیں اپنے رہنما سے اسی طرح کی بے پناہ محبت ہے جیسے شعرا کو اپنے محبوب سے ہوتی ہے۔ بات کو دوٹوک کہنے کی بجائے اس کے بیان کے لیے پیچیدہ اور لمبا راستہ پسند کیا جاتا تھا۔ قاری جملوں کی خوبصورتی اور تشبیہ و استعارے کی کثرت سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ ٹیگور اور آسکر وائلڈ کے اثرات اس زمانے کے لب و لہجے پر چھائے ہوئے ہیں۔ معمولی اور پیش پا تجربات کو انوکھے تجربات سمجھ کر انہیں بنا سنوار کر جاذب اور دلکش بنانے کا رویہ اس دور کے اُردو ادیبوں میں عام ہے۔ قائد اعظم کے اسی دور کے سوانح نگار بھی ان اثرات سے الگ نہیں۔۔۔ قائداعظم کی ذات کے ساتھ عقیدت اور بے پناہ محبت نے ان سوانح نگاروں کو مسحور کر رکھا ہے اور مثالیت کی قوت اپنا آپ ظاہر کیے بغیر نہیں رہتی۔“[۱۲]

خلوص و احترام اور عقیدت کے جذبات ان سوانح عمریوں میں موجزن ہیں۔ ان سوانح عمریوں کی وجہ

سے عوام کا قومی احساس بیدار ہوا ہے۔

قائداعظم کی پہلی مکمل سوانح عمری جو سرکاری سرپرستی میں شائع ہوئی۔ لائتھو کی ''جناح'' ہے۔ یہ کتاب ۱۹۵۴ء میں تحریر کی گئی اس کتاب میں قائداعظم کی پوری زندگی اور واقعات کو سمیٹا گیا ہے۔ لیکن قائداعظم کی زندگی اور کارناموں پر تحقیق کرنے والوں کو بنیادی ماخذ تک رسائی حاصل کرنے کی ضرورت تھی اور یہ ماخذ محترمہ فاطمہ جناح کی تحویل میں تھے۔

ہمارے ہاں کی روایتی سوانح عمریوں میں مطلوب الحسن سید، اصفہانی اور سلیم ایم ایم قریشی کی سوانح عمریں شامل ہیں۔ ان کی اصل توجہ ان کے کردار اور سیاسی پس منظر پہ ہے۔ ان کتب میں بعض مقامات پر غلطیاں اور غلط فہمیاں موجود ہیں۔ جن میں قائد کی شخصیت کو مؤثر اور صحیح انداز میں پیش نہیں کیا جا سکا۔ صرف تخیل اور یادداشتوں کی بنا پر سوانح عمری نہیں لکھی جا سکتی ہے۔ اس لحاظ سے مسٹر اصفہانی کی "Quaid-e-Azam as I knew him" درست رنگ میں لکھی ہوئی کتاب ہے۔ جو قائد کی مربوط سوانح عمری ہے۔ یہ مصنف نے قائد سے ذاتی تعلقات کی بناء پر لکھی اور قائداعظم کی شخصیت کے لطیف عناصر کو پیش کیا۔ یہ کتاب قائد کے عظیم کردار کو سمجھنے میں بڑی مدد دیتی ہے۔

ڈاکٹر وحید قریشی نے پاکستان کی تاریخ و ثقافت کے حوالے سے ایک اور بڑی معتبر کتاب تصنیف کی جس کا عنوان ہے: ''پاکستان کی نظریاتی بنیادیں'' جس میں چھ ابواب ہیں اور ایک ضمیمہ بعنوان 'قائداعظم اور ہمارا تاریخی سرمایہ۔ اس کتاب میں جو مقالات شامل ہیں، ان کا محور و مرکز نظریۂ پاکستان ہے۔ برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کی جدوجہد آزادی کے بنیادی خدوخال اس کتاب میں وضاحت کے ساتھ پیش کیے گئے ہیں۔ انہوں نے ہندو، مسلم عقائد، تہذیب، تمدن، زبان اور رسم و رواج کے تفرقات کو پیش کر کے دوقومی نظریے کی وضاحت کی ہے۔

پاکستان کی جملہ مشکلات اور ان کے اسباب بھی نہایت حسن و خوبی سے اس کتاب میں بیان کر دیے گئے ہیں۔ قیام پاکستان کے چند برسوں بعد یہ حقیقت عیاں ہوگئی تھی کہ اس مملکت کو ختم کرنے اور نظریۂ پاکستان کو باطل ثابت کرنے والے عناصر بذاتِ خود باطل ہیں۔ پاکستان اقتصادی اور سماجی سطح پر پھلا پھولا اور منظم ہوا۔ دنیا کی منڈیوں میں پاکستان کے سکے کی ساکھ مضبوط ہوئی۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے گہرے تاریخی شعور اور

بصیرت سے کام لے کر تحریک پاکستان کی نظریاتی بنیادوں کو بیان کیا ہے۔ ان کے ذہن پر اوائل جوانی میں تحریک پاکستان نے گہرے اثرات مرتسم کیے تھے۔ ''پاکستان کی نظریاتی بنیادیں'' میں انہوں نے ان اثرات کا ردعمل ظاہر کیا ہے۔ قائدین میں کون لوگ مخلص، کون لوگ داخلی معاملات میں غیر جانبدار تھے اور کن لوگوں نے ملک کی نظریاتی بنیادوں کو نقصان پہنچانے سے گریز نہ کیا۔ قصہ مختصر ڈاکٹر وحید قریشی اِن مقالات میں تاریخی بصیرت اور شعور سیاست اور ذوقِ ادب تینوں کو بروئے لا کر ایک ایسی کتاب لکھی ہے جو آج کے زمانے کے علاوہ اس دور میں بھی انتہائی ضروری تھی جب یہ لکھی گئی۔ کیونکہ پاکستان کے خلاف خوفناک سرگرمیاں تو انتہائی آغاز کے زمانے میں ہی شروع ہو گئی تھیں۔

ڈاکٹر وحید قریشی نے نظریۂ پاکستان کے خلاف ہونے والے پروپیگنڈے کا جواب بڑے مدلل انداز میں دیا ہے جس کے سامنے مخالفین کی ساری مخالف قوتیں دم توڑ جاتی ہیں۔ اس استدلال میں تحقیقی شان نمایاں ہے اور یہی وہ حیثیت ہے جو ان کے ہاں بنیادی و مرکزی مقام کی حامل ہے۔

''پاکستان کی نظریاتی بنیادیں'' میں کل چھ مقالے اور آخری ضمیمہ ہے۔ یہ موضوعات مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ فکری اور سماجی بنیادیں

۲۔ نظریاتی بنیادیں اور اقبال

۳۔ نظریاتی بنیادیں اور قائداعظم

۴۔ نظریاتی بنیادیں اور قرارداد پاکستان

۵۔ نظریاتی بنیادیں اور مشرقی پاکستان

۶۔ نظریاتی بنیادیں اور ہمارا آئین

۷۔ ضمیمہ:۔ قائداعظم اور ہمارا تاریخی سرمایہ

پہلا باب ' فکری اور سماجی بنیادیں' میں ڈاکٹر وحید قریشی نے ان عناصر کا ذکر کیا ہے۔ جو قیام پاکستان کی

نظریاتی اساس بنے۔ ہندوستان میں پہلے شخص کا مسلمان ہونا، بعض علاقوں میں مسلمانوں کی عددی اکثریت، صوفیائے کرام کی احیائے اسلام کے سلسلے میں کوششیں، مسلمانوں کا ملی تشخص کا شدید احساس، ادب وفنونِ لطیفہ میں مسلمانوں کے نقطۂ نظر کی ترجمانی اور مسلمانوں کی تہذیبی روح کا اظہار وغیرہ ایسے عوامل تھے جو مسلمانوں کے علیحدہ تشخص کو ظاہر کرتے رہے۔ ان کے علاوہ مسلمانوں کے سماجی، ثقافتی اور ادبی سطح سے ہٹ کر تاریخی شعور میں ان کا رویہ بھی شامل تھا۔ جو کہ بڑا ہی منفرد اور مسلمانوں کی علیحدہ شناخت کا مظہر تھا۔ اگرچہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے ایک امتزاجی معاشرے میں رہنے کی وجہ سے دونوں کے کلچر پر اثر پڑا۔ اس کے علاوہ اکبر بادشاہ نے مذہبی اور صوفیانہ سطح پر تصوف کے راستے سے ہندوؤں کے فلسفیانہ افکار کے انجذاب کے لیے ایک نیا synthesis پیش کر دیا۔ لیکن اس سے اسلامی افکار کی روح ہی بدلنے کا خدشہ تھا۔ اس نے دینِ الٰہی پیش کر کے ہندو مذہب اور اسلامی تصوف کے درمیان رابطۂ اتحاد کی کوشش کی۔ لیکن اس کوشش کا مقصد سیاسی وحدت کا حصول تھا۔ پھر برصغیر کے مسلمان نظریاتی اور روحانی سطح پر عشقِ رسولؐ میں اس قدر سرشار ہیں کہ وہ کبھی بھی غیر دینی عقائد کو قبول کرنا گوارا نہیں کرتے۔

ڈاکٹر وحید قریشی اس صورتحال کا تجزیہ کرتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں:

> برصغیر میں مسلمانوں کے ملی تشخص کو تشکیل دینے میں دو عناصر نے سب سے زیادہ کام کیا ہے۔ اول مطالعہ تاریخ دوم عشقِ رسولؐ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ برصغیر میں اسلام کے زندہ رہنے کا اصل سبب ہی عشقِ رسولؐ کا احساس تھا۔ تو یہ بے جا نہ ہوگا۔ اس احساس سے جو فکری سانچہ بنا۔ اس نے نظریاتی ریاست کا مطالبہ کیا۔ ۱۷

وطنِ عزیز کی نظریاتی بنیادوں کا یہ تجزیہ بڑا حقیقی اور واقعیت کے قریب ہے۔ اس سے اگلا باب 'نظریاتی بنیادیں اور اقبالؒ' میں ڈاکٹر وحید قریشی نے اقبال کے نظریۂ قومیت و وطنیت کا ارتقا ان کی شاعری اور فلسفے کے تناظر میں پیش کیا ہے۔ ان کا کلام ان کے سیاسی نظریات کا غماز ہے۔ اقبال حرکت وعمل کے پیامبر ہیں۔ اس حوالے سے ان کی فکر میں بھی ارتقاء پایا جاتا ہے۔ انہوں نے سفرِ یورپ سے قبل متحدہ ہندوستانی قومیت کی طرف داری اور حمایت ضرور کی تھی مگر واپسی تک انہیں مغربی وطنیت و جمہوریت کے سارے اسرار منکشف ہو کر دکھائی دینے لگے۔ مغرب کی بہیمانہ زندگی اور قوم ونسل کی بنا پر جنگ و جدل

درحقیقت ان کے جغرافیائی حدود میں محصور نظریہ قومیت سے وابستہ ہے۔ ۱۹۲۲ء تک علامہ اقبال وطنیت کے مغربی تصور کے مقابلے میں حب الوطنی اور ملت کے تصور کو پوری طرح اپنا چکے تھے۔ اس منزل تک پہنچانے میں ہندوستان کے عمرانی مسائل نے ان کی مدد کی۔ اس کے علاوہ انہوں نے قرآنِ پاک کی آیات کی بنیاد پر اس نظریہ قومیت کو قبول کیا جو درحقیقت مذہبی بنیاد پر استوار ہے۔ سیاسیات عالم نے بھی ان کی فکر پر گہرے اثرات مرتسم کیے۔ اقبال کے نظریاتی افکار کے لیے ۱۹۳۰ء اور ۱۹۳۱ء کے سال بہت اہم ہیں۔ انہیں مسلمانوں کے لیے ایک الگ جغرافیائی وطن کی اہمیت کا احساس ہونے لگا تھا۔ اس نظریے کی حمایت کا اعلان انہوں نے خطبۂ الہٰ آباد میں کیا۔ اس کے علاوہ "stray Reflections" میں بھی انہوں نے اپنے خیالات کو مفصل انداز میں بیان کیا اور وطن کے فکری، ثقافتی اور مذہبی پہلوؤں کو خاص طور پر اپنی توجہ کا مرکز بنایا۔ اس کے علاوہ صرف شاعری کی روشنی میں اقبال کے نظریۂ وطنیت کا جائزہ نہیں لیا جا سکتا۔ ان کے اردو کلام فارسی کلام، خطوط، تقاریر اور بیانات کی مدد بھی لینی چاہئے۔ ورنہ ایک ادھوری تصویر بنے گی۔ اس کے علاوہ اقبال کے تصور وطنیت کے نظریاتی پہلوؤں کو ان کی ڈائری "stray Reflections" اور ملتِ بیضا پر ایک عمرانی نظرٗ میں تلاش کرنا ضروری ہے۔ ''ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر'' سے ڈاکٹر وحید قریشی اقبال کی تحریر نقل کرتے ہیں:

> مسلمانوں اور دنیا کی دوسری قوموں میں اصولی فرق یہ ہے کہ قومیت کا اسلامی تصور دوسری اقوام کے تصور سے بالکل مختلف ہے۔ ہماری قومیت کا اصل اصول نہ اشتراکِ زبان ہے۔ نہ اشتراکِ وطن نہ اشتراکِ اغراضِ اقتصادی بلکہ لوگ اس برادری میں جو جناب رسالت مآبؐ نے قائم فرمائی ہے۔ اس لیے شریک ہیں۔ کہ مظاہر کائنات کے متعلق ہم سب کے معتقدات کا سرچشمہ ایک ہے اور جو تاریخی روایات ہم سب کو ترکے میں پہنچی ہیں۔ وہ بھی ہم سب کے لیے یکساں ہیں۔ اسلام تمام مادی تصور سے بےزاری ظاہر کرتا ہے اور اس کی قومیت کا دارومدار ایک خاص تنزیہی تصور پر ہے جس کی تجسیمی شکل وہ جماعت اشخاص ہے جس میں بڑھنے اور پھیلتے رہنے کی قابلیت طبعًا موجود ہے۔ اسلام زمان ومکاں کے قیود سے مبرا ہے۔ [۱۸]

گویا اقبال کے نزدیک مسلمانوں کے وطنی تصور کی بنیاد قومیت یا نسلی و علاقائی تعصبات پر نہیں۔ مذہب پر ہے۔ اس لحاظ سے مسلمانوں کی حب الوطنی ارضی اور مادی نہیں بلکہ دینی احکامات اور اعتقادات کی پابندی اور اطاعت پر ہے۔ اقبال قومیت کو مکاں سے نکال کر زماں میں پھیلانے کے قائل ہیں۔ قائد اعظم اور اقبال دونوں اکابرین رہنماؤں نے اس حیثیت کو قبل از وقت بھانپ لیا تھا کہ مسلمان ایک ایسی سرزمین کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ جہاں ان کی روایات اور کلچر محفوظ ہو سکے۔ مسلمانوں نے وطنیت کے مغربی تصور کو یکسر رد کر دیا تھا۔

علامہ اقبال نے ۲۶ مئی ۱۹۳۷ء کو قائداعظم کے نام ایک خط میں میں مسلمانوں کے لیے الگ وطن کی تجویز واضح الفاظ میں پیش کر دی اور اس وقت تک قائد اعظم نے بھی اپنی سیاسی بصیرت کی مدد سے اس حقیقت کا سراغ لگا لیا تھا کہ ہندو سیاستدان، اور عوام مسلمانوں کے خلاف منافرت اور جارحانہ عزائم رکھتے ہیں۔ 'پاکستان کی نظریاتی بنیادیں' کا اگلا باب ڈاکٹر وحید قریشی نے 'نظریاتی بنیادیں اور قائد اعظم' کے عنوان سے لکھا ہے۔

جس میں انہوں نے اقبال کے بعد قائد کے فکری دھاروں کے تاریخی سفر کا برملا اظہار کیا ہے۔ اقبال کی طرح قائداعظم نے بھی مسلم قومیت کے نظریے کو ان کے کلچر اور جداگانہ سوچ کی بنا پر پیش کر دیا۔ انہوں نے اپنے مارچ ۱۹۴۰ء کے خطبے میں فرمایا:

> "It is extremely difficult to appreciate why our Hindu friends fail to understand the real nature of Islam and Hinduism. They are not relegion in the strict sense of the world, but are in fact different and destrinet social orders".[۱۹]

قائداعظم نے مسلمانوں کو نظریاتی وحدت عطا کی اور ایک ایسے پلیٹ فارم پر اکٹھا کر دیا جہاں وہ منظم ہو گئے اور اپنی کوششوں میں کامیاب ہو گئے۔ ایک علیحدہ ارضِ وطن ان کا مقدر بن گیا۔

پاکستان کی نظریاتی بنیادیں میں اگلا باب نظریاتی بنیادیں اور قراردادِ پاکستان ہے۔ جس میں ڈاکٹر وحید قریشی نے قراردادِ پاکستان کو مسلمانوں کی جدوجہد آزادی کا منشور اور میگنا کارٹا کہا ہے۔ اکتوبر ۱۹۲۸ء میں پہلی

بار مسلمانوں کے لیے قوم کا لفظ استعمال کیا گیا۔ اس میں اقبال نے اسے سیاسی منصوبے کے طور پر بیان کیا اور قائداعظم نے اسے بالآخر ایک قابلِ احترام اور منفرد لفظ بنا کر الگ ملک کی علامت بنا دیا۔ نظریۂ پاکستان قراردادِ پاکستان کے منظور ہونے کے بعد ہی دلوں میں راسخ ہو گیا تھا اور اپنوں کی مخالفت اور غیروں کی ریشہ دوانیوں کے باوجود اس وطن کے بنانے میں کوئی رکاوٹ آڑے نہ آ سکی قراردادِ پاکستان کی اصل اہمیت اسی بات میں مضمر ہے۔ کہ یہ الگ اور آزاد ملک کا مطالبہ کرتی ہے اور اس کی بنیاد دو قومی نظریے پر ہے۔ مسلمان ایک الگ اور منفرد قوم ہے۔ دنیا کی کسی زبان میں بیان کردہ قوم کی تعریف کی رو سے مسلمان قوم کی تعریف پر پورے اترتے ہیں۔ جغرافیائی لحاظ سے پاکستان کے چار صوبے ہیں لیکن یہ مختلف قومیتوں کے وطن نہیں ہیں۔ کیونکہ جب علاقائی عصبیتیں سیاسی نصب العین بن جائیں تو یہ نظریہ پاکستان کی روح کے منافی ہیں۔ پاکستان کے باشندے رشتہ اتحاد میں منسلک ہیں اور ان کو اسلام کی طاقت نے متحد کیا ہے۔

'پاکستان کی نظریاتی بنیادیں' میں اگلا باب ''نظریاتی بنیادیں اور مشرقی پاکستان'' ہے۔

جس میں ڈاکٹر وحید قریشی نے ایک مؤرخ کی بصیرت سے کام لیتے ہوئے مشرقی پاکستان کے ساتھ مغربی پاکستان کے روابط اور نظریاتی بنیادوں کی روشنی میں موجودہ صورتحال کا جائزہ لینے کی کوشش کی ہے۔ جس دوران قراردادِ پاکستان پر بحثیں جاری تھیں۔ اس کے خالقین کے درمیان ہی متضاد خیالات پائے جا رہے تھے۔ لیکن قائداعظم کا تخیل اس ضمن میں بالکل واضح تھا، وہ کسی ابہام کا شکار نہیں تھے۔ برطانوی حکومت نے ۱۸ اکتوبر ۱۹۳۹ء کو اپنے اعلان میں ڈومنین سٹیٹس کو ہماری آزادی کی حد قرار دیا۔ اقلیتوں کے بارے میں بھی دوٹوک بات ہو چکی تھی۔

قرارداد میں کسی شک شبے کی گنجائش نہیں۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے پرت در پرت قرارداد کی مختلف تہوں کو پرکھا اور بیان کیا ہے اور فرماتے ہیں کہ قرارداد کسی تاویل کی محتاج نہیں۔ البتہ اس کو سمجھنے اس لیے قائداعظم کے بیانات، تقاریر اور مسلم لیگ کونسل کی رودادیں پڑھنے کی ضرورت ہے۔ تاکہ ان تشریحات کی روشنی میں قرارداد کو سمجھا اور پرکھا جا سکے۔ یہاں موضوع مشرقی پاکستان کی آزادی کا ہے۔ جس میں ہندوؤں نے آغاز ہی سے علیحدگی کے رجحانات کا برملا اظہار کیا۔ قیام پاکستان کے بعد ہندو اقلیت نے مشرقی پاکستان کی سیاسی، سماجی اور تعلیمی زندگی پر گرفت مضبوط کر لی۔ بھارت اور کانگرس کے لیڈروں نے علیحدگی کے مطالبے کے خواب کو دیگر

لفظوں میں پیش کیا۔ اس ضمن میں ''چھ نکات'' کی شکل میں واضح اظہار شیخ مجیب الرحمٰن کے ذریعے ہوا۔ جو بظاہر صوبائی خودمختاری لیکن در پردہ علیحدگی کا اعلان تھا اور اس کی بنیاد قراردادِ لاہور (قراردادِ پاکستان) کو بنایا۔ اس سے قبل سر سکندر حیات ایسا تجربہ کر چکے تھے کہ پنجاب کو خودمختاری کا حق دیا جائے۔ مشرقی پاکستان میں بھی صوبائی عصبیت اور مذہبی اقدار سے کنارہ کشی کے رجحانات بروئے کار تھے۔ چھ نکات کی داستان ۱۹۶۵ء کی جنگ کے آس پاس شروع ہوئی اور مشرقی پاکستان میں بھارت کی خفیہ سرگرمیاں تیز تر ہوتی گئیں اور جب بھارت کے خلاف مؤثر مہم شروع کرنے کا فیصلہ ہوا تو پاکستانی لیڈر شیخ مجیب الرحمٰن اور جناب عطا الرحمٰن نے شامل ہونے سے انکار کر دیا۔ جنگ کے بعد اعلان تاشقند ہوا۔ جس پر فیلڈ مارشل ایوب خان کے خلاف عوامی تاثرات تند و تیز ہو گئے۔

مخالف سیاسی جماعتوں نے مشترک اجتماعی پروگرام کے لیے لاہور میں ایک کانفرنس کرنے کا فیصلہ کیا۔ شیخ مجیب الرحمٰن نے عوامی لیڈر کی حیثیت سے اس میں شرکت کی اور انہیں ان نکات کو جو صرف چار نکات پر مشتمل ہے۔ مشرقی پاکستان کی طرف سے عوامی مطالبے کے طور پر پیش کر دیا۔ لیکن کانفرنس میں شریک جماعتوں نے اس پر بحث سے انکار کر دیا۔ اس کے فوراً بعد شیخ مجیب الرحمٰن نے اعلان تاشقند کی حمایت کا اعلان کر دیا۔ چھ نکات کا یہ منصوبہ مشرقی و مغربی پاکستان کے دماغوں کی ملی جلی پیداوار کہنا چاہیے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس امر کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس منصوبے کی تائید و حمایت بھارت نے کی۔ کیونکہ چھ نکات کے پس پشت جو منطق کارفرما ہے۔ وہ خالص بھارتی منطق ہے۔ قرارداد پاکستان کو اس کے اصل مفہوم سے نکال کر نئے معانی پہنانے کی کوشش بھارت نے روزِ اوّل سے ہی شروع کر دی تھی۔ گاندھی نے ہندوستان کے باشندوں کو ایک قوم قرار دیا اور ان کی اہمیت کو مختصر اور کم سے کم کرنے کے لیے یہ کہا کہ محض مذہب بدل کر مسلمان ہو جانے سے ان کی قومیت نہیں بدل جاتی۔ قومیت کی بنیاد گاندھی کے نزدیک جغرافیائی یا نسلی تو ہو سکتی ہے۔ لیکن مذہبی نہیں۔ پاکستان کے دونوں خطے گاندھی کی نظر میں ایک دوسرے کے لیے خطرہ بن سکتے ہیں۔ نسلی بنیاد پر مشرقی پاکستان کے باشندے بنگالی ہیں اور الگ قومی تشخص رکھتے ہیں۔ گاندھی کے اس تخیل کی بازگشت ڈھاکہ یونیورسٹی میں اور دیگر یونیورسٹیوں میں ہندو اساتذہ کی زبان سے بھی سنائی دیتی رہی۔

علیحدگی کی منطق میں چھ نکات میں یہی زاویہ جاری و ساری ہے جس نے نئی نسل کو عصبیت کے سانچے

میں ڈھال دیا۔ مشرقی پاکستان میں ہندوؤں کی سیاسی گرفت مضبوط ہوتی گئی۔ انہوں نے اپنا یہ مطالبہ بھی منوالیا کہ انتخابات جداگانہ نیابت کے اصول پر نہیں ہوں گے۔ شیخ مجیب الرحمٰن کی انتخابات میں جیت نے ان کی آمرانہ حیثیت کو مستحکم کیا۔ ہندوؤں نے گاندھی کی منطق کو اپنایا۔ جب کہ بعض افسروں کی غفلت نے مشرقی پاکستان میں اس تاثر کو جنم دیا کہ مغربی پاکستان، مشرقی پاکستان کے ساتھ نا انصافی کر رہا ہے۔ گویا گاندھی کی منطق ہمیں تباہی کے دھانے تک لے آئی۔ ''چھ نکات'' کے ضمن میں اب کوئی شک وشبے کی گنجائش نہیں رہی۔ کہ اس کے پسِ پشت بھارتی دماغ کارفرما تھے۔ برطانیہ کی تائید اسے حاصل تھی۔ بنگال کے ہندو اذہان نے مسلمان لیڈروں پر اثر ڈال کر اسے منظور کرایا۔ لیکن یہ ثابت ہو چکا ہے کہ چھ نکات کے پیچھے جو فلسفہ ہے جو مہاتما گاندھی کے سیاسی افکار پر مبنی ہے۔ ان چھ نکات کی تینوں شکلوں کو ڈاکٹر وحید قریشی نے صفحہ نمبر ۲۲۹، ۲۳۰ اور ۲۳۱ پر نقل کیا ہے اور اس ضمن میں فرماتے ہیں کہ چھ نکات کے خالقین قرارداد لاہور کی عبارت کے اس حصے کو بنیاد جانتے ہیں جن میں مسلمانوں کی دو علیحدہ مملکتوں کا تصور صرف بزور ہی نکالا جا سکتا ہے۔ حالانکہ ۱۹۴۱ء میں ایک لفظ کے اضافے نے اس امکان کو مٹا دیا تھا اور جو لوگ قائد اعظم کے پارلیمانی طریق کار سے واقف ہیں اور ان کے کردار کے بارے میں جانتے ہیں۔ وہ یہ بھی جانتے ہوں گے کہ قائد اعظم دیانت داری کو سیاست کی بنیاد سمجھتے تھے۔ انہوں نے سٹیٹس کا لفظ پاکستان کے دونوں حصوں کو علیحدہ قرار دینے کے لیے نہیں استعمال کیا تھا۔ یہ نظریہ پاکستان کے خلاف کام کرنے والے ذہنوں کی شرارت تھی کہ جو قرارداد کی زبان پر مسلسل مخالفت کی آوازیں اٹھا رہے تھے۔ وہ درحقیقت مشرقی پاکستان کی علیحدہ حیثیت کو مستحکم کرنے کے لیے کوشاں تھے۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے تاریخی حقائق کو دلائل و براہین کی روشنی پرکھا ہے اور قائد اعظم کے سچے اور بے داغ کردار کی تصویر پیش کر دی ہے۔

اس سے اگلے باب یعنی'' نظریاتی بنیادیں اور آئین'' میں ڈاکٹر وحید قریشی نے پاکستان کی تحریک کی فکری ونظری بنیادوں کے تناظر میں آئین کا جائزہ لینے کی کوشش کی ہے۔ قراردادِ پاکستان کی رو سے کس طرح کا آئین اس مملکت کے لیے مناسب حل ہو سکتا ہے۔ یہ مسئلہ غور طلب رہا ہے۔ قرارداد پاکستان ہمارے ملی تشخص اور قومی نصب العین کا مصدر رہی ہے اور اس میں ہمارے آئینی نظام کی کسی قدر جھلک ملتی ہے۔ قائد اعظم نے ہمیشہ قراردادِ پاکستان کو مسلمانوں کے مطالبے کا اعلانیہ اور بنیادی مقصد قرار دیا۔ قائد اعظم کے ان

تجربات اور آراء کی روشنی میں ہی پاکستان کو آئینی بحران سے نکالا جا سکتا ہے۔ آئین ایک پُر خلوص معاہدہ ہے۔ جسے پاکستان کے باشندوں کے طرزِ فکر سے پوری طرح ہم آہنگ ہونا چاہیے۔ آئین کی سب سے زیادہ بے حرمتی وہ طریق کار ہے جس کے تحت اختیارات کو آرڈی ننسوں یا خصوصی قوانین کے ذریعے وسیع سے وسیع تر کر لیا جائے۔ آئین کا احترام محض حلف وفاداری اٹھانے سے پورا نہیں ہوتا۔ آئین کے خالق کو خود بھی قانون کے ماتحت رہنا پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ بار بار آئین کی منسوخی نے بھی آئین کو نقصان پہنچایا ہے۔ لیکن اگر ملک کو مزید انتشار سے بچانا مقصود ہے تو بھی ہمیں اپنی سوچ میں توازن اور اعتدال پیدا کرنا ہوگا۔ جمہوری قدروں کو بحال کرنا ہوگا اور آئین کے احترام کا رواج پیدا کرنا ہوگا۔ تاریخی روایات میں تسلسل بھی پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ قائداعظم کے افکار و خیالات کے ذریعے موجودہ آئینی بحران کا حل دریافت کیا جانا چاہیے۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے آئین کی بنیادیں قراردادِ پاکستان میں تلاش کی ہیں جب کہ آئین کے بحران کے حل کی تلاش کے لیے قائداعظم کی شخصیت و کردار کی طرف رجوع کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ آئین سازی کے مرحلے میں ماضی کے آئینی تجربات، سیاسی تفسیرات اور قائداعظم کے افکار و خیالات کے ذریعے رہنمائی حاصل کر کے موجودہ آئینی بحران کے اسباب کا سراغ لگایا جائے اور اس کا حل دریافت کیا جائے۔

پاکستان کے حالیہ آئین کو جن خطوط پر تیار کیا جا رہا ہے۔ اس میں بنیادی محور فیڈریشن ہے اور اس کے بارے میں غلط فہمی عام ہے۔ کہ اس میں آل انڈیا فیڈریشن کا نقشہ ہے۔ حالانکہ قرارداد میں ایسا کوئی اشارہ نہیں۔ قائداعظم ۱۹۴۳ء میں ہی یہ واضح کر چکے تھے کہ قرارداد میں کسی آل انڈیا فیڈریشن کا خیال ملحوظ خاطر نہیں رکھا گیا۔ قرارداد دو الگ الگ مملکتوں کا اعلان ہے۔ ہاں یہ الگ بات ہے کہ محرکین قرارداد نے دوسری مملکت کے برملا اظہار کو کھل کر بیان نہیں کیا۔ قائداعظم نے فیڈریشن کی جگہ کنفیڈریشن کے لینے کی مخالفت کی۔ فیڈریشن کے حوالے سے دیکھا جائے تو قراردادِ لاہور کا آئینی ڈھانچہ نہایت واضح ہے۔ تدریجی علیحدگی کا راستہ مسلم لیگ نے اختیار نہیں کیا اور قرار داد پاکستان میں دوٹوک اپنے مسلک کا اعلان کیا تھا۔ ان کا راستہ آل انڈیا فیڈریشن سے مکمل آزادی اور علیحدگی کا راستہ نہ تھا۔ بلکہ خودمختار ریاستوں کی منزل سے آزاد اور خودمختار پاکستان کی طرف جانا تھا۔ قرارداد پاکستان کی اسی آئینی روح کو قائداعظم نے ہمیشہ پیش کیا۔ انہوں نے ہمیشہ بھارت اور برطانیہ

سے عارضی حکومت کی تشکیل کا مطالبہ کیا۔ یعنی دو قومی نظریے کی بنیاد پر دو قوموں میں برابری کا حق، مشرقی اور مغربی پاکستان پر اس فارمولے کا اطلاق بھی مفاہمت کے اصول پر کیا گیا۔

موجودہ وطن میں اختیارات کی تقسیم کا مسئلہ اور جمہوری نظام کا اجراء کن اصولوں پر مبنی ہو اور کن تاریخی راہوں پر استوار رہو۔

اس ضمن میں ڈاکٹر وحید قریشی یوں رقم طراز ہیں:

> جس قدر کوئی نظام اختیارات کو زیادہ سے زیادہ افراد میں تقسیم کرتا جائے گا۔ جمہوری ہوتا جائے گا اور جتنا کسی فردِ واحد یا کسی مخصوص چارپاری میں سمٹتا جائے گا۔ اتنا ہی وہ نظام غیر جمہوری غیر نمائندہ اور فاشی ہو گا۔ چند سری حکومت (Oligrachy) اور ڈکٹیٹرشپ (Dictatorship) غیر جمہوری طرز کی سب سے زیادہ خطرناک صورتیں ہیں۔ کیونکہ ان میں اختیارات کی تقسیم کی بجائے ان کا ارتکاز اختیارات ہی کا مسئلہ ہے۔ اس بحران سے ہم اسی وقت نکل سکتے ہیں۔ جب آئین کو عوامی خواہشات کے زیادہ سے زیادہ مطابق کر دیں۔ اختیارات کی تقسیم کا یہ عمل لازماً ہمیں قائداعظم کے تجویز کردہ اصولوں کی طرف لوٹنے پر مجبور کرتا ہے اور اسی میں ہماری ملی فلاح مضمر ہے۔[۲۰]

پاکستان کی نظریاتی بنیادوں کو اقبال، قائداعظم، قراردادِ پاکستان، مشرقی پاکستان اور آئین کے تناظر میں دیکھنے کے بعد ڈاکٹر وحید قریشی اس نتیجے پر پہنچے ہیں۔ کہ اگر ہم قائداعظم اور تحریکِ پاکستان کے روحِ رواں نظریات کو اپنا کر آگے بڑھیں تو ہمیں پاکستان کی نظریاتی بنیادوں کو لے کر آگے بڑھنے اور ایک تہذیب و تمدن کو لے کر اپنی ایک منفرد پہچان بنانے میں مدد ملے گی۔

قائداعظم کو نظریاتی اساس پیش کرنے کے لیے کسی دوسرے سہارے کی ضرورت نہ تھی۔ انہوں نے اسلام کو بنیاد بنا کر اپنے تاریخی سرمائے سے استفادہ کیا۔ اس حقیقت کو جاننے کے لیے قائداعظم کے افکار اور خیالات کا بغور اور مفصل جائزہ لینے ضرورت ہے۔ جس کی روشنی میں ہم پاکستان کے عہد نو کو استوار کر سکیں۔ اس ضمن میں ڈاکٹر وحید قریشی نے پاکستانی مؤرخین کا ایک بورڈ مقرر کرنے کی تجویز پیش کی ہے۔ جس نے کتابیات کے کام کو پہلے مکمل کر کے قائداعظم کی تقاریر کو شائع کیا۔

ڈاکٹر قریشی کی کتاب کو بنیاد بنا کر تحریکِ پاکستان کی تاریخ مرتب کرنا ضروری ہے۔ ابھی سیاسی رہنماؤں کی نسل موجود ہے۔ اخباروں کے فائل اور فیک کا ریکارڈ بھی موجود ہے۔ اس لیے آج کے مؤرخ کے لیے راہِ عمل آسان ہے۔

جہاں پاکستان کی نظریاتی اساس کی بات ہوتی ہے، وہاں ثقافتی زندگی کو تشکیل دینے والے عناصر کا تذکرہ بھی ہوتا ہے۔ ان میں لسانیات بھی نہایت اہم عنصر ہے۔ پاکستان لسانی مسائل تین مختلف اطراف سے دیکھے جا سکتے ہیں۔ ان کا ایک رخ خالصتاً ادبی ہے۔ دوسرا رخ سماجی افکار اور تیسرا سیاسی مسائل کے ساتھ وابستہ ہے۔ لسانیات کا رابطہ ملک کی سرکاری یا قومی زبان سے کیا ہے؟ اسی سوال کے جواب سے ہمارے بہت سے ثقافتی اور لسانی رویے متشکل ہوتے ہیں۔ مقامی زبان ملی زبان کی سطح پر سماجی رشتے میں منسلک ہو جاتی ہے اور مقامی عمل کی توسیع بن جاتی ہے اور دونوں کے درمیان اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا۔ پھر اُردو اور پنجابی کے لسانی سانچے، صرف ونحو اور ذخیرہ الفاظ مشترک ہیں۔ گویا اردو زبان کی ابتدا سرزمین پاکستان سے ہوئی لیکن اس کے ادبی مراکز پاکستان سے باہر دلی اور لکھنؤ میں قائم ہوئے۔ چنانچہ ارتقائی مراحل میں ادبی زبان کا جو مزاج متعین ہوا۔ وہ پاکستان کی جغرافیائی حدود سے نکل کر اردو کے اس سانچے کے مطابق ہے۔ جو دلی اور لکھنؤ نے قائم کیا اور جس سے ادبی اثرات قرار دیا جا سکتا ہے۔ اردو پاکستان کے کسی علاقے کی بول چال کی زبان نہ تھی۔ مگر مقامی زبانوں سے ہم آہنگی پیدا کرنے کے نتیجے میں شعوری سطح پر لسانی تفرقات کا خاتمہ ہوسکتا ہے۔ زبان محض اظہار کا ایک وسیلہ اور رابطے کا ذریعہ ہے۔ لسانی عمل کو افہام وتفہیم سے حل کرنا چاہئے۔ الجھانا نہیں چاہیے۔ زبان کوئی جامد شے نہیں۔ بلکہ یہ ایک حرکی عمل ہے۔ جو مسلسل ارتقاء اور تبدیلیوں سے گزرتا رہتا ہے۔ یہ کسی بھی قوم کی تہذیبی اور تمدنی زندگی کی علامت ہوتی ہے۔ اس کی بدولت ثقافتی مظاہر زندہ رہتے ہیں۔ وگرنہ معاشرہ اپنے ماضی کو کھوکر زندہ رہنے کے امکان سے محروم ہو جاتا ہے۔ برصغیر پاک و ہند میں زبان کے علاوہ رسم الخط کا مسئلہ بھی لاحق رہا ہے۔

رسم الخط کے مسئلے پر ڈاکٹر وحید قریشی نے بڑی مہارت سے روشنی ڈالی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے۔ ان کو دیگر علوم وفنون کی طرح رسم الخط کے بارے میں بھی انتہائی ادق اور باریک معلومات پر عبور حاصل ہے۔ مثلاً نسخ، عربی رسم الخط کوفی، نستعلیق، بہاری رسم الخط سب کے بارے میں ان کا علم یکساں ہے۔ اس کے

ساتھ ساتھ ٹائپ رائٹر سے کون سا خط مناسب موٹائی اور سائز میں لکھا جا سکتا ہے۔ درحقیقت زبان اور نظریہ علم وفن کی طرح رسم الخط بھی مسلمانوں کی جداگانہ ثقافت کا مظہر ہے اور پاکستان کی سالمیت کا ایک اہم عنصر ہے۔ برصغیر پاک و ہند میں عربی رسم الخط بہت سے مراحل سے گزرا ہے اور اسلامی پہچان کی ایک واضح علامت بن گیا ہے۔

ڈاکٹر وحید قریشی نے اپنی مختلف تصنیفات میں پاکستان کے نظریہ کی مختلف بنیادوں کے بارے میں لکھا ہے اور ان کو اس امر پر یقین کامل ہے کہ مسلمان کے وجود کا دارومدار اس کے وطن سے زیادہ اس کے مذہب پر ہے جو کہ اس کا بنیادی نظریۂ قومیت ہے۔ اس کے علاوہ اسلام کے مختلف مظاہر و عناصر ہماری عمومی زندگی میں جلوہ گر اور عمل پیرا ہوئے ہیں۔ ان میں ہمارا طرزِ فکر و عمل، طرزِ تعلیم، آئین ہمارے اکابر رہنما اور ان کا طرزِ فکر جو کہ اس امر پر متفق ہیں کہ ہمارا مذہب ہی ہماری زندگیوں کے سیاسی و سماجی اور معاشرتی و معاشی پہلوؤں کا سرچشمہ و ماخذ ہے۔

اب انہی عوامل و عناصر کی بدولت پاکستانی قومیت کی تشکیل نو ممکن ہے اور اس مقصد کے لیے قوم کی نژادِ نو کے دِلوں میں اسلام اور اس کی بنیادی تعلیمات راسخ کرنے کی ضرورت ہے۔ ان کو اپنی منفرد تہذیب و ثقافت پر فخر کرنے کے اسباب بتانے کی ضرورت ہے۔ تا کہ مغربی چکا چوند سے اپنا دامن بچا کر اپنی منزل کا اصل رخ متعین کرنے میں کامیاب ہوسکیں اور کسی احساس کمتری کا شکار ہوئے بغیر پروقار اور بااعتماد انداز سے اپنی قوم نو کو ایک نیا رخ عطا کر سکیں۔

☆☆☆

حوالہ جات (باب ششم)

۱ وحید قریشی ڈاکٹر، اقبال اور پاکستانی قومیت، مکتبہ عالیہ انارکلی لاہور، ۱۹۷۷، صفحہ ۲۲۔

۲ ایضاً۔ صفحہ ۹۴۔

۳ ایضاً۔ صفحہ ۱۴۲۔

۴ ایضاً۔ صفحہ ۱۵۔

۵ ایضاً۔ صفحہ ۸۰۔

۶ ایضاً۔ صفحہ ۳۶۔

۷ وحید قریشی ڈاکٹر، پاکستان کی نظریاتی بنیادیں ایجوکیشنل ایمپوریم لاہور ۱۹۷۳ء صفحہ ۱۱۳۔۱۱۴۔

۸ وحید قریشی ڈاکٹر، قائداعظم اور تحریکِ پاکستان مکتبۂ عالیہ لاہور، ۱۹۸۰ء صفحہ ۶۱۔

۹ ایضاً۔ صفحہ ۲۴۔

۱۰ ایضاً۔ صفحہ ۲۵۔

۱۱ ایضاً۔ صفحہ ۵۳۔

۱۲ ایضاً۔ صفحہ ۶۰۔

۱۳ ایضاً۔ صفحہ ۶۲۔

۱۴ ایضاً۔ صفحہ ۸۴۔

۱۵ ایضاً۔ صفحہ ۸۶۔

۱۶ ایضاً۔ صفحہ ۹۴۔

۱۷ وحید قریشی ڈاکٹر، پاکستان کی نظریاتی بنیادیں، صفحہ ۲۵ تا ۲۶۔

۱۸ ملتِ بیضا پر ایک عمرانی نظر، صفحہ ۹، بحوالہ پاکستان کی نظریاتی بنیادیں، صفحہ ۴۔

۱۹ Foundation of Pakistan. PP 337, 338.

۲۰ وحید قریشی ڈاکٹر پاکستان کی نظریاتی بنیادیں، صفحہ ۲۶۵۔

☆☆☆

باب ہفتم

ڈاکٹر وحید قریشی بحیثیت اقبال شناس

اقبال ہمارے قومی اور ملّی شاعر نیز عظیم مفکر ہیں۔ فکرِ اقبال نے تحریکِ پاکستان کو نظریاتی بنیاد فراہم کی۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال شناسی کے ضمن میں برس ہا برس سے دانشورانِ ادب کام کر رہے ہیں۔ اقبالیات پر تحقیق نے روشنی بن کر علوم کی نئی جہات کے در وا کیے ہیں۔

اقبالیات اپنی جہات میں ایک سماجی علم ہے۔ اس کو سمجھنے کے لیے تاریخ تعلیم و سیاسیات اور الٰہیات کے موضوعات پر دسترس ضروری ہے۔ کیونکہ آنے والی صدیوں میں فکرِ اقبال کی اہمیت اور معنویت عظیم تر رُخ اختیار کرے گی۔ اقبال کا تصورِ قومیت ہو یا اقبال کے دیگر سیاسی تصورات ان کے مابین اختلاف و اشتراک کا جائزہ لینا ایک ماہر محقق ہی کا خاصا ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی دورِ حاضر میں ایسا نام ہیں کہ جنھوں نے اقبالیات کے میدان میں تحقیق کے بعض اہم اصول وضع کیے حال اور مستقبل کو سامنے رکھ کر اقبال کے سیاسی اور عمرانی تصورات پر اپنی تحقیق کی بنیاد رکھی۔ اقبال کے مابعد الطبیعاتی افکار، تجزیے اور تنقید کی طرف بھی توجہ دی۔ اِس طرح اقبال کے سیاسی تصورات کا جدید ترقیات اور معروضی حالات کی روشنی میں ازسرِ نو جائزہ لیا۔ اسلام، عالم اسلام ملوکیت شخصی آمریت اور بالخصوص عربی شہنشاہیت کے اسلام پر اثرات کے حوالے سے اقبال کے مؤقف کا مطالعہ کیا۔ اقبالیات پر تحقیق کے حوالے سے دیکھا جائے تو ڈاکٹر وحید قریشی کی رائے اور تحقیق بے حد اہمیت رکھتی ہے۔ فکرِ اقبال کا مطالعہ محض ادبی یا لسانی حیثیت نہیں رکھتا۔ اِس کی جڑیں سماجی علوم یا عمرانیات میں بھی پیوست ہیں۔

ڈاکٹر وحید قریشی نے اقبالیات پر بے شمار مقالات اور کتابیں تحریر کی ہیں۔ اِن میں اقبال کے موضوع پر تحقیقی مضامین بھی شامل ہیں اور باقاعدہ تصنیفات بھی۔ خطوطِ اقبال پر بھی ڈاکٹر صاحب کی گہری نظر ہے۔ اِن کے اہم کارناموں کو ایک نظر میں یوں دیکھا جاسکتا ہے۔

مقالات

۱۔	اقبال کے تیرہ غیر مطبوعہ خطوط	آفاق لاہور اقبال نمبر ۱۹۵۵ء
۲۔	اقبال کا رنگِ اصلاح	کردارِ نو لاہور اپریل ۱۹۵۹ء
۳۔	اقبال تے پاکستان	لہراں ماہنامہ لاہور اپریل ۱۹۶۷ء
۴۔	خطوط اقبال کا ذخیرہ محمد عمر الدین	سویرا لاہور جنوری، مارچ ۱۹۷۸ء
۵۔	اقبال اور پاکستان کا تخیل	صحیفہ، لاہور اکتوبر دسمبر ۱۹۸۸ء
۶۔	شعر اقبال (فارسی)	اقبالیات (فارسی) لاہور جلد چہارم، شمارہ نمبر ۱، ۱۹۸۹ء
۷۔	علامہ اقبال کا تصور ریاست	مخزن قائداعظم لائبریری لاہور، جلد دوم، شمارہ ۲، دسمبر ۲۰۰۲ء

تصنیفات

۱۔	اقبال اور پاکستانی قومیت (مجموعہ مقالات)	لاہور مکتبہ عالیہ، ۱۹۷۷ء
۲۔	اساسیاتِ اقبال (مجموعہ مقالات)	لاہور اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۹۶ء

ادارتی خدمات

۱۔	''اقبال ریویو'' (اردو، انگریزی، فارسی)	لاہور اقبال اکیڈمی پاکستان ۱۹۸۲ء تا ۱۹۸۳ء
۲۔	''اقبال''	لاہور، بزم اقبال ۱۹۸۸ء تا ۱۹۹۴ء

اعزاز

اقبال ایوارڈ، حکومتِ پاکستان ۲۰۰۳ء

اقبالیات کے حوالے سے

۱۔ ناظم (اضافی فرائض) اقبال اکادمی پاکستان

لاہور ۲۷ جولائی ۱۹۸۲ء تا اپریل ۱۹۸۳ء

۲۔ معتمد (اعزازی) بزمِ اقبال لاہور ۲۸ نومبر ۱۹۸۷ء تا ۲۶ مارچ ۱۹۹۴ء

۳۔ ناظم اقبال اکادمی پاکستان لاہور ۹ ستمبر ۱۹۹۳ء تا ۱۲ جون ۱۹۹۷ء

ڈاکٹر وحید قریشی نے اقبال کو اُدبی روایات کے تدریجی عمل کا نقطۂ عروج قرار دیا ہے ان کے خیال میں بالِ جبریل اِس عروج اور عظمت کا نقطۂ اتصال ہے جس کا ربط گزشتہ روایات غزل سے پیوستہ ہے یہاں آ کر اقبال کی شخصیت اور غالب کی ہستی میں ایک خاص داخلی ربط پیدا ہو جاتا ہے۔ اقبال اسلوب کے ضمن میں غالب کے انداز سے خوشہ چینی کرتے نظر آتے ہیں۔ غالب کی طرح اقبال نے بھی اپنے فلسفے کے بہترین پہلوؤں کو فارسی کتب میں دکھایا ہے اور پھر دوبارہ فارسی سے اُردو کی طرف متوجہ ہوئے۔

اقبال اُردو میں بالِ جبریل اور فارسی میں زبورِ عجم کو اقبال کے فن کی معراج سمجھتے ہیں۔ اقبال کا فن فلسفیانہ افکار سے مملو ہے جس کا عکس جاوید نامہٗ میں جھلکتا ہے۔ اِن کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر وحید قریشی فرماتے ہیں:

> بالِ جبریل کے بعد ہی اقبال نے کئی ایک کتابیں لکھیں مثلاً ضربِ کلیم، لیکن ضربِ کلیم کے بارے میں اُنہوں نے خود ایک خط میں کہا ہے کہ اس میں میں نے کوشش یہ کی ہے کہ ایک اخلاقی لہجہ (Tune) اختیار کروں۔ کتاب کا ایک خاص اسلوب بھی ہے اور اسی کو انہوں نے برقرار و بحال رکھ کر سیدھے سادے انداز میں کچھ باتیں کہنے کی کوشش کی ہے۔ یہ اپنی جگہ ایک اہم تجربہ تھا لیکن میرے نزدیک ضربِ کلیم کا درجہ نہیں ہے جو شعری

لحاظ سے بالِ جبریل کا ہے۔ غزلوں کو دیکھیے اس میں بھی وہ غزل کی عام روایت کو نہیں لیتے بلکہ اس سے آگے بڑھتے ہیں۔ اُردو شاعری کو بعض نئے سانچے دیتے ہیں کہ جن کی بناء پر آگے چل کر سیاسی اور سماجی معاملات بیان کرنے کی سکت اس میں پیدا ہو گئی ہے۔

۔۔۔بالِ جبریل میں اقبال کے مختلف فنون شاعری کے ساتھ مل کر ایک اکائی بن جاتے ہیں اور ان کے درمیانی فاصلے مٹ جاتے ہیں مثلاً شاعری اور مصوری اور شاعری اور موسیقی کی درمیانی حدوں کو پاٹ کر انہوں نے نظموں کی تخلیق کی ہے۔[۱]

اقبال کی فارسی شاعری میں افکار کی تخلیقی سطح زیادہ منظم و مستحکم دکھائی دیتی ہے۔

قیامِ پاکستان کی نظریاتی بنیادوں اور فکرِ اقبال کے ضمن میں ڈاکٹر وحید قریشی کے خیالات بالکل واضح اور ٹھوس ہیں۔ اِن کے خیال میں ہم نے اپنا نصب العین فراموش کر دیا ہے اور اِس کے نتیجے میں ہمارے ہاں فکری انتشار پیدا ہو رہا ہے جو سماجی زندگی کے مختلف شعبوں میں ظاہر ہوا ہے۔ اِس کی بنیادی وجہ ان کے خیال میں یہ ہے کہ اقبال کے فارسی کلام سے ہم آشنا نہیں ہیں۔ اقبال اور قائداعظم کی تحریروں سے استفادہ تو دور کی بات، ہم نے انہیں مکمل طور پر مدون کرنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی۔ اقبال اکیڈمی اور بزم اقبال قائم ہیں مگر اقبال کی جملہ تحریروں کو یکجا کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔

اقبال کے تصورِ جمہوریت کے بارے میں ڈاکٹر وحید قریشی جمہوریت کی ایک اصل روح کی وضاحت کرتے ہیں جس میں ایسے جمہوری ادارے ہوں جن میں مخصوص خاندان اور برادریاں ہی اسمبلیوں پر قابض نہ ہوں بلکہ اعلیٰ اخلاقی اقدار کے حامل صحیح افراد منتخب ہو کر ایوان میں پہنچیں۔ جمہوریت اقبال کا آئیڈیل نظام نہیں ان کے آئیڈیل نظام کی جانب ایک چھوٹی سی پیش رفت ہے وہ اسلام کی روشنی میں جمہوری اقدار کو از سرِ نو متشکل کرنا چاہتے ہیں۔ اس لیے کہ جمہوریت کا اصل علمبردار تو اسلام ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی کے خیال میں اقبال کی فکر کثرت تعبیر کا شکار ہو گئی ہے۔ اقبال کو اقبال کے نکتۂ نظر سے دیکھنے کی ضرورت ہے مثلاً جب اقبال اسلام کی بات کرتے ہیں تو ایک خاص زاویئے سے بات کرتے ہیں۔ وہ اِسلامی ریاست کا جو تصور پیش کرتے ہیں وہ تھیوکریٹک نہیں بلکہ اِسلامک سٹیٹ ہے۔ اِن کا مثالی مردِ مومن معتدل اور متوازن مزاج ہے۔ نطشے کے فوق البشر اور اقبال کے مردِ مومن میں فرق یہ ہے کہ اقبال اخلاقی اقدار کے پابند ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اقبال کے

مکمل نقطۂ نظر تک رسائی حاصل کرنے کے لیے صرف ان کی شاعری پڑھنے سے مدد نہیں مل سکتی۔ بلکہ اقبال کی شاعری کو سمجھنے کے لیے ان کی نثر، ان کے خطوط، ان کے بیانات اور خطبات و مقالات کو دیکھنا ضروری ہے کیونکہ اَدب ادیب کے داخلی عمل سے مربوط ہوتا ہے۔

اقبال میرؔ اور غالبؔ کے مقابلے میں زندگی کے بڑے مسائل کو پیشِ نظر رکھتے ہیں اور ان کے فن کا حصار زیادہ وسیع ہے۔ تجربات کی رنگارنگی ان کے ہاں زیادہ ملتی ہے۔ فکر و احساس کی صورتیں زیادہ ہیں۔ عصری آ گہی بھی زیادہ ہے اور اقبال ہماری ذہنی ضروریات کو زیادہ پورا کرتے ہیں۔ اقبال کی تمام تخلیقات اور اصناف میں ڈاکٹر وحید قریشی ایک قدرِ مشترک تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں کیونکہ ادیب کی فکر کا ہر پہلو اس کی سوچ کو پیش کرتا ہے جو تصورِ فن بن کر اس کی ہر سطر میں جاری و ساری ہوتا ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی فرماتے ہیں:

> شاعری اقبال کے کمالات کا صرف ایک پہلو ہے اور نثر میں فلسفیانہ خیالات کو بیان کرنے کا نیا سانچہ اقبال نے ہی دیا ہے پھر انہوں نے سیاسی اور اقتصادی موضوعات پر جو کچھ لکھا ہے وہ ہمارے لیے آج بھی مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اِن کے اُردو اور انگریزی خطوط ہزاروں کی تعداد میں موجود ہیں، مضامین اور تقاریر ان کے علاوہ ہیں۔ اقبال اگرچہ سیاست میں عملی طور پر زیادہ حصہ نہیں لیتے تھے۔ لیکن ان کی سیاسی حیثیت بھی مسلمہ ہے۔ وہ اس قدر صاحب بصیرت تھے کہ افغانستان، ایران، کشمیر کے حوالے سے ان کی باتیں آج بھی سچ ثابت ہو رہی ہیں۔ اقبال کی فکر آج بھی بہت سے معاملات میں ہماری رہنمائی کر سکتی ہے۔[۲]

ثقافت ایک وسیع اللسانی اصطلاح ہے لیکن اقبال کے ہاں ثقافت بنیادی طور پر ایک Intellectual Activity کا نام ہے۔ جو کسی بھی معاشرے کی اقدار پر منحصر ہوتی ہے اگرچہ ہم دیگر اسلامی ممالک سے اختلافی امور کو پسِ پُشت ڈال کر مشابہتوں پر زور دیں تو یہ وہی مشابہتیں ہیں جن کو بنیاد بنا کر اقبال کے تجویز کردہ اسلامی گلوبل ولیج (Islamic Global Village) کے تصور تک پہنچا جا سکتا ہے۔

فارسی ایک ایسی مشابہت ہے جو کہ ماضی میں ہمارے تشخص اور وقار کی علامت تھی۔ انگریز نے آنے کے بعد پہلی ضرب اس کی سرکاری حیثیت پر لگائی۔ غالب نے اپنے دور کے رجحانات سے ہٹ کر اس کے زندہ

عناصر پر بھروسہ کیا۔ وہ شعری روایت جو غالب سے پہلے فارسی شاعری میں ختم ہو رہی تھی اور اقبال تک آتے آتے اور بھی مدھم پڑ گئی۔ اسے غالب نے اپنے کمالِ فن سے تخلیقی سطح پر اُبھار کر حیاتِ نو بخشی۔ اِس طرح غالب سے اقبال تک فارسی شعری روایات بعض نئی قوتوں سے مستحکم ہوئیں۔ فارسی زبان غالب اور اقبال کے درمیان ایک پُل ہے اور اس لسانی روایت کو نظر انداز کرنا ممکن نہیں۔

ڈاکٹر وحید قریشی غالب کی فارسی گوئی، اقبال کی بالِ جبریل اور سر رضا علی کی سوانح ''اعمال نامہ'' کو عجمی ہندی روایت کا ناگزیر تسلسل قرار دیتے ہیں کیونکہ تینوں ادباء تاریخ کے ایک نازک مگر کڑے دور کے سرے پر کھڑے تھے۔ جب ماضی کا بدحال پیکر پیچھے تھا۔ حال کا سراغ نہ تھا اور مستقبل معدوم تھا مگر تینوں نے اپنی اپنی جودتِ طبع سے ایک اظہار کے پیرائے کو اپنایا مگر مختلف راستے اختیار کر کے ان راستوں کو ایک منزل کی طرف موڑ دیا۔

ڈاکٹر وحید قریشی علامہ اقبال پر کی گئی تنقید اور تحقیق کو اغلاط سے پاک رکھنے کے لیے غیر معتبر روایتوں پر یقین کرنے کو تحقیقی مزاج کے خلاف قرار دیتے ہیں۔ وہ اقبال کے نظریات و عقائد کو جاننے کے لیے ہر حوالے اور ماخذ کو مستند قرار نہیں دیتے یعنی ہر وہ کتاب جو اقبالیات کے موضوع پر لکھی گئی۔ وہ حیاتِ اقبال کی تدوین کے لیے سائنٹیفک ذرائع پر اعتماد کرنا ضروری خیال کرتے ہیں۔ اقبال کی زندگی کے بعض واقعات و کوائف ابھی تک اوجھل ہیں اور ان کی حقیقت کو جاننے اور سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ان کے درست سنین اور کوائف کو جاننے کے لیے ٹھوس ماخذوں کا سہارا لیا جائے اور درست سنین کو جاننے اور تحقیق میں بیان کرنے کی کوشش کی جائے ابھی حیاتِ اقبال کے بہت سے گوشے خفتہ ہیں۔ لیکن ابھی تک اتنا وقت نہیں گزرا کہ ان پر سے پردہ نہ ہٹایا جاسکے۔ عقیدت مندی اور والہانہ لگاؤ اچھے جذبے ہیں لیکن تحقیق کے راستے کی بڑی رکاوٹیں ہیں۔ واقعات کی صحت، چھان بین اور ترتیب و تدوین کا تقاضا کچھ اور ہے اور وہ یہ ہے کہ لاتعداد کتب میں سے چند معتبر کتابیں چُن لی جاتیں جو حیاتِ اقبال پر دیانتداری سے لکھی گئیں۔ اس ضمن میں ڈاکٹر وحید قریشی فرماتے ہیں:

> حیاتِ اقبال کی تدوین کے کام رُکے پڑے ہیں، اِن کا زمانہ بہت دور کا زمانہ نہیں، ابھی انہیں جاننے والے موجود ہیں، ابھی ان کی زندگی وقت کی گرد سے محفوظ ہے۔ اگر

سائنٹیفک ذرائع سے کام لے کر ابھی سے حیاتِ اقبال کی تدوین نہ کی گئی تو چند برس کے بعد یہ کام شاید زیادہ دقت طلب ہو جائے۔ ابھی تک حیاتِ اقبال کی تلاش کی طرف سے غفلت رہی ہے اور محققین نقل در نقل کے اصول پر چل کر ایک دوسرے کے بیانات پر اکتفا کرتے رہے ہیں۔[۳]

اقبال کی سن پیدائش کے حوالے سے کئی کتب میں تضاد پایا جاتا ہے۔ اِس کے علاوہ دیگر کئی تفصیلات بھی حل طلب ہیں۔ لیکن ڈاکٹر وحید قریشی نے ایسی کتب کا سراغ لگایا ہے جہاں متنازعہ باتوں کو حل کر کے پیش کیا گیا ہے۔

مثال کے طور پر فقیر سید وحید الدین کی ''روزگار فقیر'' ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی کی ''اقبال کی زندگی کے آخری دو سال'' عبداللہ قریشی کا سلسلہ مضامین ''حیات اقبال کی گم شدہ کڑیاں'' اور ''اقبال اور کشمیر'' ہے۔ دیگر مستند کتب میں "Some Aspects of Iqbal's Biography" ''اقبال کا تعلیمی سفر'' خاصے کی چیزیں ہیں۔ اِس کے علاوہ سیّد محسن ترمذی نے ہائی کورٹ کی فائل پر پاکستان ٹائمز میں جو مقالہ لکھا وہ بھی کچھ نیا مواد سامنے لاتا ہے۔ اِسی طرح کرنل عبدالرشید کا علامہ اقبال کے نکاح نامے کے سلسلے میں خط (مطبوعہ پاکستان ٹائمز) اور اِس سلسلے کی بحث و تمحیض بھی اقبالیات کے اس نقل در نقل کے اصول سے انحراف کر کے بعض نئے انکشافات کی حامل ہے۔ لیکن یہ چند مستثنیات ہیں اور حیات اقبال پر ابھی تفصیلی کام کی گنجائش ہے اور ڈاکٹر وحید قریشی نے اپنے متفرق مقالات اور تصنیفات میں اقبال کے فکر و فن پر روشنی ڈالی ہے۔

اِس سلسلے میں اِن کی تصنیف ''اساسیاتِ اقبال'' اہم ترین دستاویز ہے جس میں اقبال کے حالات و کوائف اور فکر و فن پر ادبی و تحقیقی انداز میں تبصرہ کیا گیا ہے۔ یہ قومی صدارتی ایوارڈ یافتہ کتاب ہے جو تحقیق و تنقید کا نقطہ اتصال ہے جس میں اقبال کے نظام الاوقات سے لے کر ان کی مدتِ ملازمت، یورپ میں تکمیلِ تعلیم، مقالات، اعزازات کی تفصیلات ہیں۔ چغتائی کے فن میں اقبال کی شاعری کی نظریاتی تعبیریں تلاش کی گئی ہیں۔ چغتائی کے فن کا محاکمہ کرتے ہوئے ڈاکٹر وحید قریشی کے تاثرات ناظر کے نہیں بلکہ ایک ماہر مصوّر کے سے ہیں۔ جن کا قلم ایک فنکار کا مُوقلم بن جاتا ہے۔ وہ چغتائی کے ہر خط کی باریکیوں اور رنگوں کی گہرائیوں سے باتیں کرتے نظر آتے ہیں۔ اقبال کے فن اور چغتائی کے فن میں مماثلتیں اور تقابل کر کے دونوں

کو یکجا دیکھا گیا ہے۔ اقبال کے فن سے زیادہ چغتائی کے فن پر بحث کر کے ان کے فن کی عظمت کو بیان کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی اس ضمن میں رقم طراز ہیں:

> اقبال کے اشعار کی فکری سطح کو چغتائی نے بالعموم آنکھوں ہی کے حوالے سے بیان کیا ہے۔ اقبال کے مردِ قلندر کی آنکھیں، خرقہ پوش کی نگہ نیم باز، مردِ مومن کی کم آمیزی قلندر کی خمار آلود آنکھیں۔۔۔ یہ سب چغتائی کے اسی فن کمال کا جیتا جاگتا ثبوت ہے جس سے اقبال کے اشعار کی تجسیم ممکن ہوسکی۔ چغتائی حسن کی نقش گری میں اقبال سے زیادہ اپنی ذات پر بھروسہ کرتے ہیں۔ ان کے ہاں حسن کے نمونے مکمل طور پر مشرقی ہیں۔ یہ مشرقیت اقبال کی مشرقیت کے مقابلے میں زیادہ لطافت و جمال کے عناصر رکھتی ہیں۔[۴]

اقبال پیامبرِ عمل و حرکت ہیں لیکن چغتائی فنکار کے نظر سے انہیں دیکھتے ہیں اور ان کی نظر جمال و جلال پر زیادہ رہی ہے۔ ''عملِ چغتائی'' میں جلال و جمال کے بعد زیادہ توجہ فکری عناصر کی طرف ہے اور عمل و حرکت سے رغبت کا سراغ نہ ہونے کے برابر ہے۔

مردِ مومن کے تصور کے معاملے میں اقبال کے تصورات تجریدی ہیں انہوں نے اورنگزیب عالمگیر، ٹیپو سلطان، طارق بن زیاد، صلاح الدین ایوبی، غنی کاشمیری، ہارون الرشید، بابر، ہمایوں اور جہانگیر کی شخصیات کے نمایاں، روشن اور چیدہ چیدہ عناصر جوڑ کر ایک مردکامل کی شخصیت کا خاکہ بنایا ہے۔

ابراہیمؑ و اسماعیلؑ، حسنؓ و حسینؓ، محمد رسول اللہ تو زمینی اور تاریخی کردار ہیں۔ کچھ نسوانی پیکر بھی ان کے لیے مثالی کردار کا درجہ رکھتے ہیں مثلاً حضرت فاطمہؓ، شرف النساء، زبیدہ خاتون، نور جہاں اور زیب النساء ان خاکوں اور تصویروں کے پس منظر میں اقبال کا اسلامی ذہن کارفرما ہے کیونکہ اقبال کے مثالی کردار اسلام کے سرچشمے سے پھوٹتے ہیں۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے ڈاکٹر اقبال کے ذہنی سرچشموں کا سراغ اسلام کے تناظر سے لگایا ہے۔ اِسی طرح چغتائی کے فن کا جائزہ ڈاکٹر وحید قریشی نے اس عمل میں ڈوب کر لگایا ہے۔ وہ مزاجاً ایک ماہر مصور یا ناقدِ فن معلوم ہوتے ہیں تحقیقی مزاج کے ساتھ ساتھ ان کے مزاج میں جمالیاتی احساس بھی رچا ہوا ہے ان کے فن کی داد دینے کا انداز نہایت درجہ مدلل ہے وہ دیگر فن پاروں کے ساتھ مماثلت و مخالفت کا انداز اختیار

کرتے ہیں۔ وہ چغتائی کے تصویری خاکوں میں اقبال کے تصورات کا خارجی روپ تلاش کرتے ہیں۔ مثلا اقبال کے اشعار کی تجسیم کے پیکر میں چغتائی نے اپنے داخلی احساسات کو شامل کیا ہے اور اقبال کی فضا کو اس تصویر میں جذب کر کے برنگِ دیگر پیش کیا ہے۔ اگرچہ اقبال اور چغتائی کے فکروفن میں تضاد ہے لیکن دونوں کا سرمایۂ حیات مسلمانوں کی نشاۃ الثانیہ کا دوبارہ جلوہ گر ہونا ہے۔ چغتائی کے فن پاروں میں حسن کے نمونے مکمل طور پر مشرقی ہیں اور اقبال کی یہ مشرقیت مردانہ اوصاف سے مملو ہے۔ جبکہ چغتائی کے ہاں نسائی حسن لطافت و جمال کا پیکر بن کر نمودار ہوا ہے۔ دونوں فنکاروں کا تقابل وموازنہ کرتے ہوئے ڈاکٹر وحید قریشی فرماتے ہیں کہ توازن اور پسِ منظر کے نمایاں اجزا کو تناسب سے بیان کرنا دونوں کے ہاں پایا جاتا ہے تناسب و تقابل کے علاوہ دونوں ماضی پرست ہیں اور ماضی کی عظمت کے مرثیہ خواں ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ مردِ مومن کے خدوخال دونوں کے ہاں اُبھرتے ہیں۔ ایک کا ذریعۂ اظہار رنگ ہیں تو دوسرے کا لفظ۔ دونوں کا مردِ مومن جسمانی توانائی کے علاوہ داخلی آزادی کا بھی مظہر ہے۔ یہ تو تصورفن کے حوالے سے ڈاکٹر وحید قریشی کی کتاب ''اساسیاتِ اقبال'' کا ایک موضوع یا باب تھا۔ اِس کے علاوہ ڈاکٹر صاحب نے اقبال کے ہمہ جہت فن پر ہر طرح سے نگاہ ڈالی ہے اور اس کے رنگوں اور خدوخال کو اجاگر کیا ہے مثلاً اس میں نمایاں، اہم اور طویل باب ہے اقبال کا تصورِ سیاست، اگرچہ اقبال کے ہاں سیاسی نظریات کی ایک پوری فہرست مضامین دکھائی دیتی ہے۔ لیکن ڈاکٹر وحید قریشی نے ابتدا سے تدریجاً اِس نظریئے کی بنیادوں کو اجاگر کر کے اقبال کے عظیم تصورات کی عمارت کو اٹھایا اور واضح کیا ہے۔

ڈاکٹر وحید قریشی پاکستان کے شہرہ آفاق نقاد، ادیب اور اُردو زبان و ادب کے مسلمہ اساتذہ میں شمار ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے علمی و ادبی کارنامے، تاریخ ادب، تعلیم، زبان اور عمرانیات جیسے اہم شعبوں سے متعلق ہیں۔ لیکن اقبال شناسی ایسا شعبہ ہے جس میں ڈاکٹر صاحب نے گراں بہا کام کیا ہے۔ اقبالیات کے شعبے میں ''اقبال اور پاکستانی قومیت'' اہم کتاب ہے۔ اس میں تین مضامین شامل ہیں۔

۱۔ مسندِ خلافت یا مجلسِ قانون ساز

۲۔ نظریۂ وطنیت

۳۔ پاکستان میں قومیت کی تشکیل

اگر ہم اقبال کی نظم ونثر کا جائزہ لیں تو دیکھیں گے کہ مابعد الطبیعاتی مسائل کچھ اِس طرح بار بار آئے اور عام تاثر یہی ہے کہ شاید اقبال مجرد تصورات اور اقدار کو ہی اہمیت دیتے ہیں۔ گویا ان کے فلسفیانہ افکار کا کوئی رشتہ مادی زندگی سے نہیں لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اقبال کے فلسفیانہ مسائل تجریدی پہلوؤں کے علاوہ مادی پہلو بھی رکھتے ہیں اور فکرِ اقبال کی روشنی میں ہم زندگی کے مادی مسائل کا حل دریافت کر سکتے ہیں اس کے علاوہ ڈاکٹر صاحب نے علامہ اقبال کے سیاسی افکار و کردار پر بھی بحث کی ہے اور واضح کیا کہ وہ برصغیر کی مسلم قوم کو محض ایک علاقائی اور وطنی حیثیت سے نہیں جانتے بلکہ اسے امت کے وسیع مفاہیم کی حیثیت سے دیکھتے ہیں۔

فکرِ اقبال پر ڈاکٹر وحید قریشی کی اہم ترین تصنیف ''اساسیاتِ اقبال'' ہے۔ اس میں اقبال کی فکر اور فن پر تنقیدی مقالات شامل ہیں۔ کتاب کو سات حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ہر حصے میں متعلقہ موضوع کے بارے میں مقالات شامل ہیں۔ تفصیل یہ ہے۔

ا۔ تصور سیاست

ا۔ مسندِ خلافت یا مجلسِ قانون ساز

۲۔ علامہ اقبال کا تصور حُریت

۳۔ اقبال اور نظریۂ وطنیت

۴۔ اقبال کا تصور وطنیت

۵۔ اقبال خمینی اور شریعتی

۲۔ تصورِ تعلیم

۶۔ اقبال کا تصورِ تعلیم اور عصری صورت حال (حصہ اول)

۷۔ اقبال کا تصورِ تعلیم اور عصری صورت حال (حصہ دوم)

۳۔ تصوّرِ تاریخ

۸۔ علامہ اقبال اور مطالعہ تاریخ

۴۔ تصوّرِ شعر

۹۔ اقبال کی شاعری

۱۰۔ اقبال کا اثر دوسرے شعراء پر

۵۔ تصوّرِ فن

۱۱۔ اقبال اور چغتائی

۶۔ تصوّرِ جہاد

۱۲۔ اقبال کا تصوّرِ جہاد

۱۳۔ تفہیم اقبال کے لیے فارسی زبان کی اہمیت

۷۔ متفرقات

۱۴۔ تشبیہاتِ اقبال (تعارف)

۱۵۔ خطباتِ اقبال پر ایک نظر (تبصرہ)

۱۶۔ مظلوم اقبال (تبصرہ)

۱۷۔ اقبال کی ابتدائی زندگی (تبصرہ)

۱۸۔ شُذراتِ فکرِ اقبال

اِس مجموعہ کا دیباچہ ڈاکٹر وحید عشرت کا تحریر کردہ ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مقالات کی ترتیب

اور تدوین دیباچہ نگار نے کی ہے۔ اس مجموعہ میں شامل بعض مضامین خاصے پُرانے ہیں مگر اقبالیات میں ان کی خاص اہمیت ہے اِس اعتبار سے ان کی ترتیب و تدوین اور اشاعت اُردو ادب اور شعبۂ اقبالیات میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ وضاحت ضروری ہے کہ حسبِ ذیل تین مضامین:

۱۔ مسندِ خلافت اور مجلسِ قانون ساز

۲۔ اقبال کا نظریۂ وطنیت

۳۔ پاکستان میں قومیت کی تشکیل (فکرِ اقبال کی روشنی میں)

اِن کے اولین مجموعے ''اقبال اور پاکستانی قومیت'' میں بھی شامل ہیں اور ان کا تعارف کرایا جاچکا ہے۔

اساسیاتِ اقبال میں اقبال کے نظریات پر بحث کرتے ہوئے ڈاکٹر وحید قریشی لکھتے ہیں کہ اقبال وطنیت کے مغربی تصور کے قائل تھے۔ ۱۹۱۱ء میں اقبال کا وطنیت کا تصور ملت کی طرف آیا اور یہیں سے اقبال کی فکر میں تبدیلی آئی جس نے اقبال کے آزادی کے تصور کو بھی بدل دیا۔ یہی بنیاد ان کی نئی فکر کا پیش خیمہ بنی اقبال کے ہاں حریّت سے مراد سیاسی غلامی سے رہائی ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی اقبال کے تصور حریّت کا تجزیہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اقبال نے حریت کا لفظ سب سے پہلے ''خضرِ راہ'' میں استعمال کیا۔ حریت کی اصطلاح اقبال نے ''رموزِ بے خودی'' میں بھی استعمال کی۔ اقبال حریت کے نظری اور عملی پہلوؤں پر زور دیتے ہیں۔ ڈاکٹر وحید قریشی لکھتے ہیں: ''اقبال نے حریّتِ اسلام میں تین بنیادی اوصاف یا خصائص شامل کر کے مردِ حر یا انسانِ کامل کے بنیادی اوصاف میں سے ایک وصف شمار کیا ہے۔''[۵]

اقبال عمل اور فکر دونوں کی آزادی کی بات کرتے ہیں اور اسے اپنی فلسفیانہ فکر سے منسلک کر کے مردِ قلندر اور مردِ حر کی صفات سے ہم آہنگ کرتے ہیں اور اسے معاشرے کے توازن کے لیے ناگزیر قرار دیتے ہیں۔ تقدیر کے معاملے میں بھی اقبال تصورِ حریت کے قائل ہیں اور کہتے ہیں کہ انسان محض مجبور نہیں۔ ڈاکٹر وحید قریشی کے خیال میں حصولِ پاکستان میں جہاں دوسرے عوامل نے ہمیں آزادی دلائی وہاں اقبال کے کلام میں تصورِ حریت نے بھی ہمارے لیے راہیں ہموار کیں۔

ڈاکٹر وحید قریشی نے علامتی اندازِ بیان اپناتے ہوئے اقبال، خمینی اور شریعتی کو ایک سوچ کے تین رُخ

قرار دیا ہے۔ اِن تینوں کے فکر و نظر میں وحدت تھی۔ اقبال جس انقلاب کی راہ دیکھ رہے تھے اس کی ایک جھلک ہمیں امام خمینی کے ہاں نظر آتی ہے۔ ایران پر امریکی تسلط کے خلاف مسلمانوں میں فکری نظم و ضبط کی ضرورت تھی۔ اقبال کے تصورات نے عالم اسلام میں انقلاب کی جھلک دیکھی اس کی تکمیل اور حقیقی روپ ہمیں ایران میں امام خمینی کے ہاں نظر آتا ہے۔ اقبال فرقہ پرستی کے مخالف ہیں۔ ڈاکٹر وحید قریشی کے خیال میں ''اسلامی انقلاب ایران'' جس طرح خمینی کے خواب کی تعبیر ہے۔ اِس طرح پاکستان کا قیام قائد اعظم اور اقبال کے خوابوں کی تعبیر ہے اس لیے دونوں ممالک کے حالات کا مطالعہ لازمی ہے۔

فارسی کاوشِ شعری کے وسیلے سے ہم اپنی روایات کو دوبارہ حاصل کر سکتے ہیں۔ شریعتی اقبال کے فکر و نظر سے روشنی حاصل کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں اسلام روشن ضمیری پر مبنی دین ہے۔ عالم اسلام کے لیے باہم اعتماد کی ضرورت ہے۔

''اساسیاتِ اقبال'' میں اقبال کے تصورِ تعلیم کو دو حصوں میں پیش کیا گیا ہے۔ پہلے حصے میں بنیادی فلسفیانہ مسائل اور تعلیمی تصورات کے باہمی رشتوں پر گفتگو کی گئی ہے۔ دوسرے حصے میں اقبال کے تعلیمی نظام کی اطلاقی صورتوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اقبال مشرقی و مغربی علوم کے سرمائے سے متوازن راہ نکال کر مستفید ہونے کی تلقین کرتے ہیں اور قدیم و جدید میں مطابقت کو ضروری خیال کرتے ہیں۔ وہ مغربی تعلیم کی خامیوں سے بھی آگاہ کرتے ہیں اور مسلمانوں نوجوانوں کو اس ابتلا سے محفوظ رکھنے کے لیے قدیم سرمایۂ علم کی توسیع کا احساس بھی کرتے ہیں۔

ڈاکٹر وحید قریشی نے اس مقالے میں اقبال کی نظم و نثر دونوں کو سامنے رکھ کر اقبال کے تصورِ تعلیم کا جائزہ لینے کی کوشش کی ہے۔ پہلے ان کتابوں کا جائزہ لیا ہے جو اقبال کے نظامِ تعلیم پر لکھی گئیں۔ اقبال کے نظریۂ تعلیم پر پہلی کتاب "Iqbal's Educational Philosophy" خواجہ غلام السیدین کی ہے۔ دوسری کتاب محمد احمد صدیقی کی ''اقبال کے تعلیمی نظریات'' ہے۔ اِس کتاب میں کچھ گوشواروں اور جدولوں کی مدد سے فرد کی تعلیم اور اس کے ماحول کے رشتوں کو واضح کیا گیا ہے۔ اقبال اور تعلیم کے عنوان سے جامعہ کالج ملیر کراچی میں ایک سیمینار ہوا جس میں اقبال کے تعلیمی تصورات کے مختلف گوشوں کو پیش کیا گیا۔ اقبال کے تصورِ تعلیم کے حوالے سے مختار حسین صدیقی کی کتاب ''اقبال بحیثیت مفکرِ تعلیم'' ہے۔ محمد احمد خان کی تصنیف ''اقبال

اور مسئلہ تعلیم" خاص اہمیت کی حامل ہے۔ یہاں محمد طفیل نے "Iqbal's Philosophy and Education" کے حوالے سے تحقیقی مقالہ قلم بند کیا۔ اِن کتب کے حوالے سے ڈاکٹر وحید قریشی اقبال کے تصورِ تعلیم کے مختلف فکری نکات متعین کرتے ہیں۔ ان میں توحید، زمان و مکاں، انسانِ کامل اور وحدتِ فکر کے عناصر اہمیت کے حامل ہیں۔ حرکت و عمل کو اقبال کے تصورات میں مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ لیکن تربیتِ نفس اِن تمام عناصر کا مقصد و منتہٰی ہے۔ تعلیم کا مقصد مردِ کامل کی سیرت کی تشکیل ہے۔ اقبال ہمیں فرد اور معاشرے کی وحدت کا تصور دیتے ہیں۔ اقبال کے تصورِ تعلیم میں تصورِ اسلام کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ مسلم سوسائٹی کا پورا نقشہ اسلام ہی کی تعلیمات پر مبنی ہے۔ اقبال مذہبی تعلیم کو نظامِ تعلیم میں مرکزی حیثیت دیتے ہیں۔

اقبال کے تصورِ تعلیم میں چار امور اہم ہیں جن کا تذکرہ ڈاکٹر وحید قریشی نے اساسیاتِ اقبال میں کیا ہے۔

۱۔ نصاب سازی کا طریق کار اور متعلقہ مسائل

۲۔ تعلیم نسواں اور دیگر امور

۳۔ قدیم و جدید علوم عقل و عشق اور سائنس و مذہب

۴۔ ذریعۂ تعلیم کا مسئلہ

اقبال سماجی علوم کے حوالے سے تاریخ کو بہت اہمیت دیتے ہیں اسی سے مسلمانوں کی ملی شناخت متعین ہوتی ہے۔ اسی طرح بچوں کی تعلیم کے ساتھ اخلاقی تربیت اقبال کی پہلی ترجیح ہے۔ اقبال نے عصرِ حاضر میں سائنس کو بڑی اہمیت دی۔ اِن کے نزدیک ہمیں اپنی ضرورتوں کی منصوبہ بندی کر کے سائنس کے شعبے کو خاص ترویج و ترقی دینا ہوگا۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے خواتین کی تعلیم کے حوالے سے اقبال کے خیالات کی وضاحت بھی کی ہے۔ اقبال کے نزدیک ایک خاتون کی تعلیم پورے معاشرے کی تعلیم ہے کیونکہ عورت کا اولین فریضہ اولاد کی تربیت ہے۔ ذریعۂ تعلیم کے ضمن میں اقبال نے اُردو کو ذریعہ بنانے کی دعوت دی کیونکہ یہ زبان رابطے کا سب سے بڑا ذریعہ تھی اور اقبال کے خیال میں تعلیم کا مسئلہ لسانی مسئلے کے بغیر حل نہیں ہوسکتا۔

تاریخ کے بارے میں اقبال کا نقطۂ نظر منفرد ہے۔ وہ اسے ارتقاء کا ایک طویل سفر قرار دیتے ہیں اور تاریخ کے مسئلے کو قرآنی تعلیمات کے تناظر میں دیکھتے ہیں۔ وہ واقعات و حالات کو تاریخی تسلسل کا اعادہ نہیں

کہتے بلکہ ترمیم و اضافے کا نام بھی دیتے ہیں۔ اقبال کے نزدیک متواتر حرکت اور جدوجہد کا نام ہے وگرنہ زندگی موت سے تعبیر کی جائے۔ اقبال تاریخ کو محض بادشاہوں کے حالات یا واقعات کا روزنامچہ قرار نہیں دیتے بلکہ وہ اسے عمرانی مسائل، اقتصادی عوامل، اخلاقی اقدار اور فنونِ لطیفہ بھی کو تاریخی مطالعے کا حصہ گردانتے ہیں۔ یہ ایک فکری و روحانی تسلسل ہے جو انسان میں اعتماد اور ایقان کے اوصاف بھی پیدا کرتا ہے۔ اسی طرح تاریخِ اسلام کے ساتھ ساتھ اقبال دیگر اقوام بالخصوص یورپ کی تاریخ کی مطالعے کو بھی ضروری قرار دیتے ہیں کیونکہ تحریکوں اور افراد کی تاریخ کا مطالعہ دراصل ایک معاشرے کے بُنیادی اصولوں کی اساس کو متعین کرتا ہے۔

اقبال کی شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر وحید قریشی ''شعرِ اقبال'' کو تین ادوار میں تقسیم کرتے ہیں۔ یہ تصوراتِ اقبال کا ارتقائی سفر ہے۔ فکر و نظر اور اسلوب کی ناہمواریوں سے لے کر زبان و بیان میں پختگی تک اقبال کے نئے نئے تجربات کا تذکرہ ہے اور زبان و بیاں کے نئے منصوبوں کا ذکر کیا ہے۔ شعرِ اقبال کا پہلا دور روایت کے احساس سے مملو ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے اقبال کی شاعری میں رومی، غالب اور حافظ کا رنگ بھی تلاش کیا ہے جبکہ ''بالِ جبریل''، ''پیامِ مشرق'' اور ''زبورِ عجم'' میں پائیدار خیالات کے اظہار کو تحسین کی نظر سے دیکھا ہے۔ اقبال کی شاعری فکر کی ان تمام حدوں کو عبور کرتی ہے جو انسانی تجربات اور قلبِ انسانی پر اثر انداز ہوتی ہے جبکہ تیسرے دور کی شاعری میں سرشاری اور سرخوشی کی جگہ کہولت نے لے لی ہے لیکن فکر اور زبان و بیاں کے اعتبار سے اقبال کے ہاں اُردو شاعری کے ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ اِن تمام تخلیقات میں اقبال کا اسلوب اندازِ فکر کی کئی منزلوں سے گزرا ہے۔ حالؔی اور آزؔاد کے بعد اقبالؔ نے نئی اُردو شاعری کے خلا کو پُر کیا۔ اقبال کی شاعری میں ان شعرا کا رنگ بھی نظر آتا ہے جو کلاسیکی اور عبوری دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن انگریزی ادب کے اثرات میں بھی بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ ڈاکٹر وحید قریشی فرماتے ہیں: ''انگریزی کے رومانی دور کے شاعروں کے ساتھ ساتھ مابعد الطبقاتی دور کے شعراء سے بھی اقبال کو لگاؤ تھا۔''[۲]

''بالِ جبریل'' تک پہنچتے پہنچتے اقبال، حافظ، نظیری، ظہوری، بیدل، غنی کاشمیری اور غالب کے رنگِ سخن سے بھی اپنے گلشن کی آبیاری کرتے نظر آتے ہیں۔ بھاٹی دروازے کے اندر ہونے والے ابتدائی مشاعروں میں اقبال کے اثرات واضح طور پر محسوس کیے جاسکتے ہیں۔ بیسویں صدی کے ربع ثانی کی اردو شاعری کا اگر تجزیہ کیا جائے تو اس میں رنگِ اقبال اور رنگِ اختر شیرانی کے علاوہ کوئی نئی آواز مشکل سے ملے گی۔

ڈاکٹر وحید قریشی نے اقبال کے چند ایسے معاصرین کا تذکرہ بھی کیا ہے جو اقبال کے رنگ میں اشعار کہتے رہے پہلے دور میں پہلا نام ناظر حسین ناظم لکھنوی کا ہے۔ وہ لاہور کی ادبی محفلوں میں رنگِ اقبال میں کلام سناتے غلام بھیک نیرنگ کا نام بھی حلقۂ احباب بھی شامل ہے۔ اقبال کے ساتھ ان کے مراسم دوستانہ تھے۔ کلام کی پختگی کے ساتھ ساتھ ''بانگِ درا'' کا رنگ ان پر غالب آتا گیا۔ خان احمد حسین احمد بھی اقبال کے حلقۂ احباب بھی شامل تھے۔ درگا سہائے سرور اقبال کے حلقۂ معاصرین میں شامل تھے۔ کلامِ اقبال اور کلامِ چکبست میں بھی نمایاں مماثلت دکھائی دیتی ہے۔ ملک منظور حسین منظور نے بھی ''اسرارِ خودی'' کے اسلوب کی پیروی کی ہے۔

کلامِ اقبال کا تیسرا دور جو بیشتر شعراء کی توجہ کا مرکز رہا ہے۔ بالِ جبریل کا دور ہے جو اقبال کی شاعری کی معراج ہے۔ اکثر شعراء نے ''بالِ جبریل'' کے رنگ کو اپنانے کی کوشش کی لیکن صرف چند شعراء کامیابی حاصل کر سکے۔ مثلاً شاکر صدیقی، ماہر القادری، آغا صادق، ڈاکٹر عباس علی خان لمعہ، ملک منظور حسین منظور، امین حزیںؔ وغیرہ۔

امین حزیںؔ کو اپنے اسلوب کی بناء پر اقبال کا معنوی شاگرد بھی کہا گیا ہے۔

زیب عثمانیہ اقبال کی ''بالِ جبریل'' کا تتبع کرنے والوں میں شامل ہیں۔ وہ خاتون شعراء میں ممتاز درجہ رکھتی ہیں۔ ڈاکٹر وحید قریشی فرماتے ہیں: ''کلامِ اقبال کے باطنی حسن کو جس طرح زیب نے اپنی شاعری کی جان بنایا اس کی مثال دوسرے شعراء کے ہاں مشکل سے ملے گی۔''[۷]

اساسیاتِ اقبال میں اقبال کے تصور جہاد پر ڈاکٹر وحید قریشی نے مفصل روشنی ڈالی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے خیال میں اقبال کے تصور جہاد کو سمجھنے کے لیے ہمیں تاریخِ اسلام کا جائزہ لینا ہوگا۔ خلافت کیونکر ملوکیت میں تبدیل ہوئی اور مسلمانوں میں غیر اسلامی خیالات و افکار کو جگہ ملی اقبال کے نزدیک یقین محکم، عمل پیہم اور انسانی دُنیا سے محبت کا نام جہاد ہے۔ اقبال نے عمل کے لیے نمونہ کامل نبی پاکؐ کی ذات گرامی کو پیش کیا۔ جہاد کے حوالے سے اقبال پر قوت پرستی کا الزام بھی لگایا گیا۔ ڈاکٹر وحید قریشی لکھتے ہیں کہ اقبال ایسی طاقت کا تصور دیتے ہیں جو اعلیٰ مقاصد کے تابع ہو۔ ڈاکٹر صاحب کے خیال میں اقبال نے تصوّرِ جہاد کی وضاحت کے لیے

فارسی کلام سے مدد لی ہے کیونکہ اقبال ہر مسئلے کو ایک وسیع ملی تناظر میں دیکھتے ہیں۔ اقبال کے نزدیک عقل سے لڑنا بھی جہاد ہے۔ عقل جو گم کردہ راہ ہے جو منزل تو نہیں البتہ نشانِ منزل ضرور ہے۔ اقبال کے تصورِ جہاد نے کئی جہتیں اور سمتیں کھولی ہیں جن کا سمجھنا کلامِ اقبال کے عمق اور وسعت تک رسائی کے لیے ضروری ہے۔

ڈاکٹر وحید قریشی کے خیال میں اقبال نے ملتِ اسلامیہ کی زیادہ فعال طاقت فارسی سے مدد لے کر تصور جہاد کو واضح کیا ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے اقبال کی فارسی شاعری کے حوالے سے اپنا مضمون ''تفہیم اقبال کے لیے فارسی کی اہمیت'' لکھا جس میں مختلف ادوار کے ذریعے یہ ثابت کیا گیا کہ عربی زبان کی اہمیت مذہبی ہے جبکہ فارسی ثقافتی زبان ہے۔ اقبال نے بھی اپنے خیالات کے اظہار کے لیے موزوں طرزِ اظہار اور وسیلہ فارسی ہی کو بنایا کیونکہ یہ زبان ہماری تہذیبی اور تمدنی پہچان تھی لیکن اقبال کے فارسی کلام کی آفاقیت کا پورا شعور حاصل نہ کر سکنے کی بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ عوام فارسی زبان سے نابلد ہیں۔ فکرِ اقبال کی بصیرت کو سمجھنے کے لیے فارسی کلامِ اقبال تک رسائی ضروری ہے اور اس رسائی کی خاطر فارسی سے شناسائی ناگزیر ہے۔

اساسیاتِ اقبال میں ڈاکٹر وحید قریشی نے علامہ اقبال کی شخصیت اور فکر وفن پر لکھی جانے والی کتب کو بھی جائزے میں شامل کیا ہے مثلاً پروفیسر نذیر احمد کی کتاب ''تشبیہاتِ اقبال'' جو نیشنل کمیٹی برائے صد سالہ تقریبات ولادت علامہ محمد اقبال کے موقع پر اقبال اکادمی نے شائع کی تھی۔ اس کا تعارف ڈاکٹر وحید قریشی نے لکھا۔ ڈاکٹر صاحب کے خیال میں تقلیدِ مغرب سے گریز پائی اشد ضروری ہے۔ ہمارے ادب کی نشوونما اور خیالات کی تعمیر و تشکیل قدیم ادبی اقدار کے حوالے سے ہونا ضروری ہے۔ چوہدری نذیر احمد عربی و فارسی کی شمعیں ہاتھوں میں جلائے اُردو زبان و ادب کا سفر طے کرتے نظر آتے ہیں۔ انہوں نے تشبیہاتِ اقبال میں اقبال کے افکار کو بڑے التزام کے ساتھ تشبیہات کے آئینے میں اجاگر کیا ہے اقبال کی اہم تشبیہات کے فکری اور حسین رشتوں کو تفصیل کے ساتھ پیش کیا ہے۔

ڈاکٹر وحید قریشی نے ''اساسیاتِ اقبال'' میں متفرقات کے زمرے میں کچھ تبصرے بھی شامل کیے ہیں جن میں سے ایک تبصرہ ''خطباتِ اقبال پر ایک نظر'' ہے۔ یہ تحریر محمد شریف بقا کی تصنیف پر لکھا ایک تبصرہ ہے۔ فکرِ اقبال کو سمجھنے کے لیے جہاں کلامِ اقبال کو سمجھنا ضروری ہے۔ وہاں ان سات لیکچرز کو سمجھنا بھی ضروری ہے۔ ان مقالات کا مقصد اسلامی افکار ونظریات کی تشکیل جدید ہے اور تعلیم یافتہ طبقے کو جدید اصطلاحات کے حوالے

سے اسلامی فکر ونظر کا درس دینا بھی ان خطبات کا اولین مقصد تھا۔ اگرچہ ان خطبات پر اور لوگوں نے بھی کام کیا۔ مثلاً خلیفہ عبدالحکیم کی فکر اقبال، سید نذیر نیازی کی تشکیل جدید الٰہیاتِ اسلامی، پروفیسر عثمان کی تصنیف وغیرہ لیکن بقا صاحب کا انداز بڑا مدلل اور استدلالی ہے۔

ڈاکٹر وحید قریشی کا ایک تبصرہ شیخ اعجاز احمد کی کتاب ''مظلوم اقبال'' پر بھی ہے۔ اقبال کے بھتیجے اعجاز احمد نے خاندانی معلومات کی بناء پر مظلوم اقبال تحریر کی لیکن یہ اتنی مربوط کتاب نہیں۔ خاندان کی بزرگ خواتین کی اعانت سے شجرہ تیار کیا گیا ہے۔ جو خاصا اہم ہے۔ ڈاکٹر سید سلطان محمود کی کتاب ''اقبال کی ابتدائی زندگی'' پر ڈاکٹر وحید قریشی نے تبصرہ کیا ہے کہ معلومات میں تضاد پایا جاتا ہے۔ سال ولادت میں دو جگہوں پر اختلافی بیانات ہے۔

بہرحال ڈاکٹر وحید قریشی کے خیال میں یہ کتاب قابلِ قدر اس لیے ہے کہ اقبالیات کی شاہراہ پر اہم سنگِ میل اور اضافہ ہے۔ اقبال کے Stray Reflections جنہیں شذراتِ فکرِ اقبال کا نام دیا گیا ہے۔ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی کی ترجمہ کردہ ہے۔ یہ اقبال کی ڈائری ہے۔ یورپ کے فلاسفروں، شاعروں کے مختصر حالات اور بعد میں آنے والے شعراء کے کلام کے ان حصوں کو اجاگر کیا گیا ہے جن پر اقبال نے اپنی رائے دی یا سراہا۔ یہاں اقبال ایک نقاد اور ادیب دکھائی دیتے ہیں۔

اساسیاتِ اقبال، میں ڈاکٹر وحید قریشی نے اپنی علمیت اور اُسلوب کی روانی کی بدولت تفہیم اقبال کی نئی راہیں کھولی ہیں۔ ان کے ہاں سادگی اور ایجاز واختصار کی خصوصیات ملتی ہیں۔ اقبال کے فکری سفر کا مطالعہ ڈاکٹر وحید قریشی نے بڑی دیدہ ریزی سے کیا ہے اور ان کے فن کو جانچتے ہوئے کسی طرح کے تعصب یا بے جا لگاؤ کا شکار نہیں ہوئے۔ یہی تحقیق کی غایت اور معراج ہے۔

علامہ اقبال پر ڈاکٹر وحید قریشی نے متفرق انداز میں قلم اٹھایا ہے باقاعدہ تصانیف کے علاوہ مختلف رسائل اور ادبی مجلے بھی ڈاکٹر وحید قریشی کی اقبال شناسی کے شاہد ہیں۔

اقبال ریویو ایک علمی اور تحقیقی وتنقیدی سہ ماہی مجلہ ہے۔ ایک سال میں اس کے چار شمارے شائع ہوتے ہیں۔ دو شمارے جنوری اور جولائی میں اور دو شمارے اپریل اور اکتوبر میں۔ انگریزی زبان میں

شائع ہوتے ہیں۔ اقبال ریویو ۱۹۵۱ء میں شائع ہونا شروع ہوا۔ ڈاکٹر محمد رفیع الدین اس کے مدیر اور نگران تھے۔ یہ رسالہ پانچ زبانوں میں شائع ہوتا ہے اُردو، انگریزی، عربی، فارسی اور تُرکی۔ عربی زبان میں ۱۹۹۳ء تا ۱۹۹۴ء کا ایک شمارہ شائع ہوا، اِس کے مدیر ڈاکٹر وحید قریشی اور ڈاکٹر ظہور احمد اظہر تھے۔ ''اقبال ریویو'' ایک بلند پایہ علمی مجلّہ ہے یہ خالصتاً علمی اور فلسفیانہ مزاج کا رسالہ ہے۔ اس سے اقبال کی دلچسپی کے تمام مضامین اور شعبہ جات کا تنقیدی جائزہ شائع ہوتا ہے۔ کلامِ اقبال کے تراجم بھی اس میں چھپتے ہیں۔

ڈاکٹر وحید قریشی اس کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

> اقبال اکادمی کی مجلسِ منتظم نے حال ہی میں فیصلہ کیا ہے کہ اقبال ریویو کے انگریزی اور اُردو شماروں کا ایک ایک جلد میں انتخاب شائع کیا جائے۔ راقم الحروف کے سپرد یہ کام کیا گیا۔ اُردو حصے کی جلد پیشِ خدمت ہے۔ اِس میں جولائی ۱۹۶۰ء سے لے کر جنوری ۱۹۸۳ء تک کے شماروں کا انتخاب شامل ہے۔[۸]

ڈاکٹر وحید قریشی نے ''اقبال ریویو'' میں شائع ہونے والے مختلف مضامین کو کتاب کی شکل میں مرتب کیا اور اس کا نام ''منتخب مقالاتِ اقبال ریویو'' رکھا۔ یہ کتاب اقبال اکادمی پاکستان سے ۱۹۸۳ء میں شائع ہوئی۔ اس میں حسبِ ذیل مضامین شامل ہیں۔

	عرضِ مرتب	[دیباچہ]	صفحات

(۱)

۱۔	فلسفۂ وجودیت اور اقبال	سمیع اللہ قریشی	۲۲ تا ۲۳
۲۔	اقبال اور تصوف	غلام مصطفیٰ خان	۲۳ تا ۳۲
۳۔	اقبال اور تصوف چند تنقیحات	منظور احمد	۳۳ تا ۴۶
۴۔	سیّد علی ہمدانی اور اقبال۔ قسط اول	بشیر احمد ڈار	۴۷ تا ۵۸

	سیّدعلی ہمدانی اور اقبال۔ قسط دوم	بشیر احمد ڈار	۵۹ تا ۹۰
۵۔	غالب اور اقبال	سخاوت مرزا (مترجم)	۹۱ تا ۱۲۴
۶۔	اقبال کا تصور زمان و مکاں	برہان احمد فاروقی	۱۲۵ تا ۱۳۴
۷۔	اسپنگلر، اقبال اور مسئلہ تقدیر	عبدالحمید کمالی	۱۳۵ تا ۱۵۸

(۲)

۸۔	فکرِ اقبال کے تہذیبی رویے	جیلانی کامران	۱۶۱ تا ۱۶۹
۹۔	اقبال اور اسپنگلر	وزیر آغا	۱۷۱ تا ۱۸۰
۱۰۔	اقبال کا محاصلی اور مالیاتی نظریہ	محمد عبداللہ المسدوسی	۱۸۷ تا ۲۰۱
۱۱۔	اقبال کا مدرسہ تعلیم	سیّد عبداللہ	۲۰۳ تا ۲۱۶

(۳)

۱۲۔	اقبال اور مسئلہ خلافت	معین الدین عقیل	۲۱۹ تا ۲۳۴
۱۳۔	تیسری گول میز کانفرنس اور اقبال	رحیم بخش شاہین	۲۳۵ تا ۲۷۵
۱۴۔	جناح، اقبال اور تصورِ پاکستان	عبدالحمید کمالی	۲۷۷ تا ۳۲۰

(۴)

۱۵۔	کلامِ اقبال پر عربی ادب کے اثرات	محمد منور	۳۲۳ تا ۳۳۴
۱۶۔	مسجد قرطبہ کا مرکزی خیال تاریخ کی روشنی میں	سید محمد یوسف	۳۳۵ تا ۳۴۴

(۵)

۱۷۔	ارمغانِ حجاز کی ایک رباعی	غلام رسول مہر	۳۴۷ تا ۳۵۰
۱۸۔	مولوی محبوب عالم اور اقبال	محمد عبداللہ قریشی	۳۵۱ تا ۳۶۴

(۶)

۱۹۔	اقبال کی زندگی کا ایک گمشدہ ورق	صالح الکبریٰ	۳۶۷ تا ۳۸۰
۲۰۔	اقبال کی زندگی کے چند گوشے	محمد شفیع کنبوہ	۳۸۱ تا ۳۸۶
۲۱۔	حیاتِ اقبال کا ایک گوشۂ پنہاں	محمد حسین عرشی	۳۹۵ تا ۴۰۶
۲۲۔	اقبال کے بعض ملفوظات	یوسف سلیم چشتی	۴۰۷ تا ۴۳۴
۲۳۔	اقبال کی زندگی کے چند گوشے	غلام محی الدین اجمیری	۴۳۵ تا ۴۴۶
۲۴۔	میری ذاتی ڈائری	خواجہ عبدالوحید	۴۴۷ تا ۴۶۸
۲۵۔	اقبال کی بعض یادیں	محمد شفیع (م۔ش)	۴۶۹ تا ۴۷۵

(۷)

۲۶۔	تحریکِ شبان المسلمین	خواجہ عبدلوحید	۴۷۹ تا ۴۸۷
۲۷۔	مجلسِ کشمیری مسلمانانِ لاہور اور اقبال	افضل حق قریشی	۴۸۹ تا ۴۹۷
۲۸۔	اخبار ''ایمان'' میں اقبال کا ذکر	منظور الحق صدیقی	۴۹۹ تا ۵۰۱
۲۹۔	اقبال کی صحبت میں ذکر غالب	عبداللہ چغتائی	۵۰۳ تا ۵۰۹
۳۰۔	اقبال کے خطوط جناح کے نام اشاعت کی کہانی	محمد جہانگیر عالم	۵۱۱ تا ۵۱۸

اِس فہرست سے اقبالیات کے موضوع پر لکھے جانے والے مقالات کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے۔ مقالہ نگار نامور نقاد اور محقق ہیں۔ اقبال شناسی کے نئے راستوں کا تعین اقبال ریویو کے منتخب مقالات دیکھ کر ہوتا ہے۔ بہرحال ایک عمدہ انتخاب ہے۔

اقبال ریویو کے نہ صرف اُردو مقالات کو ڈاکٹر وحید قریشی نے کتابی شکل عطا کی بلکہ انگریزی ''اقبال ریویو'' کے مقالات کو بھی شائع کرایا اور اس کا نام "Selection from the Iqbal Review" رکھا۔ یہ کتاب اقبال اکادمی پاکستان لاہور سے اپریل ۱۹۸۳ء میں شائع ہوئی۔ ابتدا میں ڈاکٹر وحید قریشی نے پیش لفظ لکھا۔ کتاب میں شامل مقالات کو سات حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اِس انتخاب میں اقبال کے فکر وفن اور فلسفہ وشاعری کے مختلف پہلوؤں کے حوالے سے اہم مقالات شامل کیے گئے ہیں۔

غیرملکی قارئین کے لیے یہ مقالات نہایت اہمیت کے حامل ہیں۔

(1)

1-	Iqbal's Concept of evolution	Dr. Mohd Rafi-ud-Din	1-23
2-	Iqbal's Concept of Eternity	Naeem Ahmad	25-42
3-	Iqbal's Theory of Knowledge	Jamila Khatoon	43-56
4-	The Hegelian Key to Understanding Iqbal	Absar Ahmad	57-67
5-	Metaphysics of Persia and Iqbal	Manzoor Ahmad	69-85
6-	Conceptual Model of the Asrar-o-Rumuz and Iqbal's Monadology	A. H. Kamli	87-100
7-	Dynamic Conception of the West and the Philosopy of Self.	Mohd. Taqi	101-106

(2)

8-	Iqbal's Lecture on Ijtihad	Khalid Mehmood	109-117
9-	Iqbal's Contribution Libouratizm in Modern Islam	Dr. Javed Iqbal	119-122
10-	A study of Iqbal's views on Lima	Dr. S. M. Yousaf	123-131
11-	Iqbal's Theory of Muslim Community and Islamic Universalism.	Dr. Manzoor Ahmad	
12-	Iqbal and Reconstruction if Islamic Law.	Khurshid Ahmad	155-182
13-	Iqbal-A view of Politico Culture Perspective	Jilani Kamrani	183-188
14-	Islamic Universalism and Territorial Nationalism in Iqbal's Theory	S. Qudrat Ullah Fatimi	189-214
15-	Iqbal on Democracy	Mohd. Manof	215-224
16-	Economic Philosopy of Iqbal	Dr. Amjad Saeed	225-235

(3)

17-	Mohd. Iqbal-Introduction to the secret of the self	N. I. Pregorina	239-255

18-	Iqbal's Pantheism	Robert Vitmoor	257-271
19-	Iqbal A reformer of Islamic Philosopy	R. Henry	273-279
20	Iqbal as a Poet and Philosopher	Edward Mechkarthi	280-285
21-	Satan in Iqbla's Philosophical and Political works	A. Bosani	286-336
22-	Problem of Ethics in Mohammad Iqbal's Philosophy	M.T. Stepen Tants	337-344
23-	Iqbal As a Seer	Mumtaz Hassan	345-364
24-	The Key pain in Iqbal's Educational Philosophy	Muzaffar Hussain	365-372

(4)

25-	Iqbal on the Nature of Time	Prof. M. M. Sharif	375-380
26-	Iqbal On Quranic Concept of History	M. Munawar	381-400
27-	Iqbal Philosophy of History	M. Usman Ramz	401-441
28-	Iqbal's Emphasis on the Study of History	Riaz-ur-Rehman	443-450
29-	Iqbal's Tulip of Sinai	Riaz ur Hassan	453-458

30-	The Nature of Dante's reflunce on Iqbal	S. M. Abdullah	459-465
31-	The Preudo Dramatic Poems of Iqbal	C. M. Naeem	467-478

(6)

32-	Recent Advantes in Science and Iqbal's Concept of life and death	K. A. Rasheed	481-497
33-	Iqbal and Outer Space	Shakar Niazi	499-518
34-	Iqbal in the Witness Box	M. Abdullah Qureshi	521-530
35-	Iqbal at a College reception in Lahore	Q. M. Aslam	531-541

عنوانات کو دیکھ کر اندازہ ہو جاتا ہے کہ اِس انتخاب میں اقبال کی فکر، فن، فلسفے اور شاعری کے مختلف پہلوؤں کے حوالے سے اہم مقالات شامل کیے گئے ہیں۔

ڈاکٹر وحید قریشی نے اقبالیات کے ہر گوشے پر خامہ فرسائی کی اور کوئی پہلو تشنہ نہ چھوڑا حتیٰ کہ ڈاکٹر علامہ محمد اقبال کا سالِ ولادت جو ہر دور میں متنازعہ مسئلہ بن کر سامنے آیا پر بھی انتہائی مدلل انداز میں ایک کتاب تالیف کی جس کا نام ''علامہ اقبال کی تاریخِ ولادت'' ہے۔ اس کے مضامین کی فہرست پر نظر ڈالنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اقبال کی تاریخِ ولادت پر لکھے جانے والے معروف لوگوں کے مقالات اس میں شامل ہیں۔ اِس کتاب کا مقدمہ زاہد منیر عامر صاحب نے لکھا ہے جو اس کتاب کو مرتب کرنے میں ڈاکٹر وحید قریشی کے ساتھ ساتھ رہے۔

علامہ اقبال ایک بین الاقوامی مفکر اور شاعرِ عالم اسلام تو ہیں ہی لیکن اس کے ساتھ ساتھ اگر قومی و ملی حیثیت سے دیکھا جائے تو ہمارے لیے اقبال کی ہستی پاکستان کا نظریہ پیش کرنے والے کی سی ہے۔ سوانح اقبال

کی ابتداء تاریخِ ولادت سے ہوتی ہے لیکن اقبال کی جتنی بھی سوانح عمریاں لکھی گئیں ان میں اقبال کی تاریخِ ولادت کے بارے میں شدید اختلافات پائے جاتے ہیں مثلاً منشی محمد الدین فوق نے علامہ کی تاریخِ ولادت ۱۸۷۵ء بتائی۔

لیکن نواب ذوالفقار علی خان نے ۱۹۳۲ء میں شائع ہونے والی اپنی کتاب "A Voice from the East" میں علامہ کا سالِ ولادت ۱۸۷۶ء بتایا۔ انڈین انسائیکلوپیڈیا مرتبہ (پی۔ ڈی چندرا) میں علامہ کا سال ولادت ۱۸۷۷ء بتایا گیا حتیٰ کہ علامہ کے پی ایچ ڈی کے مقالے اور پاسپورٹ پر بھی ۱۹۷۶ء درج کیا۔ ان اختلافی سنین کا مسئلہ ۱۸۷۰ء سے ۱۸۸۰ء تک پھیلا ہوا ہے۔''اقبال کا تاریخِ ولادت'' کے آخر میں ڈاکٹر وحید قریشی کا مضمون بھی شائع ہوا جو صفحہ ۲۶۷ پر ہے اس میں تحقیقی انداز سے علامہ اقبال کی تاریخِ ولادت کا جائزہ لیا گیا ہے اور اہم معلومات بہم پہنچائی گئی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں:

> ''میں اپنے مقالے کے سلسلے میں یہ وضاحت ضروری سمجھتا ہوں کہ میں نے علامہ اقبال کی تاریخِ ولادت کے بارے میں جملہ قرائن کو سامنے رکھنے کے بعد اپنے مضمون میں لکھا تھا کہ مجھے ۱۸۷۳ء کی تاریخ کے حق میں قرائن زیادہ وقیع نظر آتے ہیں۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ میرے اس قرینے کو حتمی قرار دے کر عموماً یہ سمجھا گیا ہے کہ میں نے ۱۸۷۳ء کو یقینی تاریخ قرار دیا ہے۔[۹]

اقبال کی تاریخ ولادت کے بارے میں تمام خفیہ گوشے اس کتاب میں یکجا کر دیے گئے اور اقبال کی تاریخِ ولادت کو دلائل و براہین کے ساتھ واضح کیا گیا ہے اس کتاب میں شامل مضامین کی مکمل فہرست مندرجہ ذیل ہے:

فہرس

۱۔	مقدمہ	زاہد منیر عامر	9
۲۔	تاریخِ پیدائش۔ ایک بڑی غلط فہمی کا ازالہ	فقیر سید وحید الدین	۲۱
۳۔	ایک غلط فہمی اور غلط فہمی کا ازالہ	خالد نذیر صوفی	۳۳

۴۔	علامہ اقبال کی تاریخِ ولادت	مرغوب صدیقی	۴۳
۵۔	شاعرِ مشرق علامہ اقبال اور ان کا سالِ ولادت	عبدالقوی دسنوی	۴۹
۶۔	علامہ اقبال کی صحیح تاریخ پیدائش	نظیر صوفی	۵۹
۷۔	علامہ اقبال کی تاریخ پیدائش چند نئے زاویے	ڈاکٹر سعید اختر درانی	۸۳
۸۔	علامہ اقبال کی تاریخِ ولادت	ڈاکٹر وحید قریشی	۹۳
۹۔	علامہ اقبال کی صحیح تاریخ پیدائش	اکبر حیدر کاشمیری	۱۲۹
۱۰۔	کچھ علامہ اقبال کی ولادت اور حالات کے بارے میں	کلب علی خان فائق	۱۴۱
۱۱۔	تاریخِ ولادت کا مسئلہ	ڈاکٹر جاوید اقبال	۱۴۹
۱۲۔	اقبال کی تاریخِ ولادت	مالکِ رام	۱۸۷
۱۳۔	مفکر پاکستان کی تاریخِ ولادت	محمد حنیف شاہد	۲۲۱
۱۴۔	علامہ اقبال کی تاریخِ پیدائش	شیخ اعجاز احمد	۲۳۷
۱۵۔	علامہ اقبال کی تاریخِ ولادت کا مسئلہ	سجاد حسین شاہ	۲۵۷
۱۶۔	ایک اہم دستاویز کا تنقیدی جائزہ	زاہد منیر عامر	۲۷۱

1-	Muhammad Iqbal's date of birth	Sh. Ejaz Ahmed
28-	The date of Muhammad Iqbal's Birth	Jan Marek
33-	Date of Iqbal's Birth	S. A. Valid
47.	When was Iqbal's born?	Prof. Jangan Nath Azad

ضمیمے

۱۔ تاریخِ پیدائش کا ایک اور زاویہ ۳۴۹

۲۔ تاریخِ ولادت کمیٹی کے جلسوں کی کارروائی ۳۵۲

۳۔ مرے کالج سیالکوٹ میں علامہ کے داخلہ کی تاریخ کا تصدیق نامہ ۳۵۴

۴۔ مراسلہ وزارتِ تعلیم حکومتِ پاکستان بنام معتمد بزمِ اقبال ۳۵۵

۵۔ مصاحبہ شیخ اعجاز احمد ۳۵۶

۶۔ کیمبرج یونیورسٹی کے مقالے کی دریافت۔ ایک خبر ۳۵۸

۷۔ مکتوب ایس اے واحد بنام پروفیسر عثمان ۳۶۱

۸۔ علامہ اقبال کی تاریخِ ولادت سے متعلق بعض تحریریں جو شاملِ کتاب نہیں ۳۶۲

ماخذ ۳۶۵

تکملہ ڈاکٹر وحید قریشی ۳۶۷

یہ تکملہ چار نکات میں پیش کیا گیا ہے پوری کتاب میں مختلف حوالہ جات کا جائزہ لینے کے بعد بعض اہم باتوں کا تذکرہ کیا گیا ہے اور ڈاکٹر صاحب نے اپنے نقطۂ نظر کو بیان کیا ہے۔

۱۔ اقبال کی تاریخِ ولادت کے حوالے سے جتنا بھی تحقیقی مواد دیا گیا ہے۔ اس میں اگر اختلافات ہیں تو تعبیر و تشریح اور منطقی کڑیوں کی وجہ سے اور تاریخ ولادت ۱۸۸۳ء

یا ۱۸۷۷ء کو زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔

۲۔ تاریخِ ولادت کے سلسلے میں بزمِ اقبال کے اجلاس منعقدہ ۱۱ دسمبر ۱۹۵۱ء میں ۲۲ فروری ۱۸۷۳ء کو علامہ کی صحیح تاریخِ ولادت تسلیم کیا گیا۔

۲۰ ستمبر ۱۹۷۲ء کو بزمِ اقبال کی مجلس منتظم کے اجلاس میں دوبارہ اس پر غور ہوا اور ۵ افراد پر مشتمل کمیٹی تشکیل دی گئی۔ ڈاکٹر وحید قریشی فرماتے ہیں کہ:

''تاریخِ ولادت کے سلسلے میں تشکیل شدہ پانچ افراد کی کمیٹی کے دوسرے اجلاس میں راقم الحروف کو بھی کمیٹی کا رکن مقرر کیا گیا چنانچہ تحقیق کے لیے جو تین افراد سیالکوٹ گئے ان میں راقم الحروف بھی شامل تھی یعنی پروفیسر محمد عثمان، سید نذیر نیازی اور راقم الحروف اِس سفر پر روانہ ہونے اور کمیٹی کو نتائج سے آگاہ کیا۔ ۱۰

ڈاکٹر وحید قریشی نے متنوع موضوعاتِ ادب پر تحقیقی انداز سے قلم اٹھایا ہے۔ اقبالیات اِن کی دلچسپی کا خصوصی شعبہ رہا ہے۔ ''اساسیاتِ اقبال''، ''علامہ اقبال کی تاریخ ولادت''، اقبال ریویو کے مقالات اِس امر کے غماز ہیں کہ ڈاکٹر وحید قریشی نے ہر زاویئے سے اقبال کے فکر وفن کو روشنی میں لانے کی کوشش کی ہے۔ اقبال پر ان کا سب سے پہلا دستیاب مضمون ''اقبال کے تیرہ غیر مطبوعہ خطوط'' ہے۔ اس کے بعد انہوں نے دو کتابیں شائع کیں۔ جن کا تفصیلی تعارف گزشتہ سطور میں آچکا ہے۔ لیکن ان کے متعدد تحقیقی و تنقیدی مضامین جن کا تعلق اقبالیات کے موضوع سے ہے ابھی تک غیر مدون ہیں۔ اس کا اندازہ ذیل کی فہرست دیکھ کر ہوسکتا ہے۔

۱۔ اقبال کے تیرہ غیر مطبوعہ خطوط ۱۹۵۵ء

۲۔ اقبال کا رنگِ اصلاح ۱۹۵۹ء

۳۔ علامہ اقبال اور اسلامیہ کالج ۱۹۶۵ء

۴۔ علامہ اقبال کی تعلیمی زندگی کی بعض تفصیلات ۱۹۶۵ء

۵۔ اقبال اور پاکستان ۱۹۶۵ء

۶۔ آثارِ اقبال ۱۹۷۶ء

۷۔ ولادتِ اقبال کے سلسلے کی ایک تائیدی دلیل ۱۹۷۴ء

۸۔ اقبال کا فلسفۂ عشق ۱۹۷۷ء

۹۔ خطوط اقبال کا ذخیرہ محمد عمرالدین ۱۹۸۷ء

۱۰۔ افکارِ اقبال ۱۹۸۸ء

۱۱۔ اقبال اور تخیل پاکستان ۱۹۸۸ء

۱۲۔ اقبال اور ملی تشخص ۱۹۸۸ء

۱۳۔ اقبال اور نظریہ حیات ۱۹۸۸ء

۱۴۔ علامہ اقبال اور ہمارے علاقائی اختلافات ۱۹۸۸ء

۱۵۔ اقبال کا مردِ مومن ۱۹۸۸ء

۱۶۔ علامہ اقبال کی تاریخ ولادت ۱۹۹۴ء

۱۷۔ تکملہ بہ سلسلہ علامہ اقبال کی تاریخِ ولادت ۱۹۹۴ء

اَب اِن مضامین کی ہلکی جھلک کچھ یوں ہے کہ:

۱۔علامہ اقبال کے تیرہ غیر مطبوعہ خطوط

اقبال کے خطوط کے چھ مجموعے چھپ چکے ہیں لیکن ہنوز بہت سے خطوط لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہیں۔ ڈاکٹر وحید قریشی شاکر صدیقی کے ان خطوط کو اہم قرار دیتے ہیں کیونکہ اِن خطوط سے اقبال کی شخصیت پر مزید روشنی پڑتی ہے۔ شاکر کو اقبال سے والہانہ عقیدت تھی اور وہ اصلاح کے لیے اپنا کلام علامہ اقبال کو بھیجا کرتے۔ اِس اندازِ اصلاح کو ڈاکٹر وحید قریشی نے اپنے دوسرے مضمون اقبال کا رنگِ اصلاح میں واضح کیا ہے۔ تیسرے مضمون میں علامہ اقبال اور اسلامیہ کالج کے تعلق کو اجاگر کیا گیا ہے اور اسلامیہ کالج سے اقبال کی لاوابستگی کو جس ڈاکٹر وحید قریشی نے اس مضمون پر واضح کیا ہے اس کی مثال کہیں اور نہیں ملتی۔ اقبال اس کالج میں قائم مقام انگریزی کے پروفیسر رہے۔ انجمنِ حمایت اسلام کے صدر کی حیثیت سے بھی اقبال کا تعلق

اسلامیہ کالج سے برقرار رہا حتیٰ کہ اقبال کی ذاتی لائبریری کی ۶۳۵ کتب اسلامیہ کالج لائبریری کو دی گئیں۔

چوتھے مضمون ''علامہ اقبال کی تعلیمی زندگی کی بعض تفصیلات'' میں ڈاکٹر وحید قریشی نے اقبال کے حقیقی کارناموں کا جائزہ لیا ہے اور تعلیمی زندگی کی تفاصیل مہیا کی ہیں جس میں میٹرک کے سنٹر، اورنٹیئل کالج سے تعلق، عربی و فارسی کے امتحانات اور بی اے کی تفاصیل وغیرہ اور بعد ازاں ملازمت کے دوران پیش آنے والے حالات۔ یہ مضمون اپنے موضوع کے حوالے سے نئی معلومات سامنے لاتا ہے۔ مضمون ''اقبال اور پاکستان'' پنجابی زبانی میں ہے لیکن مصورِ پاکستان کے مغربی وطنیت کے تصور کی مخالفت کے ضمن میں ہماری رہنمائی کرتا ہے چھٹا مضمون آثار اقبال ایک تحقیقی مضمون ہے جس میں تین خط ہیں۔ یہ تین غیر مطبوعہ خط اس لیے اہمیت کے حامل ہیں کہ یہ اقبال کے ابتدائی دور کے خطوط ہیں ''آثار اقبال'' میں ایک چھوٹا مقالہ انجمن اسلامیہ پنجاب کی رکنیت کا بھی ہے عرصہ دراز سے یہ خطوط عجائب گھر کی زینت بنے ہوئے تھے اور ان پر کچھ نہیں لکھا گیا تھا لیکن ڈاکٹر وحید قریشی انہیں منظرِ عام پر لائے۔

اگلا مضمون ولادتِ اقبال کے سلسلے کی ایک تائیدی دلیل، گورنمنٹ کالج کے میگزین ''راوی'' کے صد سالہ نمبر اپریل ۱۹۷۴ء میں چھپا۔ اِس وقت ڈاکٹر وحید قریشی اورنٹیئل کالج میں شعبہ اُردو کے صدر تھے۔ اِس دور میں حکومت اور ''بزم اقبال'' نے بعض کمیٹیاں تشکیل دیں کہ علامہ اقبال کے سالِ ولادت کی تحقیق کی جاسکے۔ اقبال کی ابتدائی زندگی کے متعلق معلومات بہم پہنچانے کے بعد ڈاکٹر وحید قریشی نے اقبال کے درست سال پیدائش کو ثابت کیا۔

اگلا مضمون ''اقبال کا فلسفۂ عشق'' پنجابی مضمون ہے جس میں ڈاکٹر وحید قریشی نے اقبال کے ہاں ''عشق'' کی اصطلاح کی وسعت اور گہرائی کو واضح کیا ہے۔ جس میں افضل ترین عشقِ رسول ﷺ کا جذبہ ہے۔ اقبال نے عشقِ رسول کو تاریخی اور سماجی حوالے سے بھی بیان کیا ہے۔ اس جذبے کی بدولت، اسلام سیاسی طور پر زوال کا نشانہ بننے کے باوجود ایک زندہ قوت بنا رہا۔

اگلا مضمون ''خطوطِ اقبال کا ذخیرہ محمد عمر الدین'' ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے اِن خطوط کو اقبال کی فکری تبدیلی کے تناظر میں دیکھا جس میں فرد کی داخلی زندگی سے معاشرتی زندگی کی طرف کا سفر ظاہر ہوتا ہے۔ خودی اور بے خودی کے مراحل اقبال نے سفرِ یورپ میں طے کیے۔

اِس پس منظر میں اقبال کے اِن خطوط کا جائزہ لیں تو اقبال کے فکری ارتقاء کی کئی صورتیں نظر آتی ہیں۔ ڈاکٹر وحید قریشی پروفیسر محمد عمر الدین کے ذخیرہ خطوط کا ذکر کرتے ہیں۔ اِن میں سے تین تعارفی خطوط ہیں۔ جو ڈاکٹر سید ظفر الحسن مرحوم کے واسطے سے لکھے گئے ہیں۔ باقی چار میں سے دو پروفیسر محمد عمر الدین کے نام اور دو ڈاکٹر ظفر الحسن کے نام ہیں۔

''افکار اقبال، میں ڈاکٹر وحید قریشی نے چند بنیادی تصورات کا تذکر کیا ہے۔ جو حصولِ پاکستان میں فکری سطح پر ہماری رہنمائی کا سبب بنے۔ ''اقبال اور تخیل پاکستان'' میں ڈاکٹر وحید قریشی نے علامہ اقبال کے تصورِ وطنیت اور اس کی توسیع کا تصور پیش کیا۔ ''اقبال اور ملی تشخص'' میں ڈاکٹر وحید قریشی نے ملی اتحاد پر زور دیا اور علامہ اقبال کے ملی تشخص کے تصور کی وضاحت کی۔ جس کی منزل عالمی سطح پر اسلامی اتحاد ہے۔

اگلا تنقیدی مضمون ''اقبال اور نظریہ حیات'' ہے۔ جس میں اقبال کے نظریۂ حیات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اقبال کے نزدیک خیر و برکت اور مسلسل حرکت و عمل کا نام ہے۔ موت و حیات میں فاصلہ نہیں بلکہ موت ایک نئی زندگی کی طرف رواں ہونے کا نام اور عمل ہے۔

اگلے مضمون ''علامہ اقبال اور ہمارے علاقائی اختلافات'' میں اقبال کے نقطۂ نظر کو ذات اور وطن سے محبت کے دو حوالوں سے دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے اور زندگی میں توازن و تناسب کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے۔ اصل اہمیت مسلم معاشرے کے قیام اور عالمگیر برادری کی ہے۔ اگلا مضمون ''اقبال کا مردِ مومن'' ہے۔ یہ اقبال کا بنیادی تصور ہے جسے ڈاکٹر وحید قریشی نے بڑی وضاحت سے بیان کیا ہے۔ مردِ مومن کا اصل مقصد رحمانی خودی کا حصول ہے۔ تاریخِ اسلام سے بھی اقبال نے چند مردانِ حُر کا تذکرہ اپنے کلام میں کیا ہے کیونکہ یہ افراد حرکت و عمل کا پیکر ہیں اور اپنی زندگی کو راہِ حق میں قربان کرنے پر آمادہ ہیں۔ ''علامہ اقبال کی تاریخِ ولادت'' میں ڈاکٹر وحید قریشی نے بڑے مدلل انداز میں قرائن کا جائزہ لیتے ہوئے اقبال کی درست تاریخِ ولادت تلاش کی ہے اور ۲۹ دسمبر ۱۸۷۳ء کو درست قرار دیا ہے۔

اِس کتاب کے آخر میں ایک تکملہ بھی تحریر کیا ہے جس میں بعض کمیٹیوں کی تحقیق اور رپورٹوں کی روشنی میں زیرِ بحث مسئلے کا جائزہ لیا ہے۔

ڈاکٹر وحید قریشی نے اقبالیات سے متعلق متعدد کتابوں کے دیباچے بھی لکھے ہیں۔ بعض پر تبصرے تحریر کیے ہیں اور بعض کے فلیپ لکھے ہیں۔ ایسی تحریریں حسبِ ذیل ہیں۔ (ان کی ترتیب زبانی ہے)

۱۔	Biography of Iqbal	خواجہ عبدالوحید	۱۹۵۶ء
۲۔	اصلاحاتِ اقبال	منظور حسین	۱۹۵۸ء
۳۔	روزگار فقیر	سیّد وحید الدین	۱۹۶۵ء
۴۔	اقبال ایک سیاسی مفکر	ٹیلی وژن فیچر	۱۹۷۶ء
۵۔	اقبال دیاں لمبیاں نظماں	خلیل آتش	۱۹۷۷ء
۶۔	کتابیاتِ اقبال	رفیع الدین ہاشمی	۱۹۷۷ء
۷۔	رہ و رسمِ شاہبازی	ریڈیائی فیچر	۱۹۷۷ء
۸۔	سیّد میر حسن سیالکوٹی	سلطان محمود حسین	۱۹۷۹ء
۹۔	آدابِ خود آگاہی	اے رحمٰن	۱۹۸۱ء
۱۰۔	اقبال اور نثرادِ نو	ڈاکٹر آغا یمین	۱۹۸۶ء
۱۱۔	اقبالیاتی جائزے	ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی	۱۹۹۰ء
۱۲۔	نظم ''تنہائی''	منظوم ترجمہ ڈاکٹر وحید قریشی	

خواجہ عبدالوحید کی تالیف "Biography of Iqbal" پر ڈاکٹر وحید قریشی نے تبصرہ لکھا جو اُردو ڈائجسٹ، لاہور میں نومبر ۱۹۵۶ء میں شائع ہوا۔ لکھتے ہیں کہ اقبال پر تحقیق و تنقید کی کتابوں کا سرمایہ ضخیم ہوتا جارہا ہے۔ لیکن اس کی فہرست شائع کرنے کی ضرورت ہے۔ اِس کتاب سے نقاد بلکہ مستشرقین بھی مستفید ہو سکتے ہیں۔ ''اصلاحاتِ اقبال'' اپریل ۱۹۸۵ء کے امروز لاہور میں شائع ہوا۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے اِس مقالے میں کیپٹن منظور حسین کی بہت سی غلطیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے تصحیح کی ہے۔

ٹیلی وژن فیچر ''اقبال ایک سیاسی مفکر'' میں ڈاکٹر وحید قریشی نے اقبال کے سیاسی شعور کو بلیغ انداز میں اجاگر کیا ہے۔ ایک مفکر کی حیثیت سے اقبال نے ملت اسلامیہ کی فکری رہنمائی کی۔ اقبال کا دو قومی نظریہ اس حوالے سے اہمیت کا حامل ہے۔ اسی طرح وطنی قومیت کے تصور کی نفی بھی اقبال کے تصورات میں مرکزی مقام رکھتی ہے۔ اقبال افراد میں داخلی تبدیلی دیکھنا چاہتے ہیں۔

''اقبال دیاں لمبیاں نظماں'' خلیل آتش کی تصنیف ہے۔ جس میں اقبال کی دس اُردو نظموں کا ترجمہ پنجابی میں کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے اس تصنیف کا مقدمہ لکھا۔ جسے انہوں نے سات حصوں میں تقسیم کیا۔ پنجابی زبان کا ماضی اور تاریخ، روابط کی زبان فارسی اور اُردو کی برتری لیکن آہستہ آہستہ تہذیبی اور تمدنی سمجھوتہ ہوا اور پنجابی زبان کی اہمیت کو تسلیم کیا گیا۔

خلیل آتش نے فلسفے اور تاریخ کو جان اور سمجھ کر اقبال کی طویل نظموں کو ترجمے میں شامل کیا۔

رفیع الدین ہاشمی کی ''کتابیات اقبال'' میں اپنے پیش لفظ کو ڈاکٹر وحید قریشی تین نکات میں تقسیم کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ کتابیات اور اشارہ سازی مسلمانوں کے لیے نیا عمل نہیں۔ یہ مسلمانوں کا اپنا ہی کھویا ہوا ورثہ ہے۔ رفیع الدین ہاشمی کی ''کتابیاتِ اقبال'' اب تک اقبال پر شائع ہونے والی کتابوں کی مکمل ترین فہرست ہے۔

رہ و رسمِ شاہبازی ڈاکٹر وحید قریشی کا ریڈیائی فیچر ہے جو اس نام سے ۸ نومبر ۱۹۷۷ء کو ہوا تھا۔ اِس میں ڈاکٹر وحید قریشی نے اقبال کے مردِ مومن، مردِ قلندر، اور مردِ حُر کی بڑے عمدہ انداز میں وضاحت کی ہے۔ قرآن فکرِ اقبال کا سرچشمہ ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے اقبال کے مردِ مومن کی بات کرتے ہوئے مختلف اکابرین اسلام کا تذکرہ کیا ہے۔ مردِ مومن کے لیے شاہبازی اور شاہین کی اصطلاحات استعمال ہوئی ہیں۔

یہ ایک اندھی قوت نہیں بلکہ قوت کا مثبت استعمال ہے شاہین کی صفات خیالی نہیں حقیقی ہیں اقبال یہ صفات ہر ایک میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ ڈاکٹر وحید قریشی کے خیال میں اقبال کا مردِ مومن، کسبِ حلال کا مطیع ہے۔ اِس کی مادی تگ و دو اخلاقی و روحانی اقدار کے حصول کا ذریعہ ہے۔ سید میر حسن سیالکوٹی، اقبالیات کے سلسلے میں اہم کتاب ہے۔ جس کا دیباچہ ڈاکٹر وحید قریشی نے لکھا۔ اس کتاب میں ڈاکٹر سید محمود حسین

نے مفصل طور پر اقبال کی زندگی میں بنیادی مصادر تک رسائی حاصل کی ہے۔ یہ یقیناً اقبالیات کے سلسلے میں اہم اضافہ ہے۔

''آداب خود آگاہی'' اے رحمٰن کی مرتبہ کتاب ہے۔ جس میں انہوں نے کلامِ اقبال کی صوفیانہ توجیہات پیش کی ہیں۔

''اقبال اور نژادِ نو'' مقالات کا مجموعہ ہے۔ ڈاکٹر آغا حسین خان نے اِس مجموعۂ مضامین کے بارے میں لکھا تھا ''یہ نئی نسل کے لیے اقبال شناسی کے اعتبار سے اہم ترین کتاب ہے۔''

''اقبالیاتی جائزے'' ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کی کتاب ہے۔ جس کا فلیپ ڈاکٹر وحید قریشی نے لکھا ہے۔ اِس کتاب میں ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی نے اقبال کی سوانح عمریاں، عالم عرب میں اقبال شناسی اور بھارت میں اقبالیات کا تفصیلی جائزہ پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی فرماتے ہیں کہ بظاہر یہ کتاب ایک حوالہ جاتی دستاویز ہے۔ لیکن اصل میں کتابیاتی ذخیرے میں گراں قدر اضافہ ہے۔ اپنے اسلوب اور لب و لہجے کے اعتبار سے یہ تحقیقی ہی نہیں ایک پُرلطف تخلیقی تجربہ بھی بن گئی ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی محقق اور نقاد ہونے کے ساتھ ساتھ شاعر بھی ہیں۔ انہوں نے اقبال کی فارسی نظم ''تنہائی'' کا منظوم اُردو ترجمہ بھی کیا ہے۔ یہ نظم مخمس میں ہے۔ ترجمہ کچھ یوں ہیں۔

ترجمہ:
رہِ دراز کیا طے تو میں نے جا کے کہا
ترے لیے تہہ گردوں ٹھکانہ ہے کہ نہیں
یہ تو کہ جس سے منور ہیں دہر کی راتیں
تیرے لیے بھی کوئی آستانہ ہے کہ نہیں
حسد سے دیکھا سارے کو اور کچھ نہ کہا

مہ وستارہ سے آگے نکل گیا پھر میں
حضورِ حق میں جو پہنچا تو یوں کیا شکوہ

مرا وجود کہ ہے مشعلِ رہِ تاریک

کوئی بھی اس کی تجلی کا پاسباں نہ ہوا

وہ مسکرا سے دیے اور مجھ سے کچھ نہ کہا

گویا عشق حقیقی کا بار اٹھانے کی متحمل کوئی ہستی نہیں ہو سکتی۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے عمدہ پیرائے میں مخمس کی ہیئت اختیار کرتے ہوئے یہ ترجمہ کیا ہے۔۔۔

☆☆☆

حوالہ جات (باب ہفتم)

۱ انٹرویو از ڈاکٹر وحید قریشی۔ عمران نقوی، روزنامہ جنگ۔ ۱۹ نومبر ۱۹۹۲ء۔

۲ انٹرویو ذوالفقار احمد تابش ماہنامہ کتاب، اپریل ۱۹۷۴ء۔

۳ گوہر نوشاہی ڈاکٹر، ڈاکٹر وحید قریشی کی تحقیقی خدمات، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد۔ ۲۰۰۵ء، صفحہ ۹۹۔

۴ وحید قریشی ڈاکٹر، اساسیاتِ اقبال، اقبال اکیڈمی ایوانِ اقبال لاہور۔ ۲۰۰۳ء صفحہ ۲۴۵۔

۵ ایضاً۔ صفحہ ۴۴۔

۶ ایضاً۔ صفحہ ۲۱۸۔

۷ ایضاً۔ صفحہ ۲۳۴۔

۸ وحید قریشی ڈاکٹر، منتخب مقالات، اقبال ریویو، دیباچہ۔

۹ علامہ اقبال کی تاریخِ ولادت۔ بزم اقبال لاہور۔ ۱۹۹۴ء۔ مرتبہ ڈاکٹر وحید قریشی۔ زاہد منیر عامر۔ صفحہ ۹۳۔

۱۰ ایضاً۔ صفحہ ۳۶۸۔

☆☆☆

باب ہشتم

ڈاکٹر وحید قریشی بحیثیت شاعر

ڈاکٹر وحید قریشی عہدِ حاضر کے معروف نقاد، محقق، معلم، ماہرِ لسانیات تو ہیں ہی لیکن اِس کے ساتھ ساتھ وہ نہایت اعلیٰ درجے کے شاعر بھی ہیں۔ مخطوطہ شناسی یا تاریخ نگاری کا میدان ہو کہ کالم نگاری و مزاح نویسی کی ہموار راہیں ہوں۔ ان کا قلم ہر میدان میں یکساں انداز سے رواں دواں ہے۔ ان کے مخصوص شعبوں میں ادب، زبان، فنونِ لطیفہ، نفسیات، عمرانیات اور ابلاغیات شامل ہیں۔ ان کی ۸۰ سے زائد تصانیف سامنے آ چکی ہیں۔ انہوں نے شاعری میں فنی مہارت اور فکری چابکدستی کا اظہار کرتے ہوئے اندازِ بیان کے نئے اسالیب اپنائے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ پرانے اسلوب میں بھی روایت کا رس رچا کر موضوعاتی جدت عطا کی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا میلان آغاز سفر میں شاعری کی طرف ضرور رہا۔ لیکن انہوں نے شاعری کو ہمیشہ نجی چیز سمجھا اور تحقیق و تنقید کو اپنائے رکھا انہی دو میدانوں میں فضیلت اور برتری حاصل کی۔

''نقدِ جاں'' ڈاکٹر وحید قریشی کا پہلا شعری مجموعہ ہے جو سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور سے مارچ ۱۹۶۸ء میں شائع ہوا۔ ۸۲ صفحات پر مشتمل اِس شعری مجموعے کا نام مظفر علی سیّد نے تجویز کیا۔ ذوالفقار احمد کی مصورانہ کاوشوں نے اس مجموعے کو مزید خوبصورت بنایا۔ آغاز میں ڈاکٹر صاحب نے غالب کا یہ شعر نقل کیا ہے۔

شنیدہ ام کہ بہ آتش نسوخت ابراہیم
ببیں کہ بی شرر شعلہ می توانم سوخت

ڈاکٹر وحید قریشی بنیادی طور پر فارسی زبان و ادب سے لگاؤ رکھنے والے ادیب، شاعر اور محقق ہیں۔ ان کا یہ رجحان ان کے مجموعے میں بھی نظر آتا ہے۔ موضوعات میں رنگا رنگی ہے۔ لیکن احساس کی شدت ہر مقام پر نمایاں ہے۔ دیہات کی منظر کشی ہو یا جدید زندگی کی ترقی اور اس کے نتیجے میں ہونے والی اِنسانی اقدار کی توڑ پھوڑ کے خلاف ردِ عمل کا رویہ انہوں نے اظہار کے لیے کوئی ایک سانچہ نہیں اپنایا۔ بلکہ تنوع یہاں بھی ان کا خاصا

رہا ہے۔ رومانویت کے ہلکے سائے بھی ہیں اور تاریخ کے لرزاں نقوش بھی۔ ان کی بیان کردہ علامتیں بڑی معنی خیز ہیں۔ شاعر اپنی گم شدہ فردوس کی بازیافت میں ہر لمحہ تندہی سے مصروف سفر نظر آتا ہے یہ ایک ایسے معاشرے کا خواب ہے جہاں کج روی کے بدصورت نشانات نہ ہوں۔

تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے جبکہ ڈاکٹر وحید قریشی کے ہاں علامتیں تاریخی کردار بن کر خودکو دہراتی ہیں۔ جو موجود، حاضر اور آج سے منسلک ہو کے نئے معانی و مفاہیم اختیار کر لیتے ہیں۔ اِن کے روپ وہی رہتے ہیں لیکن سانچے نئے دور کے رنگ میں ڈھل کر گزشتہ کی بازیافت بن جاتے ہیں۔ شاعر جدید زندگی اور طرزِ حیات کا باشندہ ہوتے ہوئے بھی اِس زندگی کی منفی جہتوں سے بے زار اور دیہات کی لامحدود، سادہ فضا کا دلدادہ ہے۔ یہاں ڈاکٹر وحید قریشی کا طرزِ خیال مجید امجد کے ذہنی رویئے کے مشابہہ ہو جاتا ہے۔ تصنع اور بناوٹ سے نفرت، سادگی وحقیقت سے محبت شاعر کے کلام کی ہر سطر میں، ہر مصرعے کی رگ و پے میں جاری و ساری ہے۔ ''نقد جاں'' کی منظومات اور قطعات میں معنوی وسعت بھی ہے اور عصری سماجی شعور کا بیان بھی۔ ذات اور خدا سے مکالمہ بھی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے غزل پر بھی طبع آزمائی کی ہے اِن کی غزلیات اُردو اور فارسی روایت کا جھلملاتا عکس ہیں جن میں رنگارنگی کے ساتھ لطیف پیرائے میں دل کی واردات کو بیان کیا ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں:

> ڈاکٹر وحید قریشی نے اپنی منظومات کو کتابی صورت میں شائع کر کے اس بات کو ثابت کیا ہے کہ وہ جب کسی فن پارے پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں تو اس کے پسِ پشت ان کی اپنی قلبی واردات کا ایک لامتناہی سلسلہ ہمیشہ موجود رہتا ہے گویا وہ تخلیق کی آتش پنہاں ہی سے نہیں بلکہ اس کے کرب سے بھی آشنا ہیں اور اسی لیے ان کے تاثرات اور آراء اکتسابی نہیں۔ بلکہ تجربے اور وجدان سے ماخوذ ہیں۔ اس اعتبار سے ڈاکٹر صاحب کا یہ مجموعہ ان کے تنقیدی مضامین کا ایک نہایت قیمتی ضمیمہ ہے اور اس کے مطالعہ کے بعد ڈاکٹر صاحب کی تنقید کے تخلیقی پہلوؤں کا جواز بہ آسانی مل جاتا ہے۔[۱]
>
> ۔۔۔انہوں نے اپنی ذات میں ڈوب کر اشعار کہے ہیں اور اس لیے کہے ہیں کہ ایسا کیے بغیر وہ رہ نہ سکتے تھے۔ انہوں نے شعر کی بہت سی اصناف، کو اظہار ذات کے لیے

استعمال کیا ہے۔

''نقد جاں'' کی منظومات اور قطعات اپنے اختصار کے باوجود معنوی گہرائی و گیرائی کے حامل ہیں۔ اِن میں معاشرے کے رجحانات اور بدلتی قدروں کا غم بھی ہے اور قدیم روایات و اساطیر کا علامتی بیان بھی۔ شاعر کو فارسی اور اُردو روایات و اسالیب پر عبور حاصل ہے۔ یہ روایت اس کے فن کو پختگی عطا کرتی ہے۔ شاعر علم بیان کے بھرپور استعمال کا فن جانتے ہیں تشبیہات و استعارات نے ان کے جہانِ فن کو سجا دیا ہے۔ ان تشبیہات میں زندگی و حرارت رواں دواں ہے۔ ان کے پردے میں جھلملاتے ہوئے کئی پیکر اُبھرتے ہیں جو قلعے کے سناٹے میں صدا دیتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں اور قاری کے ساتھ ہم نوا ہو جاتے ہیں۔ شاعر کی رومانویت اس کے فن کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ سوچ میں ڈوبے ہوئے شبنم کے دیے اس کے ہمراہ کیونکر ہیں۔

کس کی آواز اٹھی شام کی ویرانی میں ؎
کون پھر آتش سوزاں کو ہوا دیتا ہے
ہیر پڑھتا ہوا خاموش چراگاہوں میں
کون بیتے ہوئے لمحوں کو صدا دیتا ہے

چاندی کے دمکتے پھول پودوں کے تلے ؎
ٹوٹے ہوئے رات کی جبیں کے تارے
مخمل کی بچھی ہوئی سہانی سیجیں
اور سوچ میں ڈوبے ہوئے شبنم کے دیے

کائنات کے حسیں عناصر سے والہانہ شیفتگی ان کو رومانوی شعراء سے قریب تر کر دیتی ہے اس رومانویت میں آس اور یاس کی لہریں بھی ہیں اور ایک نظامِ نو کے خواب بھی۔

افسردہ ہوئے چراغ اجڑی محفل!

آنکھوں میں نمی نہیں نہ قابو میں ہے دِل

آنکھیں ہیں کہ ڈھونڈتی ہیں تجھ کو ہر سُو

دل ہے کہ پکارتا ہے منزل منزل!

ڈاکٹر وحید قریشی نے ''نقدِ جاں'' میں متنوع موضوعات کو اپنایا ہے لیکن ان دائروں کے اسالیب بھی گوناگوں ہیں۔ انہوں نے بیشتر نظم کی صنف کو اختیار کیا ہے۔ ان کا فکری محرک یہ معاشرہ اور اس کی رنگارنگ کیفیات و نفسیات ہے۔ اس موضوع کی ادائیگی بھی ایسے ہی جامع پیرائے میں کی جاسکتی ہے۔ نظم کے تسلسل نے ڈاکٹر صاحب کی مدد کی ہے اور انہوں نے اپنے خیالات کے مسلسل اور بے لاگ اظہار کے لیے نظم کے سانچے کو اپنا لیا ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی کے کلام میں جذبات و افکار کی فراوانی بھی ہے اور ماضی پرستی (Nostalgia) کا عکس بھی۔ انفرادیت پسندی بھی اور فطرت کا حسیں اور بے ساختہ اظہار بھی۔ ڈاکٹر صاحب کی نرگسیت، اور انانیت نے یہاں ایک عجیب انداز اپنایا ہے جس میں تنہائی اور اداسی بھی ہے اور تخیل کی فراوانی بھی۔

جل پری رقص کناں

ہلکا ہلکا سا فضاؤں میں سرور

عود و عنبر سے رچی خلوت، میں

میرے جذبات کو سہارتا ہوا اک طوفاں

آس کے پاؤں سرِ شام ہی بوجھل بوجھل

وادیٔ شوق میں اک گرم بہار

اور ترا جسم مہکتا گلزار

تو یہ کہتی ہے تو سچ کہتی ہے

اب یہاں میں نہ کبھی آؤں گی

ڈاکٹر وحید قریشی پُرگو لیکن بلند معیار برقرار رکھنے والے شاعر ہیں۔ ان کے ہاں آس اور یاس کا حسین امتزاج ملتا ہے جہاں دُکھ درد کی پرچھائیں ہیں وہیں اُمید کی پری بھی پاؤں پسارے بیٹھی ہے۔ وہ قنوطیت سے گریز پا ہیں کیونکہ یہ منفی کیفیت انسانی اعصاب کو شل کر دیتی ہے اور آئندہ کسی بڑے مقصد کی تکمیل سے روکتی ہے۔

سوچتا ہوں کہ مجھے زیست کی ان راہوں میں
اپنے احساس کی موجوں ہی سے چلنا ہو گا
تیرہ و تار اندھیروں کی کڑی باہوں میں
ان دھواں دیتی ہوئی شمعوں کو جلنا ہو گا

''مرگِ آرزو'' اور ''میرے احساسات'' میں شاعر کا طرزِ فکر بالآخر مثبت اور امید افزا ہے۔ شاعر کا رجائی لہجہ جھلک اٹھتا ہے اور وہ غم کے اندھیرے میں زندگی کا جگنو تلاش کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے جیسا کہ مقالے کی ابتدا میں تعارف میں بتایا گیا ہے کہ ڈاکٹر صاحب ہمہ پہلو شخصیت ہیں۔ ان کے ہاں ہمیں رنگا رنگ موضوعات و مضامین ملتے ہیں۔ ایک طرف مصوری ہے تو دوسری طرف تاریخ، ایک سمت فارسی علم و ادب ہے تو دوسری طرف اُردو ادب کا ایوان۔ جب یہ تمام روایات ڈاکٹر وحید قریشی کے مزاج و شخصیت میں موجود ہیں تو ان کے کلام میں ان کا جھلک اٹھنا ایک فطری امر تھا۔ ان کے ہاں تاریخ ایک شعور بن کر اُبھرتی ہے۔ تلمیحی اور اساطیری کردار اپنی تمام تر کشش اور دلکشی کے ساتھ ان کے ہاں نظر آتے ہیں تلمیحی اور اساطیری رنگ فارسی ادبیات کی دین ہے جس کی ہر روایت بڑی ہی دلکش اور دیومالائی سحر کی حامل ہے۔

اُردو شاعری کے صنائع بدائع، علم بیان، تلمیحات وغیرہ کا رشتہ فارسی اساطیری روایت کے ساتھ جا کر جڑتا ہے۔ اس لیے ڈاکٹر صاحب نے فارسی روایات اور علم و فن سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔ ان کے ہاں فارسیت کا غلبہ

محسوس نہیں ہوتا بلکہ ایک زیریں لہر ہے۔ جو شیریں بیانی کی صورت میں سطح پر نمایاں ہو جاتی ہے۔ مثلاً تاریکی اور روشنی کی علامتیں، زرتشت مذہب کے پیروکاروں کے رجحانات اور نظریات، یزداں اور اہرمن کی طاقتیں، اور زندگی کی کشمکش یہ تمام صورتیں ایرانی فلسفۂ زندگی کو پیش کرتی ہیں۔ زندگی کی جانب ان کا رویہ منفی تھا۔ خودکشی ان کے مذہب کا حصہ تھی۔ ایسی اساطیری اور تلمیحی خصوصیات کی نظموں میں ''انجام'' ''ثنویت''، ''مزدک''، ''شجر ممنوعہ'' اور ''مسعود سعد سلمان'' شامل ہیں۔ ان نظموں میں تاریخی کرداروں کی موجودگی نے ڈرامائی تاثر پیدا کر دیا ہے۔ ان میں مکالمے بھی ہیں اور حرکت کرتے ہوئے کردار بھی۔ مکالمے کا یہ تاثراتی انداز ان نظموں کا انوکھا پہلو ہے۔ جو ڈاکٹر وحید قریشی کو ایک کامیاب ڈرامہ نگار بھی بنا دیتا ہے۔

اھرمد کو بتایا ہے آج موحد نے
بلندیوں سے اتاریں گے نقش ہائے کہن
تجھے بھی محرم رازِ جنوں بنائیں گے
تجھے سنائیں گے ہم قصہ ہائے دار و رسن

مزدک اور مانی کے کرداروں کی زبان سے جو مکالمے ادا ہوئے ہیں۔ ان میں زرتشتیوں کے زندگی کے بارے میں تصورات کا بیان ملتا ہے۔ مانی زندگی کے بارے میں منفی نظریہ رکھتا ہے۔ مزدک سے مخاطب ہو کر کہتا ہے۔

ے وجودِ آدم خاکی کا راز کچھ بھی نہیں
نظامِ نور مقید کیا تھا ظلمت نے

اسی لپٹ سے اُبھری تھی زندگی کی کرن
ظلام و نور کی موجوں میں ٹھوکریں کھا کر
یہ نقش ماند تو پڑتے ہیں مٹ نہیں سکتے

نظم کا دوسرا حصہ مزدک کے عنوان سے لکھا گیا ہے۔ ان جوابات کو ڈاکٹر وحید قریشی نے یوں نظم کا پیرایہ عطا کیا۔

یہ سیمیا کا جہاں ہے فتنہ زرتشت!
یہ موبدوں کے ٹھکانے زر و جواہر میں
یہ ریل پیل امیروں کے در پہ دولت کی
جہاں تنگ ہے اتنا پہ سب کو جینا ہے
سبھی کو زیست کا یہ تلخ جام پینا ہے
یہ بھوک پیاس، یہ غصہ، یہ نفس امارہ
سیاہ دیو تباہی کے ہر طرف موجود
ابھی ثبات ہے ان کو مغوں کی برکت سے
یہ سارے فتنے مٹیں گے آپ ہی آپ
الاپ راگ مساوات کا الاپ الاپ

میری حیات ہے ناواقف حیات ابھی!
میرے غموں کا نہ چارہ ہے خودکشی میں یہاں
نہ جستجو ہے مداوائے تیرگی حیات

اس آس پہ بیٹھا ہوا ہوں مدت سے
بجھے بجھے سے یہ لمحے گزر ہی جائیں گے

یہ نظم ڈاکٹر وحید قریشی کی مکالماتی نظموں میں سے ایک عمدہ مثال ہے۔ ایسی ڈرامائی اور مکالماتی نظموں میں کردار گفتگو تو کرتے ہی ہیں۔ خود کلامی کے ذریعے اپنے کردار کے عناصر کو اجاگر بھی کرتے نظر آتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی نظموں میں گفتگو کے عناصر سے خطابیہ شاعری وجود میں آتی ہے جس میں صوتیات کو نہایت اعلیٰ مقام حاصل ہے۔

خود کلامی کا انداز ڈاکٹر وحید قریشی کی نظم ''میرے احساسات'' میں ملاحظہ ہو۔

دکھ سکھ مجھ سے باہر ہیں
دکھ سکھ جزو حیات نہیں
میرے احساسات بھی شاید
میرے احساسات نہیں
ابر گریز اس کے ٹکڑے ہیں
اَن دیکھے اَن جانے جزیروں کی جانب اڑتے ہی چلے جاتے ہیں
روح ابد کو شرماتے ہیں
وقتی احساسات مرے کام آتے ہیں
بے حس لمحہ
وقت کی شوخ چٹانوں سے ٹکرا کر
ٹوٹ کے رہ جائے گا
وہ تو ساتھ نہیں آئے گا
میرے احساسات مرے کام آئیں گے

ایسی نظموں کو دیکھتے ہوئے ن۔م۔ راشد کا انداز بھی یاد آتا ہے۔ جہاں ان کے قلم نے ڈرامائی نظمیں

تخلیق کی ہیں۔ خود اذیتی کا پہلو بھی کہیں کہیں جھلکتا ہے۔ لیکن ڈاکٹر وحید قریشی کی رجائیت زندگی سے محبت بن کر اُبھر آتی ہے۔

''نقدِ جاں'' ڈاکٹر وحید قریشی کے قلب روح پر گزری وارداتوں کا منظوم بیان ہے۔ اسی لیے اس میں صداقت اور واقعیت ہے وہ اپنی ذات میں گم ہو کر اشعار کہتے ہیں اور ذاتی احساسات اور تجربات کو ہمارے سامنے بیان کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنے فن کی عظمت کی بدولت داخلی تجربات کو بیرونی دنیا کی واردات بنا دیا ہے۔ یہاں پہنچ کر ذات اور کائنات ہم آہنگ ہو جاتے ہیں مکالمہ کرداروں کے بیچ ہے لیکن معاشرتی رویوں اور قدروں سے ہم آہنگ ہے۔ ان کے جذبات کائناتی شاعری سے منسلک ہو کر اور بھی ارفع ہو جاتے ہیں۔ حسیات کے حوالے سے مسعود سعد سلیمان کے کردار کو بیان کیا گیا ہے اور اس کے تاثرات نظم کئے گئے ہیں۔ شاعر اس کے داخلی واردات پر قلم اٹھاتے ہیں۔ یہاں ڈاکٹر وحید قریشی کی صداقت بیان محض معنی کی سچائی بن کر نہیں رہ جاتی بلکہ ان کو زبان بھی وہی اختیار کرنے پر مجبور کر دیتی ہے جو مسعود سعد سلیمان جیسے شاعر نے اختیار کی یعنی فارسی۔

چہ گوییت کہ مرا برون زنداں کرد

بمرد شاہ بھمن روزگار آساں کرد

صبا بہ بوا الفرج رونی ام خبر برساں

فلک بہ گردش خود کاشہہ پریشاں کرد

بیادِ اوست کہ از سر گرفتہ ام نالہ

بنام تو اوست کہ جیب مرا گلستاں کرد

نوای مرغ گرفتار! ایں ست کار بدیم

کسی نہ کرد کہ مسعود سعد علی کرد

بہ عرش و کرسی صدای صبی چو کر دگزد

دعا ز راہِ اجابت قبول یزداں کرد

برای ایں کہ شود ختم کار دشمن من

نگاہِ دیدۂ پر اشک کار پیکاں کرد

بحکم آں شہ والا نشان بود کہ کنون

معمالی اوجِ سعادت مرا سلیماں کرد

کسی نبود کہ دامن بدستِ خود گیرد

خدا بحال من ناتواں چو احساں کرد

زمہرِ اوست کہ اکنوں سوی لبو شدم

ز لطف اوست کہ وردم قرین درماں کرد

ثنا کنم بخدا و سخن کنم کوتہ

بنام او کہ مرا ہمنوای حساں کرد

ڈاکٹر وحید قریشی فن برائے زندگی کے قائل ہیں اس لحاظ سے ان کا اندازِ فکر ترقی پسند شعراء کے قریب ہے۔ وہ ایک ایسے معاشرے کی تشکیل چاہتے ہیں جہاں فرد اور قوم کو بے اطمینانی نہ ہو سب کو اپنے حقوق حاصل ہوں۔ وہ فن کو زندگی کا تابع سمجھتے ہیں۔ وہ معاشرتی ناہمواریوں اور طبقاتی امتیازات کو برداشت نہیں کر پاتے۔ انہوں نے عصری صورتحال کے سیاسی، سماجی پہلوؤں کو اپنی نظموں کا عنوان بنایا ہے۔ لیکن اس صورتحال سے لڑنے کے لیے خدا نے فنکار کے ہاتھ میں قلم کا ہتھیار دیا ہے۔ اگر وہ چاہے تو معاشرتی ناہمواریوں کو اپنے فن کی بدولت سدھار سکتا ہے۔ ہمارے ملک میں فن کو غلط مقاصد کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے۔ سیاستدان ہو یا ادیب سب نے اپنا مقصد روپے کو بنا لیا ہے۔ لیکن اس صورتحال کا انجام صرف موت اور بربادی ہے۔ اس طرح روحانی، اخلاقی اور معاشرتی قدریں دم توڑ جائیں گی۔ شاعر معاشرے کا اہم ستون ہے جو چاہے تو اخوت اور بھائی چارے کی فضا کو اپنے کلام کے ذریعے فروغ دے سکتا ہے۔

اس سے پہلے کہ ترے ذہن کے ہر گوشے میں
بکھرے جذبات سیہ برف کی قاشیں بن جائیں
اس سے پہلے کہ حزیں شام کی تاریکی میں
تیرے افکار فراعین کی لاشیں بن جائیں

بزمِ ہستی میں نئی جوت جلا الفت کی
زیست کو خوگرِ لمحاتِ وفا ہونا ہے

اِک نیا دور پسِ پردۂ تاریک تو ہے
عالمِ شوق کو مصروفِ غنا ہونا ہے!

(میرے فنکار، صفحہ ۵۵)

ڈاکٹر وحید قریشی علامہ اقبال کو فکری رہبر بناتے ہیں۔ نثر میں انہوں نے اقبال کے حوالے سے بیش بہا کام کیا ہے۔ شاعری میں اقبال کی نظم ''ابلیس کی مجلسِ شوریٰ کا مصرع ذہن میں آتا ہے۔

میں نے دکھلایا فرنگی کو ملوکیت کا خواب

اِسی رنگ میں ڈاکٹر وحید قریشی نے نظم تخلیق کی۔ ''شجرِ ممنوعہ'' جو تلمیحی و اساطیری رنگ میں اپنی مثال آپ ہے۔ جس میں آدم کی پیدائش اور اس کے بعد شیطان کے انہیں بہکانے کے قرآنی واقعے کو منظوم کیا گیا ہے۔ ''شجرِ ممنوعہ'' یوں شروع ہوتی ہے۔

''میں نے آدم کو دکھایا نئے فردوس کا خواب
نئے رومان نئی صبحِ وصال
اک نیا کیف تمناؤں کی آزادی کا

آسمانوں سے گریں کلیاں ستارے بن کر
اور شبنم میں نہائی ہوئی اک پتی پر
داستاں لکھی گئی رات کے اُرمانوں کی
کتنا رنگیں تھا میرے عہد وفا کا آغاز

(شجر ممنوعہ، صفحہ ٦٠)

تقسیم کے واقعات اور ہجرت نے ہر دور کے شعراء کو متاثر کیا۔ میر تقی میرؔ یا ناصرؔ کاظمی یا پھر ڈاکٹر وحید قریشی اس عمل نے ہر ایک کے قلب و ذہن پر گہرے نقوش مرتسم کیے اور یہ عکس ان کے کلام میں بھی جھلکتا ہے۔ تقسیم کے بعد عوام کے خوابوں کا چکنا چور ہونا ایسا عمل تھا جس نے فیضؔ کے قلم سے:

ع وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں

جیسا کلام تخلیق کرایا

اِس ضمن میں ''تعمیر جنوں'' جو ڈاکٹر وحید قریشی کی نظم ہے اور اسی موضوع پر لکھی گئی ہے۔

فرماتے ہیں۔

یہ طلوعِ صبحِ نو
یہ طلسم نرم رو
کاروانِ شامِ غم
سیلِ ہستی یم بہ یم
آسماں پر ہیں رواں
بکھری بکھری بدلیاں

ایک صبحِ احمریں

ایک خوابِ دلنشیں

....

ختم ہو جانے کو ہے

آج کھو جانے کو ہے

وہ نشاطِ سرمدی

وہ سکونِ زندگی

اور یہ پھیلے ہوئے

رنگ و بو کے قافلے

میں انہیں دیکھا کروں

ایک دنیائے سکوں

نیند میں ڈوبی ہوئی

یہ سحر کی دلکشی

کیا یہی انجام تھا؟

میرے دلِ ناکام کا

بوئے مے میں بوئے خوں

آہ تعمیرِ جنوں!

ڈاکٹر وحید قریشی کی دو نظمیں ''شجرِ ممنوعہ'' اور ''رقص'' کے انگریزی تراجم بھی موجود ہیں۔ جو اے۔ کیو۔

نیاز صاحب نے مہیا کیے ہیں۔ "At a Dance" اور "A Forbidden Tree" ایسی نظمیں ہیں جو شاعر کی قوتِ تخیل کا بہترین نقش ہیں۔

"A Forbidden Tree" جو ''شجرِ ممنوعہ'' کا ترجمہ ہے۔ اس کا کچھ حصہ یوں ہے:

I gave the vision
of a new Paradise
A new sense of romance
A new sense of union
A new feeling of elevation
" " " "
Ah, How glorious, indeed
How full of colour
Was the beginning
of my pledge
of loyality and love.

(Page 61)

نظم ''رقص'' اور اس کے بعد "At a dance" کچھ یوں ہے۔

جل پری رقص کناں
ہلکا ہلکا سا فضاؤں میں سرو
عود و عنبر سے رچی خلوت میں
میرے جذبات کو سہلاتا ہوا اک طوفاں
" " " "

تو یہ کہتی ہے تو سچ کہتی ہے

اب یہاں میں نہ کبھی آؤں گی''

A mermaid dancing

on the waves! A soft

And sillcon sense of joy

A float on the air

A privacy, a solitude

soaked in fragrance

A storm lightly touching

The whole and gently rubbing in rang of my emotions!

Yes, ah yes! you speak

The truth when you say

You never will come here.....

Again. (Page 63)

''نقد جاں'' میں نظموں کے حصے میں دو ماخوذ نظمیں بھی موجود ہیں۔ مثلاً نظم ''زندگی'' جو ایک ایسے شخص کی کہانی ہے جو ہمہ وقت مصائب سے دوچار ہے اور ''میرے احساسات'' ذاتی واردات کی داستان ہے۔

''کس قدر ویراں ہے میری زندگی

جیسے دیوانہ کوئی

خود کو مردہ جان لے

اور اپنی موت پر

اشک فشاں ہو اندھیری رات میں'' (زندگی، صفحہ ۵۹)

ڈاکٹر وحید قریشی نے نظموں میں بے شمار کامیاب تجربات کیے ہیں اور یہ تجربات انہیں مجید امجد، ن۔م۔ راشد اور میرا جی کے قریب کر دیتے ہیں۔ فارسی روایت سے اکتساب ان کے کلام کو شیرینی اور معنوی رفعت عطا کرتا ہے۔ ان کے کلام کی ڈرامائیت ان کی نظموں میں تجسس کو اُبھارتی ہے۔ ان کی نظم زندگی کا آئینہ ہے۔ اس میں ہر پرانا معنی نئے خیال کا لبادہ اوڑھ کر جلوہ گر ہوتا ہے اور قاری کو مبہوت کر دیتا ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ خود ڈاکٹر صاحب کی اپج اور جودت طبع جو شش جہت ہے۔ جس میں ہر آئینہ ایک نئی تمثال گری کا موجب ہے اور یہ تمثال گری ارتقاء کے خیال کی مظہر ہے۔ stangnant اور جامد نہیں۔ نظم ایک ندی کے بہاؤ کی مانند روانی سے بہتی چلی جاتی ہے۔ ان کی نظمیں ایک سلسلہ خیال سے مربوط ہیں۔ یہ منضبط طرزِ ادا ایک طویل ذہنی اور تخیلی ریاضت کی مرہون منت ہے۔ اردو، ہندی، پنجابی اور فارسی کا یہ حقیقی امتزاج اردو ادب میں ایک نیا تجربہ ہے۔ ایک ہی شاعر کے تخیل کے یہ مختلف رُوپ حیران کُن ہیں۔ کہیں تصنع کا شائبہ بھی نہیں ہوتا۔ یہ ایک سلسلۂ خیال ہے جو باہم مربوط ہے۔ پنجابی زبان کو بھی ڈاکٹر صاحب نے ایک اچھوتے انداز میں برتا ہے۔

''نقدِ جاں'' میں نظموں کے علاوہ قطعات بھی موجود ہیں جن میں دونوں زبانوں یعنی اردو اور فارسی کے قطعات لکھے گئے ہیں۔ جو نہایت عمدہ ہیں اور فکر وفن کے معیار پر پورے اُترتے ہیں۔ ان قطعات میں ڈاکٹر صاحب نے ایک ہی خیال کو مسلسل بیان کیا ہے۔ ان کے موضوعات متنوع ہیں۔ دیہی زندگی کی جیتی جاگتی تصویریں ہوں یا دیہاتی لڑکی کا سادہ و معصوم پیکر۔ ہر دو جگہ ڈاکٹر صاحب نے اپنے قلم کو حقیقت کے لہو میں ڈبویا ہے اور قاری اسی سادہ فضا میں خود کو سانس لیتا ہوا محسوس کرتا ہے۔

ایک قطعے تُرنجن، کا اقتباس ملاحظہ ہو جو کسی ڈرامے کا جیتا جاگتا ایکٹ معلوم ہوتا ہے۔

گاؤں کی لڑکیاں ترنجن میں

گیت گانے لگیں عجیب عجیب

اور محسوس یہ ہوا مجھ کو

سانس لیتا ہے کوئی دل کے قریب۔

ڈاکٹر وحید قریشی کا بچپن ساہیوال کے دیہات میں گزرا۔ وہ منظر آج بھی ان کی نگاہوں کے سامنے تابندہ ہیں۔ وہ دیہات کے پُرسکون ماحول کو حیات افزا کہتے ہیں۔

ے دُور چھوڑ آیا ہوں میں آج مشینوں کا دھواں

شہر کا شور تو کانوں میں گھسا جاتا تھا

زندگی سِل تھی کہ سینے پہ دھری رہتی تھی

درد آنسو تھا کہ آنکھوں سے بہا جاتا تھا۔

قطعہ 'آنسو' میں ایک دیہاتی لڑکی کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

ے دیکھ اے گاؤں کی افسردہ و رعنا لڑکی

تیری پلکوں پہ یہ سہمے ہوئے تابندہ گہر

میرے معصوم تخیل کی طرح نرم و حسیں

تیرے مجبور نصیبے کی طرح خاک بسر

ڈاکٹر وزیر آغا نے وحید قُریشی کے کلام میں دیہاتی زندگی کا ذکر کرتے ہوئے "نقدِ جاں" کے دیباچے میں درست لکھا ہے کہ: "موضوعات کے ضمن میں بھی ڈاکٹر صاحب نے تنوع اور رنگا رنگی کا بہت خوب مظاہرہ کیا ہے۔ ان کے ہاں دیہاتی زندگی کے پسِ منظر پر البیلی محبت کے نقوش بھی اُبھرتے ہیں۔"[۱]

انسانی ذہن پر جس قدر اس کا ماضی حاوی ہوتا ہے اتنی کوئی اور چیز نہیں ہوتی۔ ڈاکٹر وحید قریشی کے ہاں بھی ماضی کی بازگشت بار بار سنائی دیتی ہے اور گئی رُتوں اور بھولی بسری محفلوں کا تذکرہ کر کے اپنے

Nostalgic mood کو اپنے قطعات کی زینت بناتے ہیں اور یہ قطعات ماضی کے ساتھ ان کی جذباتی وابستگی کو ظاہر کرتے ہیں۔ وہ ماضی جو کبھی لوٹ کر واپس نہیں آئے گا۔ یہ استعارے عام فہم ہیں۔ لیکن بڑے ہی عمیق اور وسیع۔ وسعت کا یہ عالم ہے کہ جہاں تک نگاہ جاتی ہے چراگاہوں کے مناظر، شام کی تنہائیاں اور سناٹے کی صدا سنائی دینے لگتی ہے۔ شاعر نے اپنی یادوں کے تخلیقی لمحوں کی بازیافت بڑے کامیاب انداز میں کی ہے۔ مثلاً قطعہ ''بیتے لمحے'' ملاحظہ ہو۔

ے کس کی آواز اُٹھی شام کی ویرانی میں
کون پھر آتشِ سوزاں کو ہوا دیتا ہے
ہیر پڑھتا ہوا خاموش چراگاہوں میں
کون بیتے ہوئے لمحوں کو صدا دیتا ہے۔

یہ ماضی پسندی، رومانویت کا خاصہ ہے۔ جہاں سرسراتے ہوئے ہلکے ہلکے سائے بھی دکھائی دیتے ہیں اور فنا کے گھاٹ کا بیتا ہوا کنارہ بھی۔ یہاں شاعری کا کینوس اُداسی کے رنگوں کے بغیر نامکمل ہے۔ یہ درد و کرب تخلیقی جوہر لیے ہوئے ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے بھی رومانویت کے اس عنصر کو پورے طور پر اپنایا۔ مثلاً 'عمر رواں کی لہرو' میں ملاحظہ ہو۔

ے ہر جست میں گُم کیا کنارہ تم نے
سو طرح سے درد کو اُبھارا تم نے
اے عمرِ رواں کی رقص کرتی لہرو
کس کس کو فنا کے گھاٹ اتارا تم نے

یہ کیفیات تو ہر شخص کا خاصہ ہیں۔ لیکن ڈاکٹر وحید قریشی کے ہاں یہ 'چیز دگر' یعنی قوتِ متخیلہ سے ہم آہنگ ہو جاتی ہیں۔ جہاں زندگی کی افسردگی اس کی بے ثباتی کے جواز کو اپنا لیتی ہے اور یاس و افسردگی کے سب رنگ زندگی کے تلخ حقائق کی بازیافت بن جاتے ہیں۔ 'نقدِ جاں' کے تمام قطعات مثلاً ''شہر''، ''چاندی کے پھول''، ''فسادات''، ''افسردہ چراغ''، ''مجبور''، ''کیسے کٹے گی رات''، ''نیلے ساحل'' اور ''عُمر رواں کی لہرو'' میں

یہ تاثر نمایاں ہے۔ قطعے کی وسعت بے کنار ہے۔ اس کی وسعت کے لیے کوئی حد مقرر نہیں کیونکہ اس کے لیے موضوع کی کوئی قید نہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اس امر سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے ہر موضوع کو قطعے میں بیان کیا اور پھر یہ نیشتر دل کو پوری طرح گھائل کرنے لگے۔ ''افسردہ چراغ'' ملاحظہ ہو۔

ے افسردہ ہوئے چراغ اُجڑی محفل!
آنکھوں میں نمی نہیں نہ قابو میں ہے دل
آنکھیں ہیں کہ ڈھونڈتی ہیں تجھ کو ہر سُو
دل ہے کہ پکارتا ہے منزل منزل!

جس طرح نظموں میں ہر رنگ کے اشعار اور موضوعات موجود ہیں بالکل اِسی طرح قطعات میں بھی ڈاکٹر صاحب نے بے شمار موضوعات اختیار کیے ہیں اور ہر موضوع ایک قطعے کی فریم میں سج کر ایک مکمل اور جامع تصویر کا روپ دھار گیا ہے۔ انہوں نے بھی میؔر اور ناصؔر کاظمی کی طرح بستی کا استعارہ استعمال کرتے ہوئے تقسیم اور ہجرت کے نتیجے میں ہونے والے تلخ واقعات کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ کہتے ہیں۔

ے کیا ختم ہوئے سرور و کیف و مستی؟
کیا ٹوٹ کے رہ گیا طلسمِ ہستی؟
اک شور سا اٹھ رہا ہے عالم عالم
اک آگ سلگ رہی ہے بستی بستی

(فسادات، صفحہ ۱۸)

حیرت کی بات یہ ہے کہ جو خصوصیات ڈاکٹر وحید قریشی کی نظموں میں موجود ہیں۔ وہی ان کے قطعات کی خوبیاں بھی ہیں۔ آپ نے مکالماتی انداز کو نہ صرف نظموں میں برت کران میں حسن پیدا کیا بلکہ یہ خوبی آپ کے قطعات میں بھی موجود ہے۔ اسی طرح خودکلامی صرف نظموں کا جوہر ہی نہیں بلکہ قطعات میں بھی درآئی ہے یہ ڈرامائی حسن ڈاکٹر صاحب کے قطعات کو One act play کی خوبی عطا کرتا ہے۔ ''نیلے ساحل'' کا جیتا جاگتا منظر ملاحظہ ہو۔

؎ چھایا ہے سکوت کیسا منزل منزل
لے آیا کہاں پہ آہ سوز غم دِل
تنہائی کے بوجھ سے لرزتی شامیں
اور نیند کے پُرفریب ساحل!

(ملیے ساحل، صفحہ ۲۲)

یہ ڈرامائی تاثر اس وقت تمثیل کا روپ دھار لیتا ہے جہاں خودکلامی اور گفتگو کا انداز ان کے قطعات کی زینت بن جاتا ہے۔

؎ دل کھا ہی گیا تھا مات سوتے سوتے
پہنچی ہے یہاں یہ بات ہوتے ہوتے
اب اے دل ناتواں سنبھل بھی جا تو
یوں کیسے کٹے گی رات روتے روتے!

(کیسے کٹے کی رات، صفحہ ۲۱)

یہ خودکلامی گفتگو کا رنگ اختیار کرلیتی ہے جہاں شاعر خدا سے مخاطب ہوتے ہیں۔

؎ سیلِ بلا نے کر لیا ہے محصور
ہیں لاکھ جہاں میں اہلِ بینش مجبور
یہ دھیان لگا ہوا ہے رندوں کو ترے
اک موجِ دل نواز آئے گی ضرور

(سیلِ بلا، صفحہ ۲۰)

اِن مکالموں میں شاعر دیگر کرداروں سے گفتگو کرتا نظر آتا ہے۔ کہیں کہیں استفہام اور استفسار کا رنگ بھی آجاتا ہے۔

ایک قطعہ ہے ''جوبن'' جس میں شاعر نے محبوب کو کچھ یوں مخاطب کیا ہے۔

جھوم کر لہریں جو لینے لگیں جوبن اے جاں
مستی شوق میں آنچل بھی ڈھلک جاتے ہیں
اس میں تیری نگہ ناز کی کچھ بات نہیں
جام خود تندئ صہبا سے چھلک جاتے ہیں

(جوبن، صفحہ ۱۸)

فارسی شاعری کی پسندیدہ طرزِ روش اور زبان وہی ہے جس کا اظہار انہوں نے نظموں میں بھی کیا ہے اور اب قطعات میں بھی دیکھئے۔ دو قطعات فارسی زبان میں موجود ہیں جن میں وحید قریشی فطرت کے حسن و کشش کو موضوع بناتے ہیں۔

فروغ مہر و مہ را وام کردم
می رنگین دروں جام کردم
بروں کردند از خلد بریم
کہ من ذوقِ نظر را عام کردم

(صفحہ نمبر ۷۵)

اسی طرح ایک اور جگہ یوں رقم طراز ہیں۔

نگار بستن گل ہائی شوخ وشنگ بہ بین
چمن طرازی نیساں سطح سنگ بہ بین
بہ ہزرہ کاری ماشین پشت پا برزن
بروی سبزہ نظر کن طلسم رنگ بہ بین!

(صفحہ ۷۵)

مختصر یہ کہ ”نقد جاں“ کے قطعات نے ہر جگہ ایک نیا رنگ و آہنگ اختیار کیا ہے۔ اِن تصوراتی کرداروں کے بیان میں ایرانیوں کے عقائد اور طرزِ زندگی کو تمثیلی انداز میں روشناس کرایا ہے۔ بعض مقامات پر تمثیل کا انداز ہمیں کسی اور ہی دنیا کا پتہ دیتا ہے۔ یہ تخیل کی بوقلمونی ہے کہ آئینے کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں نے تمثال کا ایک نیا جہاں پیدا کر دیا ہے۔ یہاں مسلسل تشبیہات ہیں اور استعارات کا نیا سلسلہ ہے اور براہِ راست گفتگو کی بجائے سلسلۂ کلام کا تعلق استعاراتی دنیا سے جڑ جاتا ہے۔

ے ہوا کے دوش پہ آیا ہے قافلہ شب غم کا
سلگ رہے ہیں ستارے فضا اداس بہت ہے

شاعر نے ردیف کے کلمات کی تکرار سے قافیے کا صوتی تاثر دوبالا کیا ہے اور یہ غنائیت شاعر کے مزاج کو اجاگر کرتی ہے۔

قوافی کے مؤثر استعمال نے غزل میں لحن اور آہنگ پیدا کر دیا ہے اور مصرعوں کے غنائی مزاج کے تعین میں بڑی مدد دی ہے اور صوتی اثرات دوبالا ہو جاتے ہیں۔

ے زیست میں وہ لمحہ بھی آیا
دل آباد آنکھیں ویرانے
کب تک ساتھ ہمارا دیں گے
خوابوں کے یہ تانے بانے
غم کی گھڑیاں کیف بداماں
خوشی کے لمحے جھوٹے بہانے

یہاں ڈاکٹر وحید قریشی کے تخلیقی جوہر کا احساس پوری طرح اُبھر کر سامنے آ جاتا ہے۔

ے بجمالِ ماہِ سیمیں غزلم گرفت رنگی
نہ بذوقِ ہم نشان نہ بذوقِ دوستداراں

بشود که دردِ ہجراں سرو سینہ را بسوزد
گل نغمہ گر نیا بم زمعنیٰ بہاراں

شاعر نے تجسیم کو اس طرح پیش کر دیا ہے کہ پیکر ڈھل کر سامنے آ جاتے ہیں ان کے نازک اور لطیف جذبات تصویروں میں ڈھل کر صفحۂ قرطاس پر پھیل جاتے ہیں۔ مکالماتی انداز ان تصویروں میں جان ڈال دیتا ہے اور ان کو حرکت و حرارت سے آشنا کرتا ہے۔

نفس کی آمد و شد پہ ہے انحصارِ حیات
طلسم خانۂ ہستی کی دل کشی پہ نہ جا
یہ راگ رنگ کی محفل سراب ہے اے دِل
فسردہ زیست کے سانچوں میں ڈھل رہا ہے جہاں

ڈاکٹر صاحب کی جاندار Diction ان کے مفاہیم کو اُجاگر کرنے میں بھی بڑی مددگار ثابت ہوتی ہے۔ وہ فارسی ہندی، پنجابی کے الفاظ کو بڑی مہارت سے یکجان کر کے تصوراتی پری تخیل کے بل بوتے پر تخلیق کرتے ہیں لیکن اس عمل میں لفظ ان کا ساتھ دیتے ہیں اور نئی تراکیب ڈھل کر معانی و بیان کے دروازے کھولتی چلی جاتی ہیں۔ ان کے مصرعے ڈھلے ہوئے اور لفظی صناعی کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔

ع یہ تو ہے یا سرِ گلزار ہفت رنگ دھنک (صفحہ ۳۲)

ع رنج ہائے فشارِ تنہائی (صفحہ ۷۷)

ع جام خود تندیِ صہبا سے چھلک جاتے ہیں (صفحہ ۸۱)

ڈاکٹر وحید کے کلام کی دلآویزی کا سبب تشبیہ و استعارے کی کشش ہے۔

ع اور سورج میں ڈوبے ہوئے شبنم کے دیے (صفحہ ۱۹)

ع لرزتے دریا کی سطحِ درخشاں پُر آنسوؤں کی جھڑی لگتی ہے (صفحہ ۳۸)

ے کاروانِ شامِ غم

سیل ہستی یم بہ یم

ع فتیلہ اپنی زبان کھولے فضا کی ظلمت کو چاٹتا ہے۔

مراعاۃ النظیر کا برمحل استعمال ملاحظہ ہو۔

ے ترے جمال کا اے دوست یہ اثر تو نہیں

چمن میں حسنِ بہاراں گلوں میں باس بہت ہے

(صفحہ ۳۱)

ے آہ و فغاں و نالہ و سوزد غم و الم

از دستِ دوست ایں ہمہ سامانم آرزوست

(صفحہ ۸۵)

تلمیح کا برمحل استعمال کلام میں فصاحت و بلاغت پیدا کرتا ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی تاریخ کے استاد اور فارسی کے عالم ہیں۔ کوئی روایت ان کی نظروں سے پوشیدہ نہیں۔ انہوں نے بہت سی تلمیحوں کو کلام کا حسن بنایا۔

آدم، مسعود سعد سلیمان، حسان بن ثابت، فراعین، تاج محل، مہر النساء، مزدک، یزداں، اہرمن، مانی، موبد، وغیرہ۔

ے قیس و فرہاد کے قصے چھوڑے

اپنی روداد سنا دی ہم نے

(صفحہ ۳۰)

وحید قریشی نے چند داستانوی کرداروں کا ذکر بھی علامتی پیرائے میں کیا ہے اور یہ کردار غزل کی روایت سے بھی منسلک ہیں۔

ے ہیر پڑھتا ہوا خاموش چراگاہوں میں
کون بیتے ہوئے لمحوں کو صدا دیتا ہے

(صفحہ ۱۵)

اگر نقدِ جان کا فکری جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اِس مجموعے میں ڈرامائی انداز، خودکلامی مکالماتی انداز، تلمیحی واساطیری رنگ رومانیت، ڈرامائی تاثرات کے بوقلموں رنگ معاشرتی طنز، تقسیم کے حوالے سے جذبات، حسن ومحبت، اداسی وغم کی کیفیات، رجائی انداز، دیہاتی فضا کا رنگ، یاس و آس، محبوب کی جدائی جیسے متنوع موضوعات ملتے ہیں۔ فنی سطح پر ''نقدِ جاں'' میں تغزل، موسیقیت، تمثال گری، مؤثر لفظیات، اور تراکیب، بدیع و محاسن کا استعمال شامل ہے۔ ان کی شاعری پر اُردو، انگریزی، فارسی شاعری کی روایات کے اثرات بھی موجود ہیں۔ جو قدیم و جدید کا خوبصورت آہنگ بن کر نمودار ہوئے ہیں۔

ڈاکٹر وحید قریشی نے ''نقدِ جاں'' میں متنوع موضوعات کا اجاگر کیا ہے۔ سماجی زندگی کے گوناگوں حوالے ان کے ''نقدِ جاں'' میں جہاں قطعات، نظمیں، ددہے اپنی بہار دکھاتے ہیں۔ وہاں غزل جیسی ابدی اور کلاسیکی صنفِ سخن اپنی پوری رعنائیوں کے ساتھ موجود ہے۔ غزل جو اُردو شاعری کی جان اور آبرو ہے۔ اس سے ڈاکٹر وحید قریشی جیسے جید عالم اور ادیب کیسے منہ موڑ سکتے ہیں۔ انہوں نے اُردو اور فارسی دونوں زبانوں میں غزلیات کہی ہیں۔ جو وسیع تر موضوعات کا احاطہ کرتی ہی۔ ان کے ہاں حسن وعشق کی کیفیات وصل وفراق کی داستانیں، ماضی کی یادیں، عاشق کی ذہنی اور نفسیاتی کیفیات تمام تر فنی محاسن کے ساتھ موجود ہیں۔

ان کے ہاں محبت کی متنوع کیفیات ملتی ہیں۔ جو روایات سے ہم آہنگ ہیں کبھی سوز والم کے پیرائے میں کبھی حسن و جمال کو سراہتے ہوئے:

ے وہ سامنے ہیں تو دل کی ہے اور ہی کچھ بات
جھکی جھکی سی نگاہیں رُکی رُکی سی حیات!

(صفحہ ۲۵)

جذبہٗ محبت سے سرشار ہو کر وہ جمالِ دوست کی رنگینیاں یوں بیان کرتے ہیں۔

ؔ ترے جمال کا اے دوست یہ اثر تو نہیں
چمن میں حسنِ بہاراں گلوں میں باس بہت ہے

اِس دلکشی بیان کے ساتھ ساتھ لطافتِ فکر بھی موجود ہے۔ ان کے ہاں انانیت کا پہلو بھی نمایاں ہے۔

ؔ غم کے ہاتھوں (شکر خدا ہے) عشق کا چرچا عام نہیں
گلی گلی پتھر پڑتے ہوں ہم ایسے بدنام نہیں

(صفحہ ۲۹)

ان کے وصل کا خوشگوار بیان تو ہے مگر رجائی شاعر ہونے کی بناء پر ہجر کی تکلیف وہ باتوں کو فراموش کر دیتے ہیں۔

ؔ ہجر کی رات نہ یاد آئے گی
ناگوار تھی بھلا دی ہم نے

(صفحہ ۳۰)

اِس اعتبار سے ان کی شاعری رجائیت، لطف و انبساط اور نشاط و اہتزاز کی شاعری ہے۔ جذبے اور فکری کارفرمائی ہے خوشی اور غم دونوں کے اظہار میں تناسب اور توازن موجود ہے۔

لیکن ایک زیریں لہر کی طرح ساتھ ساتھ چلتا ہے اور تخلیقی قوت بن کر ابھرتا ہے من کی دُنیا کی اداسی کائنات کا سب سے بڑا سچ بن کر نمودار ہوتی ہے۔

ؔ می رودست گام دلی آواز
قافلہ ہائی سوز تنہائی
برسرِ ما قیامتی آورد
رنج ہائی فشارِ تنہائی

(صفحہ ۷۷)

ے یہ کائنات اگر دل کی ترجمان نہیں
اداس اداس سی ہے آج کیوں بھری برسات

(صفحہ ۲۵)

تاہم یہ اداسی قنوطیت پیدا کرنے کا سبب نہیں ہے۔ رجائی انداز حاوی رہتا ہے۔ جو انہیں سوچنے اور جینے کا نیا حوصلہ دیتا ہے۔

ے فریب بہاراں بھی ہے قبول ہمیں
کوئی نقیب تو آیا پیامِ فردا کا

(صفحہ ۳۲)

نظموں اور قطعات میں ڈرامائی انداز پیدا کر کے ڈاکٹر قریشی نے ایک نئی روایت کو پیدا کیا ہے۔ لیکن غزل میں مکالمے کا انداز ہی غالب کی روایت کا نیا انداز ہے۔ ویسے بھی غزل کے معنی گفتگو کے ہیں۔

ے نہ جا نہ جا کہ ابھی دل میں حزن دیاس بہت ہے
ذرا ٹھہر کہ طبیعت اداس بہت ہے

(صفحہ ۳۱)

ے کچھ اور بھی ہیں محبت کی مشکلیں اے دوست
یہی نہیں کہ مجھے تیرا اعتبار نہیں!

(صفحہ ۲۸)

اِس طرح شاعر غم اور تنہائی کو شکست دینے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ ان کے کلام میں خودکلامی بھی اسی تنہائی کو ختم کرنے کی بازگشت ہے۔

؎ چٹک رہی ہیں تصور کی سینکڑوں کلیاں
سکوتِ شام میں کچھ گنگنا رہا ہوں میں

(صفحہ ۲۶)

ڈاکٹر وحید قریشی نے داخلیت اور خارجیت کو ہم آہنگ کر دیا ہے۔ ان کے ہاں خارجی واقعات کے بیان میں بھی داخلیت کا رنگ جھلکتا ہے۔ ان کی غزل کلاسیکیت اور جدیدیت کا حسین سنگم ہے۔ انہوں نے قدیم جام میں نئی شراب ڈالی ہے اور مضامینِ تازہ پیش کر کے جدت کی نئی راہیں ہموار کی ہیں۔

ڈاکٹر وحید قریشی کی غزل سے رسم پارینہ کو مٹانے اور منظر کو نئی کھڑکی سے دیکھنے کا انداز نمایاں ہے وہ تخلیق کے آتشِ پنہاں ہی نہیں بلکہ اس کے کرب سے بھی آشنا ہیں۔ انہوں نے دردمندی کو شعر کے پیکر میں داخلی وصف کی طرح سمو دیا ہے۔

؎ از جمالت بہار تازہ دمید
اے نگار فسونِ رعنائی
از تو آید زگل نمی آید
از ہم طرفگی و زیبائی!

(صفحہ ۷۷)

انہوں نے غزل میں تجربے کی تفصیلات پیش نہیں کیں بلکہ اس کی روح کو شامل کر لیا ہے اس طرح قاری بھی ان کے ساتھ شامل ہو جاتا ہے یہ عناصر صرف غزلیات میں نہیں بلکہ ان کے مجموعوں کے سارے کلام میں ملتے ہیں۔ معاشرتی اور سیاسی شعور کی جھلکیاں ان کی نظموں میں ہر جگہ ملتی ہیں۔ تمثال اور ڈرامائی تاثر نے آغا حشر کے تھیٹر کی یاد تازہ کر دی ہے۔ مکالماتی انداز اس قدر انوکھا ہے کہ فکری سطح پر ان کو پختگی عطا کرتا ہے اور ان کی بصیرت کو نئے حقائق سے ہم آہنگ کر دیتا ہے۔ جدید طرزِ احساس کے ساتھ ساتھ جدید دور کے استعارے ملتے ہیں جو قدروں کے زوال کو بڑی خوبی سے بیان کر دیتے ہیں۔

الواح کا فنی و موضوعاتی جائزہ

عارف عبدالمتین لکھتے ہیں:

> ڈاکٹر وحید قریشی کی شاعری آسمانِ شعر پر ایک ایسی قدرتی دھنک کے متماثل ہے جس میں روح، وطن، ملّت، انفس، آفاق، جمال اور استمرار کو ان سات رنگوں کا اعزاز حاصل ہے جن سے یہ نظرافروز دھنک متشکل ہوئی ہے۔ روح اس معتقداتی اساس کا تعین کرتی ہے جسے توحید و رسالت سے استحکام میسر آتا ہے۔ جو کتاب کے نام، الواح، کی وساطت سے بھی اپنے وجودِ کلیسی کا ادراک بخشتی ہے۔[۲]

''الواح'' ڈاکٹر وحید قریشی کا دوسرا مجموعہ شاعری ہے جو ''قرطاس'' پبلشرز کے زیرِ اہتمام ۲۴ اگست ۱۹۸۴ء کو فیصل آباد سے شائع ہوا یہ سات حصوں پر مشتمل ہے جبکہ اس کی ضخامت ۸۰ صفحات ہے۔ اس شعری مجموعے کا فلیپ عارف عبدالمتین نے تحریر کیا ہے۔ کتاب کا انتساب اُردو کے نام کیا گیا ہے۔ اختتامیہ کے زیرِ عنوان ڈاکٹر انور سدید نے وحید قریشی صاحب کی شاعری کا تجزیہ کیا ہے۔ اس مجموعے کی تزئین و آرائش کا اہتمام زبیدہ حیٔ نے کیا ہے اور کلر سکیم راجی کے دیدہ زیب رنگوں کا کمال ہے۔ اس مجموعے میں پنجابی کلام بھی ہے اور سنجیدہ اُردو نظمیں، غزلیں، دوہے اور طنز و مزاح بھی۔

اِن کے کلام میں جذب و سرور بھی ہے اور فکر کے مختلف پہلو بھی۔ تناسب و توازن نے ان کے کلام کو ایک الگ شان عطا کر دی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے کلام میں پنجابی، اُردو، ہندی، فارسی کے نامانوس الفاظ کو بڑے سلیقے سے برتا ہے۔ لیکن ان میں اپنائیت کی ٹھنڈک پیدا کر دی ہے جو ان کے اسلوب اور قلم کا کمال ہے ''الواح'' کے شعری محاسن بے شمار و بیکنار ہیں انہوں نے ترکیبات کا عمدہ استعمال کیا ہے۔ بے معنی اور عامیانہ الفاظ کی دور دور تک شکل نظر نہیں آتی۔ ان کا کلام زبان و بیان کی تمام خوبیوں سے آراستہ ہے۔ موضوعاتی اعتبار سے ان کی غزلیات میں حسن و عشق کی کیفیات مثلاً فراق، رنج و الم، وصال، محبوب کا حسنِ دلآرا اور عاشق کی بے بسی سب کیفیات کا تذکرہ بڑے مؤثر اور مکمل انداز میں ملتا ہے۔ انہوں نے اقبالؔ، حالؔی اور فیضؔ صاحب کی روایات کی پاسداری کی ہے اور غزل کے کینوس

میں عشق و عاشقی کے علاوہ سیاسی، سماجی مسائل کے رنگ بھی بھرے ہیں۔ بات یہیں تک ختم نہیں ہوئی بلکہ ڈاکٹر صاحب نے دوہے، کے پیرائے میں لطیف طنز کا اسلوب بھی اپنایا ہے اور عہدِ حاضر کی کمزوریوں کو نشانہ بنایا ہے۔ جس سے ان کے کلام کی تاثیر میں اضافہ ہوا ہے۔ ان کا کلام تہذیبی پہلوؤں سے وابستہ ہے ان کے موضوعات میں وسعت اور گہرائی ہے۔ قدیم و جدید کا امتزاج ہے۔ ''نقدِ جاں'' اور ''الواح'' کی اشاعت کے درمیان سولہ سال کا عرصہ محیط ہے لیکن اس عرصے میں شاعر کی فکری ریاضت اس کے شعر وسخن کی پختگی بن کر ظاہر ہوئی ہے۔

انور سدید ڈاکٹر وحید قریشی کے کلام کا محاکمہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

کچھ عرصہ قبل ڈاکٹر وحید قریشی کی شاعری کی پہلی کتاب ''نقدِ جاں'' شائع ہوئی تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ہمالہ کے دامن سے اچانک آبِ صفا کا چشمۂ شیریں پھوٹ نکلا ہو۔ اہل ادب ڈاکٹر صاحب کو ایک بلند پایہ نقاد، حقیقت بین محقق اور نکتہ جو ادیب کی صورت میں دیکھنے کے عادی ہو چکے ہیں۔۔۔ان کی سب حیثیتیں اتنی مستحکم ہیں کہ جب ان کی شاعری کی جہت سامنے آتی ہے تو ان کی طرف حیرت سے دیکھے بغیر رہا نہیں جاتا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ڈاکٹر وحید قریشی نے شاعری کو اپنے اظہار کی غالب صنف کے طور پر قبول نہیں کیا۔۔۔ان پر بے شمار ایسے تخلیقی لمحات وارد ہو چکے ہیں جب رموزِ دروں لرزتے، ڈولتے جذبوں کی حیریلی چھلنی سے مقطر ہو کر خود بخود اشعار کی صورت اختیار کرنے کے لیے بیتاب ہو جاتے ہیں۔[۳]

اپنے ایک مضمون ''الواح'' وحید قریشی کا نیا کلام میں ڈاکٹر سید عبداللہ فرماتے ہیں:

نقدِ جاں کی اشاعت نے یہ نقش قلوب پر راسخ کر دیا تھا کہ وحید قریشی پختہ کار شعراء ادب کی صفِ اول میں ہیں مگر شاید مصروفیت اور حجاب مانع رہا کہ کھل کر شاعری کے میدان میں نہیں اُترتے لیکن اب دوسرا مجموعہ کلام الواح، شائع ہو کر سامنے آیا۔ تو معلوم ہوا کہ مصروفیات کے باوجود وحید شاعری کے لیے وقت نکال ہی لیتے ہیں۔[۴]

شاعر کے ہاں وطن سے محبت کا عنصر ''الواح'' کے مصرعے میں نمایاں ہے۔ اس کے علاوہ ان کی

خواہش ہے کہ معاشرہ ایک مثالی معاشرہ بن کر اُبھرے جن میں ہر انسان کو اس کے حقوق میسر ہوں۔ مذہبی شعائر معاشرے کا رواج اور زینت بنیں اور صحیح معنوں میں اسلامک سٹیٹ کا قیام عمل میں آئے۔

''الواح'' کا آغاز حمد سے ہوتا ہے جس میں شاعر نے اپنے مخصوص رنگ و آہنگ کی مدد سے خدا اور مخلوق کے مابین رابطے اور تعلق کا اظہار کیا ہے۔

اے بستی کے لوگو!
تم نے سوچا
وہ بھی ایک خدا ہے
اس کے ہاتھ جزا و سزا ہے
جو چاہے سو کرتا ہے
ہر اک اس سے ڈرتا ہے
اس کا روپ امر ہے
سب سے بالاتر ہے

سب پہ ہے تیرا کرم اور بے طلب!
اے مرے رب، اے مرے دشمن کے رب
تیری رحمت دشت و دریا کو محیط
دشت و دریا سے ورا میری طلب!

(حمد صفحہ ۱۱)

''الواح'' میں مختلف زبانوں کا رچاؤ اس مجموعے کو ہفت رنگ بناتا ہے۔ اس میں ادبی چاشنی پیدا کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر وحید قریشی کی قلم پر دسترس کو بھی اجاگر کرتا ہے۔ نعت جو کہ نبی پاکؐ کے عشق

میں سرشار ہو کر لکھی گئی ہے۔ پنجابی زبان میں ہے۔ شاید شاعر کی خواہش یہی ہے کہ اپنے دل کی آواز کو روح کی گہرائیوں کے ساتھ ہم آہنگ کر دے اور مادری زبان میں نبی پاکؐ سے والہانہ محبت کا اظہار کر دے۔

(۱)

میریا ربا!
میں کیہ دساں
دل وچ کئی تاہنگ
شہر نبیؐ دل جا کے وساں
اپنا حالہ سناواں
روضے تے کرلاواں
.... نبیؐ جی آن ملو!

(۲)

شہر مدینہ دور دراڈے
لمے پینڈے۔ لیکھ اساڈے
دوروں حال سُناواں
اپنے شہر دیاں گلیاں دا
میری جند نمانی
ترلے لیندی
ہر دم کہندی

.... نبی جی آن ملو

(نبیؐ جی آن ملو۔ صفحہ ۱۲ تا ۱۵)

ڈاکٹر وحید قریشی کی زندگی کی ایک بڑا حصہ ان مراکز کے قریب گزرا جو علم و ادب اور تحریک پاکستان کی تکمیل کے مختلف مراحل سے ہو کر گزرے تھے۔ انہوں نے نظریہ پاکستان کے حوالے سے بھی نثر میں مختلف کتب تصنیف کیں لیکن شاعری میں بھی جذبۂ حب الوطنی میں کمی نہیں آئی اور ڈاکٹر صاحب نے وطن سے لگاوٹ کا یہ جذبہ اپنی نظموں کی شکل میں ''الواح'' میں پیش کیا۔ وہ اس وطن اور اس کی خاص اقدار سے محبت کرتے ہیں۔ ان کے ہاں خاک وطن اکسیر کی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ اس کے ایک ایک ذرے کو انس و محبت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

خاک وطن کا اک اک ذرہ

کیا کوچہ کیا برزن

قریہ قریہ روشن

روشن دھرتی سب سے پیاری

اس کی خاک اکسیر

پاؤں کی زنجیر

دھرتی دھرتی گھوم چکا ہوں

یہ زنجیر طویل

الفت کی تکمیل

خاکِ عرب سے خاکِ وطن تک

ایک سنہرا روپ

ایک تجیلی دھوپ ۵

حُبِ الوطنی ڈاکٹر وحید قریشی کے مزاج میں رچی بسی ہے وہ نہ صرف اپنے وطن کے در و دیوار اور سرحدوں سے محبت کرتے ہیں بلکہ اس کی نظریاتی سرحدوں کو بھی چاہتے ہیں اور ان کو پوجتے ہیں وہ یہ چاہتے ہیں کہ ان کے کلام کے ذریعے پڑھنے والوں تک یہ پیغام پہنچے کہ وطنِ عزیز کس مقصد کے لیے بنا۔ اب اس

کی بقا کن بنیادوں پر استوار کی جا سکتی ہے۔ یہ محبت انہیں وطنِ عزیز کے ہر گوشے سے ہے مثلاً ریڈیو والوں کی فرمائش پر ایک نظم لکھی ''کشمیر'' جس میں ارضِ کشمیر کی تلخیوں اور اذیتوں کو یوں اُجاگر کرتے ہیں۔

ہواؤں کی زد میں شفق کا نکھار

خنک سبزہ زار

بہاروں پہ چھایا اداسی کا جال

چمن خستہ حال

خراماں بگولے درندوں کی فوج

اٹھی تند موج

نہ کانٹے نہ کلیاں نہ دشتِ جنوں

فقط جوئے خوں

بدلتی ہے رت مٹ گئے غم کے راگ

کلیجے میں آگ

بموں کے دھماکے طلسمی فضا

نیا حوصلہ

مہکنے لگی سرزمینِ وطن

چمن در چمن

پہاڑوں پہ مہکے امیدوں کے پھول

چھٹی ان کی دھول

ابھی زندہ ہے کاشمر کی زمیں

کوئی دھڑکا نہیں

(کشمیر صفحہ ۳۵، ۳۶)

ڈاکٹر وحید قریشی امتِ مسلمہ کے درد اور مسائل کو ہر جگہ موضوع بناتے ہیں۔ ان کی سوچ کا کینوس بے

حد وسیع ہے۔ ان کے ہاں تفکر اور تدبر ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ عارف عبدالمتین ان کے کلام کے اس پہلو کا یوں جائزہ لیتے ہیں۔

> ’’(الواح‘‘ ملت امتِ مسلمہ کو اس کے تاریخ، تہذیبی اور ثقافتی تناظر میں ہمارے روبرو لانے کی ذمہ داری قبول کرتی ہے۔ انہیں سے ان تلازمہ ہائے خیال کی نشاندہی ہوتی ہے جو شخصیت کے اعماق سے ابھر کر اسے انفراد فراہم کرتے ہیں۔ فریب آفاق دور کر کے تمام اسے علائق پر محیط ہے جو انسان کو اس جغرافیائی تحریر کے احترام کے جلو میں غیر جغرافیائی لامحدود سے ہمکنار کرتے ہیں۔‘‘

وہ مسلمان ممالک پر یہودی استعمار کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں۔ ایسے میں ان کے قلم کی روانی اور جوش وخروش مزید بڑھ جاتا ہے۔

عارف عبدالمتین فلیپ۔ الواح

افغانستان پر روس کے غاصبانہ قبضے اور ظلم و بربریت نے جس صورتحال کو جنم دیا وہ خاصی دلخراش ہے۔ ڈاکٹر صاحب اپنی نظم ’’بستی کے لوگوں کے لیے ایک انمل بے جوڑ نظم‘‘ میں یوں خامہ فرما ہیں۔

’’دشت اور دریا

صحرا ہی صحرا

سونے پڑے ہیں

اور لُٹ چکے ہیں

مرتے ہیں بیٹے

قسمت کے ہیٹے

روتی ہیں مائیں

کس دیس جائیں

بستی کے لوگو!

بستی کے لوگو!''

جس طرح ''نقدِ جاں'' میں شاعر نے فطرت کی جوان اور بھرپور تصویر کشی کی ہے۔ بالکل اسی طرح اَلواح میں بھی یہ رجحان پہلے سے کہیں بڑھ کر موجود ہے۔ وہ نہ صرف مظاہرِ فطرت کے قریب ہیں۔ بلکہ ان سے ذہنی اور قلبی تعلق بھی استوار کرتے ہیں اور کئی معنی خیز نتائج بھی اخذ کرتے ہیں۔ وہ تفکر اور استدلال کے قائل ہیں۔ شاعری ان کے سوالوں کے جواب مہیا کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ وہ زمانے اور وقت کو نظر انداز کر کے آگے بڑھنے کو ارتقاء کا نام نہیں دیتے۔ بلکہ وقت ان کے نزدیک طاقت کا مظہر ہے۔ جس کا بہاؤ صدیوں سے جاری و ساری ہے اور انسانیت کی کشتی اس کی لہروں پر ڈولتی آگے کو بڑھتی جا رہی ہے۔ لیکن کبھی کبھار وقت کے اس دیوتا کے سامنے سرنگوں ہونے کے علاوہ کوئی چارہ کار باقی نہیں رہتا۔ کیونکہ ہر پچھلا منظر نئے منظر نامے کا حصہ بن رہا ہے اور وقت کی پن چکی صدیوں سے رواں دواں ہے۔ مثلاً نظم ''لاد گیا بنجارہ'' میں وقت کی قوت کا جو رُخ ڈاکٹر صاحب نے دکھایا ہے وہ نظیر اکبر آبادی کے تصورِ وقت اور جزا و سزا کے انتہائی قریب ہے۔ اس مہیب تسلسل کو روکنے والا کوئی نہیں۔ ساری کائنات اس گردش کے تابع ہے۔ جس کا نام وقت ہے۔

اے بستی کے لوگو!

تم نے روکا

تم نے ٹوکا

وقت کہاں رُکتا ہے

حرص و ہوا کے کتنے منظر

آشاؤں کے کتنے دفتر

ظلمتوں کا پشتارا

لے کر اِک بنجارہ

کہاں سرنھارا

وقت کا دھارا

۔۔۔ ڈوب گیا

(لاد گیا بنجارہ۔۳۲)

اس کائنات کے حسین و جمیل رنگوں کو اپنے اندر سمونے کا نام گردشِ دوراں اور زمانے کا تغیر ہے۔ ایسے میں ڈاکٹر وحید قریشی کا تخیل انہیں ورجینیا وولف کے تصور ''شعور کی رو'' اور مجید امجد کے تصورِ وقت کے قریب کر دیتا ہے۔ جہاں سناٹا ہے مگر ایک اندرونی سفر ہے جو جاری و ساری ہے اور وہ وقت کا تسلسل ہے۔ یہاں مقدر وقت ہے۔

''ابھی یاد کے ہاتھ پھیلے ہوئے ہیں

ابھی سروِ آزاد بے قیدِ امروز و فردا رہے گا

ابھی رات آغوشِ گیتی سوئی ہوئی ہے

مقدر مگر جاگتا ہے

کہیں نقرئی گھنٹیاں۔ کارواں

کہیں آہوانِ ختن راہ پیما

کہیں منزلِ زندگی، اک سلگتا ہوا آرزو کا دھواں

ازل سے ابد تک وہی داستاں''

فنا کا یہ تصور نیا نہیں۔ میر تقی میر، غالب اور اقبال نے وقت اور فنا و بقا کے یہی تصورات اپنے اپنے اسلوب میں پیش کیے تھے۔ اس بھیانک تیرگی اور خوف سے جو وقت کے تسلسل سے پیدا ہوتی ہے۔ صرف ایک چیز نجات دے سکتی ہے اور وہ ہے مادرِ فطرت کی مہرباں آغوش جس نے کیٹس اور شیلے کے دردِ دل کو اپنے دامن میں پناہ دی۔ ورڈز ورتھ کو بہار کا جانفزا نغمہ کوئل کی آواز میں سُنایا اور بودلیر کو بادلوں کی سیر کی خواہش

سے ہمکنار کیا۔ ڈاکٹر صاحب کی نظم بادل کا ٹکڑا ملاحظہ ہو۔

بادل کا ٹکڑا

کس کس پہ برسے

نکلا ہے گھر سے

گلشن سے گزرا

کلیوں نے روکا

شاخوں نے ٹوکا

سُونی پڑی ہے

صحرا کی دھرتی

کیونکر سنورتی

سب دشت وصحرا

پھیلے کے پھیلے

میلے کے میلے

بادل کا ٹکڑا

کس کس پہ برسے

نکلا ہے گھر سے

(بادل کا ٹکڑا، صفحہ۔۲۴۔۲۵)

فطرت کے مختلف مناظر میں وقت سحر اپنے تقدس اور پاکیزگی کے لیے مشہور و معلوم ہے۔ حیرت اور خوشی کی بات یہ ہے۔ کہ ڈاکٹر صاحب نے جس جذبے کی صداقت کو رُوح کی گہرائیوں میں ڈوب کر پیش کیا۔ وہ پیش کرنے کے لیے مادری زبان کا سہارا لیا۔ مگر نبی پاکؐ کی محبت کا اظہار اسی مادری زبان میں صبح کے وقت کے تقدس کا اظہار بھی ہے:

سُتی سیج نیں لے انگڑائی

بھید رات دا پایا

لے کے شمکاں سورج کولوں

نیندر جال اُڈایا

کہیں لگی تریل پُھلاں دی

ماریاں سورج لشکاں

پھُل گلاب توں نکلن لاٹاں

ہس ہس کھڑیاں کلیاں

باغ نے چھوٹی کہانی دن دی

دانے بھرے ہنگارے

(سویر ویلا، صفحہ۔۴۵)

ڈاکٹر وحید قریشی ایک ممتاز تاریخ دان ہیں۔ ان کی علمی شہرت کے لا تعداد پہلو اور زاویے ہیں اور لیکن ان تمام جہتوں کے پسِ منظر میں ایک بات نہایت اہم ہے اور وہ یہ کہ تخلیقی تناظر سے وہ کبھی دور نہیں رہے۔ ان کے اندر کا شاعر ان کی تمام تر حسیات کو بیدار رکھتا ہے اور ان کی سوچ کو نہ صرف ترفع بلکہ نزاکتِ خیال بھی عطا کرتا ہے۔ کشمیر کے عوام پر ظلم و ستم کا قصہ ہو یا افغانستان پر مظالم اور بربریت کی داستانِ دل خراش، پاکستان کے سیاستدانوں کی کارستانیاں اور اپنوں کی ریشہ دوانیاں ہوں یا غیروں کی ستم ظریفیاں ڈاکٹر وحید قُریشی کا قلم ہر رہ گزار پر یکساں رفتار سے دوڑتا چلا جاتا ہے۔ قلم کی اس برق رفتاری کی وجہ یہ ہے کہ اس کے پیچھے ڈاکٹر صاحب کا براق ذہن ہے۔ مطالعہ کی رفعت اور رنگا رنگی ہے۔ اپنی مذہبی، روحانی اور اخلاقی اقدار سے محبت ہے۔ جو ہر قدم پر ان کے قلب و ذہن کو جلا بخشتی ہے۔ بحیثیت مسلمان ڈاکٹر صاحب کا عقیدہ انتہائی پختہ ہے اور وہ ہر واقعے کو اسی نظر سے دیکھتے ہیں کہ قدروں کے پیمانے پر یہ واقعہ کس طرح پرکھا جا سکتا ہے۔

وہ شعوری طور پر نظموں کے لیے ایسی تکنیک کا انتخاب کرتے ہیں کہ وہ قاری کو دعوتِ فکر دیں۔ ان کے جذبات کا اظہار اور تطہیر ثابت ہوں۔ ساحر لدھیانوی کو ''تاج محل'' عظیم الشان یادگارِ محبت نے اُداس کر دیا۔ اس نے مادیت اور غربت کے درمیان اس کو سوالیہ نشان کے طور پر اُبھارا۔ کہ کیا مادیت کی یہ علامت غریب کے جذبات کا مذاق اُڑا رہی ہے؟ ڈاکٹر صاحب تاریخ کے جھروکے سے تاج محل کو دیکھتے ہیں تو ان کو احساس ہوتا ہے کہ زندگی فنا پذیر ہے۔

یہ تاج، یہ بہارِ ناز

یہ سنگ و خشت کا کفن

سفید مرمریں بدن

گزشتہ عظمتوں کی یاد

۔۔۔سو رہی ہے زندگی

۔۔۔رو رہی ہے زندگی

(تاج محل، صفحہ۔ ۱۸)

وہ اپنے عہد اور اس کے المیوں سے بے نیاز نہیں ہیں۔ ان کے خیال میں یہ سب زوال آمادہ تہذیب کا شاخسانہ ہیں۔ اپنے تہذیب و تمدن سے بے نیازی اور بے زاری نے مسلمانوں کو اس خیال پر آمادہ کیا کہ وہ تہذیب یورپ کی کورانہ پیروی کریں۔ لیکن ڈاکٹر وحید قریشی نے دیگر اکابرین، علماء اور فضلاء کی طرح زمانے کی نبض پر ہاتھ رکھا اور اصل مرض کی تہہ تک پہنچے اور وہ یہ ہے کہ اپنے مذہب سے بیگانگی، یورپ کی قدروں کا ایشیاء اور خاص طور پر برصغیر پاک و ہند میں فروغ ایسے رُجحانات ہیں جو دور رس نتائج کے حامل ہیں۔ قوموں کی زندگی میں ایسے فیصلوں کی بے حد اہمیت ہوتی ہے۔ جو بغیر سوچے سمجھے لاشعوری انقلاب کے ذریعے ہو جاتے ہیں اور خبر اس وقت ہوتی ہے۔ جب پانی سر پر سے گزر جاتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب سماجی اور عصری تقاضوں کے ساتھ منسلک ہیں ان سے کبھی بے خبر نہیں رہے۔ وہ سیاسی خلفشار سے بھی آگاہ ہیں اور سماجی انتشار سے بھی۔

پاکستان جیسا نوزائیدہ ملک اپنی ابتدائی زندگی ہی میں کئی جنگوں اور بیرونی حملوں کا شکار رہ چکا ہے۔

لاہور جو کہ سرحدی شہر بھی ہے۔ اس پر اس جنگ نے جو ۱۹۶۵ء میں لڑی گئی۔ کئی اثرات مُرتب کئے۔ یہاں تاریکی، مایوسی اور غم و الم کا استعارہ لے کر اُبھرتی ہے اور بلیک آؤٹ بن کر پوری فضا کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔

لاہور کے شہر کی خموشی!
سناٹوں کے رُوپ میں ڈھلی تھی
بجلی کی اُداس روشنی تھی
کھمبے سے لپٹ کر سو گئی تھی
اک شہر تھا جس میں زندگی تھی
اک خواب تھا جس میں دلکشی تھی
یا درد کی رات آ گئی ہے
یا دُکھ کی برات آ گئی ہے

" " "

توپوں کے دہاں میں ریزے تھے

وقفوں سے فضا میں تیرتے تھے

طیاروں کا شور تھم چکا ہے

توپوں کا طلسم ٹوٹتا ہے!!

(نشاطِ آرزو، صفحہ۔ ۲۲،۲۳)

ڈاکٹر وحید قُریشی کے کلام میں جا بجا سماجی، سیاسی، عمرانی اور معاشی حالات کے اشارے ملتے ہیں۔ جو اُن کے مخصوص نظریات کے ترجمان ہیں۔ وہ دو قومی نظریئے پر کامل ایمان رکھتے ہیں اور ان کے ملی نظریات اس امر کے صریح ترجمان ہیں۔ نظم تشخص کی تلاش میں ڈاکٹر وحید قُریشی کے خیالات وتصورات ملاحظہ ہوں۔

(۱)

دور دیس کے رہنے والو

دور دیس کی خیر

اپنا جسم ہے غیر

اپنی ذات سے بیر

نگر نگر کی سیر

(۲)

دیوی کے چرنوں سے پھوٹی

اک طوفانی لہر

ریزہ ریزہ ہو کر ٹوٹی

سرحد کی اک نہر

دل کے اندر، دل کے باہر

ایک دھوئیں کا شہر

اب جاؤں تو کس نگری میں

کون سی بستی نور

پاؤں کی زنجیر بنا ہے دھرتی کا منشور

میں غم دیدہ میں رَنجُور

اپنے آپ سے دُور

کٹا پھٹا دستور (صفحہ ۲۶۔۲۷)

ادب کو پروپیگنڈے سے الگ کرنے والی چیز قوتِ متخیلہ ہے جسے چیزِ دگر کا نام دیا گیا ہے۔ ڈاکٹر وحید قُریشی سیاسی موضوعات کو بھی اپنی حسِ لطیف کی مدد سے ادبی چاشنی عطا کر دی ہے۔ ان کا کلام پڑھ کر دردمندی کے تاثرات اُبھرتے ہیں اور بے حسی کا چلن دُور ہوتا جاتا ہے۔ فیض احمد فیض سے احمد فراز تک تمام شعرا نے آمریت کے خلاف لکھا اور اس کی پاداش میں قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں۔ لیکن ڈاکٹر وحید قُریشی نے ان موضوعات کو بھی بڑی نزاکت سے در پردہ پیش کیا۔ کسی کا چہرہ تو اُجاگر نہ ہوا لیکن کردار اُجاگر ہو گیا۔ ایک نظم میں فرماتے ہیں۔

محفل کے اندر

جھومیں قلندر

عرفاں کی دنیا

جلوہ ہی جلوہ

صحرا بہ صحرا

دنیا بہ دنیا

تم بھی دو رنگے

ہم بھی دو رنگے

بستی کے لوگو

بستی کے لوگو! (صفحہ۔۴۰)

رحمٰن اور شیطان اور خیر و شر کی آویزش روزِ ازل سے برسرِ پیکار ہے۔ ڈاکٹر وحید قُریشی نے اپنی کئی نظموں میں انتہائی بلاغت سے اِس ظلمتِ شب کے چہرے سے نقاب اٹھائی ہے اور عصرِ حاضر کے تمام المیوں کو استعارے عطا کر کے قابلِ قبول بنا دیا ہے۔ جنہیں پڑھا جا سکتا ہے۔ ان پر سوچا اور غور کیا جا سکتا ہے۔ خالات حاضرہ کا کوئی پہلو ہو یا زندگی کا کوئی شعبہ ہو۔ ڈاکٹر صاحب کی بصیرت سے کوئی شے نظروں سے دُور نہیں ہو سکتی۔ مغرب سے آنے والی ظلمت کی آندھی ہو یا رُوح کے اجالوں کو چھین لینے والا استبداد۔ ڈاکٹر وحید قُریشی نے ہر موضوع کو اپنایا ہے اور اسے ایک نیا رنگ اور آہنگ دے دیا ہے۔ یہ بصیرت عہد حاضر کے ادیبوں اور دانشوروں میں موجود نہیں جو صرف درباری ادب تخلیق کرتے اور واہ واہ پر جان دیتے ہیں۔

ے دوروں عقل دے تھم سیہا پن

میرے ملک دے وڈے لوک

جاں میں نیڑے ہو کے ڈٹھا

شاہ دولہ دے چوہے لوک!!

(شاہ دولہ دے چوہے، صفحہ۔ ۴۶)

ڈاکٹر صاحب کا تصورِ غم رجائی انداز سموئے ہوئے ہے۔ اس غم میں تخلیقی قوت بھی ہے۔ عصرِ حاضر سے گہری وابستگی اور شعور بھی ہے۔ یہ اجتماعی محرومی کا غم ہے۔ وہ محرومی جو اپنے لوگوں کو اپنے ہی وطن میں ملی ہے۔ ملکی و معاشرتی اور سیاسی سطح پر ابتری نے ڈاکٹر صاحب کی منظومات کو غم اور اداسی بخشی ہے۔ یہاں غم اور اذیت کا اظہار تو ہے۔ لیکن امید کی ہلکی اور مدہم سی لہر بھی اس غم کے دریا کی تہہ میں موجزن ہے۔ یہاں شہر، دھواں، سنسار، سکوت، سرد پروا، تیرگی جیسے استعارے جہاں شاعر کے موڈ کے غماز ہیں۔ وہاں ان کے اردگرد کے ماحول، معاشرتی اقدار کے انہدام اور نظریات انتشار کا مظہر بھی ہیں۔

ہر سمت فضا میں تیرگی تھی

تارے تھے خموش اور گریاں

چاند اپنی اُداسیوں میں غلطاں

دنیا میں سکوت رچ گیا تھا

چلتی تھی غموں کی سرد پروا

اک گہرا جمود ہر طرف تھا

دل تھا کہ یونہی دھڑک رہا تھا

(نشاطِ آرزو، صفحہ ۲۱، ۲۲)

یہ غمِ جہاں اور غمِ ذات کہیں آگے بڑھ کر غمِ اہلِ بیعت کا رُوپ دھار لیتا ہے۔ یوں ہی معرکۂ خیر و شر ہر دور میں ہوتا رہا ہے اور ہوتا رہے گا۔ وہی کرب و بلا کا معرکہ انسانیت کو اب بھی درپیش ہے۔ مثلاً ''الواح'' میں ایک نظم ہے۔ ''کربل کا میدان'' جس کا ڈاکٹر صاحب نے پنجابی ترجمہ بھی پیش کیا ہے۔ شر انگیزی اور کفر و استبداد کا دائرہ کربلا کے میدان تک محدود نہیں رہا۔ آج بھی معاشرے میں اس کی بھیانک تصویر دیکھی جا سکتی ہے۔

کس کو سناؤں

کس کو بتاؤں

آل نبیؐ پر جو بیتی ہے

بیتی ایک جہاں

یہ دنیا یہ میری دنیا

کربل کا میدان''

(کربل کا میدان، صفحہ ۴۱)

ڈاکٹر صاحب کی شاعری میں لہریں مارتا غم شاعر کا اپنا غم بھی سہی۔ مگر یہ آج کے بے چہرہ فرد کا غم بھی ہے۔ جو تشخص کی تلاش میں مارا مارا پھرتا ہے۔ باہر کوئی منظر اس کے غمِ دل کا ترجماں نہیں ٹھہرتا۔ ان پھیکے رنگوں میں شہر سے اٹھتا دھواں بربادی اور ویرانی کا استعارہ بن جاتا ہے۔

دیوی کے چرنوں سے پھوٹی

اک طوفانی لہر

ریزہ ریزہ ہو کر ٹوٹی

سرحد کی اک نہر

دل کے اندر دل کے باہر

ایک دھویں کا شہر

(تشخص کی تلاش میں، صفحہ ۲۷)

ڈاکٹر صاحب کی نظموں میں جدید دور کی علامتیں اور استعارے ملتے ہیں۔ جو شاعر کے جدید ذہن کا پتہ دیتے ہیں۔ لیکن یہ استعارے جنگ سے متعلق طیاروں کا شور اور توپوں کی گھن گرج اس المیے کا اظہار کرتی ہے جس کا نام جنگ ہے۔ لیکن ان کی رجائیت ان کو حوصلہ دیتی ہے۔ یہی اندازِ فکر شاعر کو ہر مقام سے با حوصلہ

انداز میں آگے نکل جانے پر آمادہ کرتا ہے۔ وہ مایوسی اور دل گرفتگی کا شکار نہیں ہوتے۔ بلکہ آرزوئے بہار کرتے ہیں۔ جہاں ایک نئی فضا ان کی منتظر ہوگی اور ایک آس جوان کے دامنِ دل پر غم والم کی گرد نہیں پڑنے دیتی۔

طیاروں کا شور تھم چکا ہے

توپوں کا طلسم ٹوٹتا ہے

کچھ لوگ نشاطِ آگہی ہیں

آہ آوارۂ دشت جنوں تھے

خوں رنگ شفق کی بارشوں میں

کرنوں کی لرزتی تابشوں میں

اک بارش نور ہو رہی ہے

دن سوتا ہے رات جاگتی ہے

اب رات کی تیرگی چھٹے گی

اب درد کی گرد بھی ہٹے گی

امید بہار آرزو ہے

پھولوں کی تلاش جستجو ہے

(نشاطِ آرزو، صفحہ ۲۳)

ڈاکٹر صاحب نے اپنی منظومات میں جہاں لہجے کی رجائیت اور سادگی کو اپنایا وہاں روایات کی پاس داری کو بھی برقرار رکھا۔ ان کے ہاں جدت اور اپج بھی ہے ہیئت کے منفرد تجربے بھی۔ نیا دور نظم کا دور ہے۔ لیکن ڈاکٹر صاحب نے بے شمار خوبصورت غزلیات بھی کہیں اور اپنی واردات قلبی کو بیان کیا۔ اس کے ساتھ الواح، کی غزلیات اپنی تاثر پذیری، اور معنویت کے حوالے سے بھی منفرد اور یکتا ہیں۔ ان غزلیات میں تمام فنی وفکری تقاضے پورے ہوئے ہیں۔ امیجری بھی ہے اور غنائیت بھی۔ لفظوں کے جاندار پیکر تراش

کر ڈاکٹر صاحب نے ایک تمثال دار آئینہ تخلیق کیا ہے۔ یہاں سامعہ اور باصرہ بھی اطمینان پاتی ہیں اور لامسہ کو بھی تسکین سی ملتی ہے۔

ترے پاؤں کی دھیمی دھیمی سی آہٹ
چھلکتے ہوئے جام کی گنگناہٹ!!
گلے مل کے وہ اضطراب تمنا
رگ و پے میں وہ سحر زا تھرتھراہٹ
وہ رگ رگ میں کیف و مسرت کی دھوم
وہ نس نس میں جاتی ہوئی ایک آہٹ
نشے کی ترنگوں میں ڈوبی ہوئی
ترے مخملیں جسم کی کسمساہٹ

(صفحہ ۵۲)

غزل شاعری کی لطیف ترین کیفیات اور روایات کا لطیف پیرائے میں اظہار ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہیں بھی اپنی غزلیات میں فنی و فکری سطح میں کمی یا کجی نہیں آنے دی۔ روایات کے راستے پر چلتے ہوئے تمام تر صنائع بدائع استعمال کرتے ہوئے اس صنف کو اپنایا اور پھر بامِ عروج تک پہنچایا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہیں بھی معیار میں ابتذال نہ آنے دیا اور اپنی سوچ کے بام کو بلند تر ہی رکھا۔ اس ضمن میں راستے میں پست و بلند بھی حائل ہوئے۔ لیکن ڈاکٹر صاحب کی اُپج نے ہر کٹھن مقام کو سہل بنایا۔ حسن و عشق کی کیفیات ہوں یا کائنات میں انفس سے آفاق کی جانب سفر کی داستان، ہر بیان براہِ راست موجود ہے۔ لفظوں کے مخملِ زرتار سے خوبانِ خیال جھانکتے محسوس ہوتے ہیں۔ ان کے دلربا چہروں نے قدم قدم پہ گلزار کی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے غزل کی کلاسیکی روایات کی پاسداری کرتے ہوئے رند و میخانہ کا فسانہ بھی سُنایا اور ہجر و وصال کے دلنشیں قصے بھی۔ انہی چلمنوں کے پیچھے سے شرابِ معرفت کے جام بھی چھلکائے جاتے ہیں۔

ے کیا آج وفا پہ غرور ہم نے اور ان سے وصال کی بات کہہ دی
اپنی آبرو کھوئی سرِ محفل، پھر بھی سمجھے کمال کی بات کہہ دی
ترے اندھے مست و خراب اتنے، بھری بزم میں راز کو فاش کر کے
کبھی اپنے عروج کی بات چھیڑی کبھی تیرے زوال کی بات کہہ دی

(صفحہ ۴۹)

ڈاکٹر وحید قریشی کی غزلیات میں بے خودی، مسحوری کی ایک کیفیت ہے۔ جو ہر مصرعے سے جھلکتی محسوس ہوتی ہے۔

کیفیات روایتی سہی لیکن ان میں کہنگی کے آثار محسوس نہیں ہوتے۔ ہجر و وصال کا تذکرہ ہو جو عاشق کو بے خود کیے دیتا ہے یا محبوب کے حسیں پیکر کا قصہ جو آبگینہ دل کو گداز کر جاتا ہے۔

ے وہ جنبش سے پیکر میں نازک سالوچ
بدن پر وہ ملبوس کی سر سراہٹ!

غالب اور میر کی انانیت ڈاکٹر وحید قریشی کی غزل میں در آئی ہے۔

ے تو مجھ کو پکار لے وگرنہ
رستے ہی سے آج لوٹتا ہوں!

(صفحہ ۵۳)

اسی انا کا ایک اور پہلو ملاحظہ ہو۔

ے تو مجھ کو مٹا کے کیا کرے گا
میں تیری بقا کا معجزہ ہوں!

(صفحہ ۵۵)

ے ہو چکے اہلِ وفا کے رت جگے
کون داغِ عشق کے چہرے سہے

(صفحہ ۵۹)

ڈاکٹر صاحب نے مختصر بحروں میں معانی و مفاہیم کے نیشتر بھرے ہیں۔ لیکن اختصار ان کی معنویت کو گھائل نہیں کر سکا۔

ے بھٹکا ہوا ایک قافلہ ہوں!!
اور دشتِ وفا میں پھر رہا ہوں
یہ تو ہے کہ ایک مردِ عارف
یہ میں ہوں کہ ایک سر پھرا ہوں
لے ہاتھ میں کاسۂ گدائی!!
ایک ایک سے بھیک مانگتا ہوں

ڈاکٹر صاحب نے اپنے مافی الضمیر کے اظہار کے لیے انوکھی تراکیب اور استعارے اختیار کئے ہیں۔ ان میں تحرک بھی ہے اور دل گداختگی بھی۔ غمِ ذات سے غمِ کائنات تک ایک وسیع دنیا کو اپنی نظموں میں جس طرح پُر اثر انداز میں پیش کیا ہے۔ بالکل اسی طرح اپنی غزلیات میں بھی پیش کرتے ہیں۔ غزل کے کینوس کو جس طرح حالی، اقبال، فیض اور ناصر کاظمی نے وسیع و عریض کیا۔ بالکل اسی طرح ڈاکٹر صاحب نے اجتماعی حوالہ جات استعمال کئے۔ معاشرے کا انتشار اور بد نظمی سماجی و معاشی زبوں حالی کا بیان ایک غم ناک پہلو لیے ہوئے ہے۔ لیکن معنویت کہیں کم نہیں ہوتی۔

ے اشکوں کی جھڑی تھی اک بہانہ
پلکوں پہ لرز گیا زمانہ

(صفحہ ۶۱)

ے دل نے پھر سے چھیڑا راگ
پھر جنگل میں لگی ہے آگ

غم کی پروا سنک رہی ہے
من مندر میں لگی ہے آگ
ابھی تو شب کا سناٹا ہے
اے غمِ جاناں ابھی نہ جاگ
(صفحہ۵۰)

ے میں تیرا عذاب جانتا ہوں
میں درد کی آگ میں جلا ہوں
(صفحہ۵۴)

ے اپنے دل کی اُداسیوں میں تجھے
بن کے دیوانہ دیکھتا ہوں میں
(صفحہ۶۲)

حالی اور اقبال نے غزل کو سیاست آشنا بنایا۔ فیض نے اس میں عہد ستم کے نئے حوالے تاریخی لحاظ سے رقم کیے۔ ڈاکٹر وحید قُریشی نے بھی مطلق العنانیت کا تاریک دور دیکھا اور اس پر آشوب دور کو یوں بیان کیا۔

ے بیچ منجدھار بہہ رہا ہوں میں
تیرتا ہوں کہ ڈوبتا ہوں میں

وقت تھم سا گیا ہے آخرِ شب
سو رہا ہوں کہ جاگتا ہوں میں
کن ہواؤں کے دوش پر شب ہجر
ہر دریچے سے جھانکتا ہوں میں
شب تاریک آندھیاں نوحے
یوں لگا جیسے مر گیا ہوں میں:

(صفحہ ۶۲،۶۳)

آمریت کے اس دور میں انسانی حقوق کے لیے آواز اُٹھاتے ہیں اور اس عہد کرب و بلا کے خاتمے کے لیے دعا گو ہیں۔

ے
کب بدلے گا جبر کا زمانہ
ہر دور ہے دورِ آمرانہ!

(صفحہ ۶۰)

بے حس ہوئے بام و در کے والی
پتھر میں بدل گیا زمانہ
منصوبے وطن فروشیوں کے
ہونٹوں پہ حفیظ کا ترانہ

(صفحہ ۶۱)

یہاں جمود اور سکوت کی فضا ہے۔ فنونِ لطیفہ اور اظہار رائے پر پابندی ہے۔ بے یقینی اور تنہائی کا کرب اس دور کا المیہ ہے۔ اربابِ بست و کشاد کی بے حسی پر ایک زمانہ ماتم کناں ہے۔ کرفیو کی فضا میں فرد کی آزادی پر کڑی قدغن ہے۔ حیوانیت اور درندگی کا دور دورہ ہے انسانی سوچ پر گہرے پہرے ہیں۔ قلم

اور زبان پر جبر کی کڑی فصیلیں کھڑی کر دی گئی ہیں۔ اس دور اور اس کے پیدا کرنے والوں پر اہلِ قلم نے ہمیشہ طنز کے تیر برسائے اور اپنے دور کے غیر یقینی سیاسی نظام سے ہمیشہ نفرت و بے زاری کا اظہار کیا۔ یہ طریقہ حکومت انسان کے بنیادی حقوق کی نفی کرتا ہے۔ جہاں نئے خیال کی پرداخت تو دُور کی بات۔ اس کی پیدائش پر بھی پابندیاں ہوں۔

غفلت کے مزے اٹھانے والے

کھائیں گے فریب آ گہی کیا

سب کھوٹے کھرے برابر

رہزن ہوئے ہم تو رہبری کیا

دل کان لگا کے سن رہا ہے

نیرو نے بجائی بانسری کیا

گلشن میں سکوتِ مرگ طاری

چٹکے گی خیال کی کلی کیا

آزادیٔ فکر کے خداؤ

روزن ہی نہیں تو روشنی کیا!

تم شعر سُنا رہے ہو کس کو

بنیوں میں مذاقِ شاعری کیا

اس عہد کی تاریکی کو یہ مصرعے کچھ اور بھی گہرا کر کے بیان کرتے نظر آتے ہیں۔ جن میں عہد کی تاریکی، بے حسی اور کم علمی کا ماتم کیا گیا ہے۔

طاق میں روشن تو ہیں کچھ کچھ دیے
ان کی تابانی مگر کس کے لیے!!
شہرِ ناپرساں میں فن کی آبرو
پھول ہیں اپنی ہی قبروں پر کھلے

جس ملک میں آمریت کا راج ہو۔ وہاں اظہار رائے پر قطعی پابندی ہوتی ہے۔ آہستہ آہستہ اہل قلم کی قدردانی میں بھی کمی آتی چلی جاتی ہے۔ لفظوں کی حرمت دم توڑ دیتی ہے۔ روحانی و اخلاقی قدریں تہذیبی ملبے تلے دب جاتی ہیں۔

سامع کے بغیر شاعری کیا
تالی کے بغیر زندگی کیا
فاقوں میں کٹے گی عمر ساری
کام آئے گی یہ قلندری کیا
سب اپنے ضمیر کے شکاری
اندھیر نگر کی چاکری کیا
بے سُود ہے تیری شعر گوئی
اندھوں کے لیے مصوری کیا!

(صفحہ ۵۷)

ایسے میں ادبی قدریں بھی دم توڑ دیتی ہیں۔ کیونکہ اہلِ ادب فکری تنزل کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ان کے

لیے خیال کی کوئی اہمیت نہیں رہتی۔ ان کی تخلیقات فکری سرمائے سے تہی ہو جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ خود بلندی و پستی کے معائر دب جاتے ہیں۔ موضوعات مبتذل اور رکیک ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ باقی اگر کچھ بچتا ہے تو وہ قلم اور الفاظ کی ارزانی، خیال کی تنگ دامانی، فکر و نظر کی پستی اور جذبے کی کج روی۔ عامیانہ خیالات کا سہارا لے کر شاعری کی بے جان مورت تراشی جاتی ہے۔

ہیں جس میں سوار اہلِ دانش
ڈبہ ہے وہ ریل کا زنانہ!!

ان حالات میں فرد بے چہرہ ہو کر بھیڑ میں گم ہو جاتا ہے۔ وہ خود اپنی پہچان گم کر دیتا ہے اور لوگوں سے اپنی شناخت کے حوالے جاننے کی کوشش کرتا ہے۔

اپنے پہ گماں غیر کیوں ہے
حیراں ہوں خود سے پوچھتا ہوں!

(صفحہ ۵۳)

نئے صنعتی اور سائنسی دور کا ایک المیہ یہ بھی ہے کہ فرد تنہائی کے بسیط خلاء میں کہیں کھو گیا ہے اور اپنی منزل سے کٹ گیا ہے۔ تہذیبی انحطاط اور اخلاقی قدروں کی گراوٹ کی وجہ سے فرد تلاشِ ذات کے عمل میں مصروف ہے۔ منزلیں مادی اور سطحی ہیں۔ اس لیے سفر بھی بے معنی اور تھکا دینے والا ہے۔ ایسے معاشرے میں انحطاط اوپر سے شروع ہوتا ہے اور نچلی سطح تک سفر کرتا ہے۔ امید اور منزل معدوم ہو جاتی ہے۔ اعلیٰ قدروں کا زوال شروع ہو جاتا ہے۔ علم و فن ثانوی اور مادیت اوّلین ترجیح بن کر رہ جاتی ہے۔ اس شہر آشوب کو ڈاکٹر وحید قُریشی نے اپنے حساس ذہن سے پرکھا اور سپرد قلم کیا۔ غزل جس میں نزاکتِ خیال کو معیار مانا جاتا ہے۔ سبک مصرعوں میں خیال کی اس پیچیدگی کو پیش کرنا انہی کا خاصا ہے۔ یہ سنگلاخ اور پیچیدہ وادی انہی کے خامۂ معجز بیاں کی مرہون منت ہے۔ جس نے احساس کی نزاکتوں کے ساتھ ساتھ مشاہدے کی بے رحم سچائیوں کو بھی بیان کرنے سے عذر نہ کیا۔

رات بھر آندھی چلی احساس کی

اور سناٹے کا عالم دن چڑھے

وقت بے قیدِ وفا، سیماب پا

کام کیا آئیں دِلوں کے ولولے

دل میں وہ احساسِ محرومی نہیں

وقت کٹ جائے گا سوتے جاگتے

کوئی ملتا ہی نہیں پرسانِ حال

پھر رہے ہیں در بدر کچھ قافلے

اپنے جب اپنے نہیں تو اے دلا

غیر سے پھر کیا مقدر کے گلے!!

(صفحہ ۵۸)

یہاں افرادِ معاشرہ میں وہ جذبہ، جوش اور لگن معدوم ہے جو اس کو آمادہ سفر کرتی ہے۔ اندر سے کھوکھلے افراد معاشرے کو کیا خوشی کیا سکون دے سکتے ہیں۔ ان کے اپنے غم اور تنہائی کے احساسات ہیں۔

کون آئے گا کس کو آنا تھا

اب تو سو جاؤں تھک گیا ہوں میں

(صفحہ ۶۲)

اب مرحلہ کون سا ہے درپیش

منزل پہ جو آکے رک گیا ہوں

ہر ایک پہ کر رہا ہوں تنقید

کیا اپنی ہی ذات سے خفا ہوں!

(صفحہ ۵۴)

میں اپنی ہی خامشی کا جنگل
میں اپنے ہی دشت کی صدا ہوں

میں اپنی انا کا ہوں پجاری
میں اپنی ہی قبر کا دیا ہوں

(صفحہ ۵۵)

ڈاکٹر وحید قُریشی کے مزاج میں دیگر بہت سے شعبہ ہائے فنون سے لگاؤ بھی رچا بسا ہوا ہے۔ مثلاً نفسیات ان کا پسندیدہ مضمون رہا ہے۔ مندرجہ بالا اشعار میں کئی نفسیاتی اشارے اور فرد کے احساسِ تنہائی کے مختلف پہلو اور حوالے ملتے ہیں۔

اپنے پہلے مجموعے ''نقدِ جاں'' کی طرح ''الواح'' میں بھی ڈاکٹر صاحب نے دیہات سے اپنی انیست اور فطری وقلبی لگاؤ کا ذکر کیا ہے۔ شہر کے ہنگاموں سے تنگ آ کر وہ دیہات کے سادہ و دلنشیں دامن میں پناہ لیتے ہیں۔ جہاں فطرت کا ابدی نغمہ اپنی تمامتر خوش الحانی کے ساتھ ساتھ مدھر سروں میں گایا جارہا ہے۔ جہاں خاموشی سانسیں لیتی ہے اور دھڑکن گیت گاتی ہے۔ جہاں اِنسانی قدریں ابھی بھی اپنی تمامتر آن بان کے ساتھ زندہ و تابندہ ہیں۔

ے گاؤں سے چلا تھا بچ بچا کر
میں شہر میں آ کر لٹ گیا ہوں

(صفحہ ۵۵)

ڈاکٹر صاحب دیہات کی سادہ و معصوم فضا کی بڑی کامیاب تصویریں بناتے ہیں۔ ان کے خیال میں

نام نہاد ترقی نے اِنسانوں کو نفرتیں اور خود غرضی عطا کی ہے۔ شہری زندگی سوائے تیز روی اور نفسانفسی کے اور کچھ نہیں۔ وہ علامتی رنگ و آہنگ میں جدید زندگی کا مقابلہ دیہی زندگی سے کرتے ہیں۔ ''الواح'' میں قدم قدم پر ایسے استعارے موجود ہیں۔

ڈاکٹر وحید قریشی نے غزل میں اپنے لیے منفرد راہیں تلاش کی ہیں۔ اِن غزلیات میں عصری صورتحال کا گہرا شعور بھی ہے اور ایک مثالی دُنیا کی تلاش بھی۔ انقلابی موضوعات ہوں یا حسن و عشق کی کیفیات انکا کلام انفرادیت، واقعیت، صداقت اور نزاکتِ خیال سے مملو ہے۔

ڈاکٹر سید عبداللہ اپنے ایک مضمون ''الواح، وحید قریشی کا نیا کلام'' میں لکھتے ہیں:

> کسی شاعر کے ہاں بلاغت کی ایک پہچان بیان کا اختصار ہوتا ہے۔۔۔ بلاغت کا تقاضا یہ ہے کہ الفاظ کم ہوں لیکن معانی الفاظ کے لحاظ سے وافر تر ہوں۔ معانی کے وافر تر ہونے کی ایک صورت یہ ہے کہ بیان پہلو دار ہو۔ یعنی ایک سے زیادہ رُخ رکھتا ہو اور قاری کو پڑھتے وقت ایک سے زیادہ معنی اس میں نظر آئیں وحید قریشی کی غزلیات میں یہ کیفیت اکثر نمایاں ہے۔ [۶]

غزلیات کے علاوہ ''الواح'' میں دوہے اور ترجمہ بھی ہے۔ اقبال کی نظم ''تنہائی'' جو فارسی زبان میں ہے۔ اِس کا اُردو میں ترجمہ کیا گیا ہے۔

اقبال کی فارسی نظم یوں ہے۔

بہ بحر رفتم و گفتم بہ موج بیتابی

ہمیشہ در طلب استی چہ مشکلی داری؟

ہزار لولوی لالاست در گریبانت

درونِ سینہ چو من گوہر دلی داری؟

تپید واز لب ساحل و ہیچ نگفت

شدم بحضرت یزداں گذشتم از مہ و مہر

کہ در جہانِ تو یک ذرہ آشنایم نیست

جہان تہی ز دل و مشت خاک من ہمہ دل

چمن خوش است ولی در خود نوایم نیست

تبسمی بلب اور رسید و ہیچ نگفت

(صفحہ ۲۷۲، ۲۷۳)

ڈاکٹر وحید قریشی نے اس نظم کا ترجمہ کچھ یوں کیا ہے۔

کہا یہ میں نے سمندر کی موجِ رقصاں سے

یہ کس کی تجھ کو طلب ہے یہ کیسی تشنہ لبی

ہزار لولوئے لالہ ہیں تیرے پہلو میں

ترے کنار میں دل سا بھی ہے کوئی موتی

تڑپ کے دور سرک سی گئی پہ کچھ نہ کہا

مہر و ستارہ سے آگے نکل ''گیا پھر میں''

حضور حق میں جو پہنچا تو یوں کیا شکوہ

مرا وجود کہ ہے مشعلِ رہ تاریک

کوئی بھی اس کی تجلی کا پاسباں نہ ہوا

وہ مسکرا سے دیے اور مجھ سے کچھ نہ کہا

(صفحہ ٦٦، ٦٧)

''نقدِ جاں'' میں ڈاکٹر صاحب نے پنجابی زبان میں دوہے لکھے ہیں اور اپنی جولانی طبع کے نئے انداز

دکھائے ہیں۔ ''الواح'' میں بھی ان کی پسندیدہ صنف دوہا موجود ہے۔ انہوں نے سرسی چھند کے بجائے دوہا چھند میں اپنے دل کا حال بیان کیا ہے۔

ے حالی سرسی چھند میں دوہے کہے کمال
ہم نے دوہا چھند میں کہہ دیا من کا حال!

(صفحہ ۲۲)

جس طرح ڈاکٹر صاحب نے اصنافِ شعر کو مختلف موضوعات کے حوالے سے بیان کیا بالکل اسی طرح سیاسی مقاصد کے لیے بھی دوہے کی انفرادی شان بنا دی۔ اِن دوہوں میں سیاسی پسِ منظر اور پیشِ منظر کا تصویری بیان زیادہ ہے۔ مختصر انداز میں اپنے بیان کے نشتر کو پیش کیا ہے۔

ے چاند کا پنچھی سو گیا، لمبی چادر تان
گلیاں شہر لہور کی، سونی اور سنسان
اک بالک کے ہاتھ میں آیا تیر کمان
عشق نہ پوچھے ذات کو عشق نہ دیکھے جان

سدا کی روگی روشنی، من مندر ویران
رات ڈراؤنی خواب سی، جیون بھوت استھان
اپنا آپ مٹائے کے، ملے کہاں سے گیان
کچے گھڑے پہ تیر کے مفت گنوائی جان

(صفحہ ۶۸)

ڈاکٹر صاحب نے معاشرے کے مختلف روگ خواہ وہ روحانی ہیں یا سیاسی اپنے کلام میں بیان کر دیے

ہیں۔ وہ معاشرتی بیماریوں کے گہرے نباض ہیں۔ ان کے ہاں حالات کو تصویر کرنے کا رجحان بھی ہے اور اصلاحِ احوال کی منظوم تجاویز بھی۔

اس طرح وہ اپنے ہمدردانہ شعور کا اظہار کرتے ہیں۔ جو ان کی بصیرت کو ظاہر کرتا ہے۔ لیکن انہوں نے انتہائی فنکارانہ انداز سے اپنے اس شعور کا اظہار کیا ہے جو سماجی سطح پر ان کی بصیرت اور ہوشمندی کا غماز ہے۔ لیکن یہ طنز و مزاح بڑا باعتماد اور یہ تنقید بڑی مثبت ہے۔ ہر مصرعے میں قوم کے سیاسی اُفق پر اُبھرنے والا ایک کردار موجود ہے۔

جس پہ تیرا لطفِ عالی ہو گیا
یا منسٹر یا ڈفالی ہو گیا!
جنگلوں میں جا بسے اہلِ جنوں
وحشیوں سے شہر خالی ہو گیا
لوک ورثے میں کوئی عہدہ ملے
شیخ اِس خاطر دھمالی ہو گیا
قوم کی آنکھوں کا تارا تھا کبھی
قوم کی نظروں میں گالی ہو گیا

(صفحہ ۷۱)

پھوکے شعر سناندا جا
طوطے توپ چلاندا جا
دھوکے دی منڈی اے بیبا
سب نوں بتے لاندا جا

بن جا چاکر ہر حاکم دا

یا فیر دھکے کھاندا جا

(صفحہ ۷۲)

مختصر یہ کہ ''الواح'' میں غنائیت، تکرار لفظی، علامتوں کے برمحل استعمال اور بیان و بدیع کی خوبیوں نے اِس مجموعے کو دلکشی اور انفرادیت بخشی ہے۔ فنی لوازمات کا استعمال اس قدر مہارت اور فنکارانہ اسلوب سے کیا گیا ہے کہ اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ صنعتِ تضاد نے ان کے کلام کی دھنک کو اور بھی اجاگر کیا ہے۔ خوش آہنگی ان کے کلام کی جان ہے جس کے لیے وہ اکثر لفظوں کی تکرار سے بھی کام لیتے ہیں۔ مصرعوں کے چند ٹکڑے ملاحظہ ہوں۔

جلوہ ہی جلوہ

صحرا بہ صحرا

دُنیا بہ دُنیا (صفحہ ۴۰)

ہس ہس کھڑیاں کلیاں

(صفحہ ۴۵)

خاکِ وطن کا اک اک ذرہ

(صفحہ ۲۹)

ریزہ ریزہ ہو کر ٹوٹی

(صفحہ ۲۷)

ڈاکٹر صاحب نے اپنی شخصیت کی تمام جہات اور اپنے دیگر دلچسپیوں کے مشاغل اس کلام میں سمو دیے ہیں جو ''الواح'' کے نام سے سامنے آیا ہے۔ انھوں نے کوئی پہلو تشنہ نہیں چھوڑا۔ اگرچہ یہ مجموعہ بھی ان کے

پہلے مجموعے کی طرح مختصر ہے۔

ڈاکٹر وحید قریشی نے ''نقدِ جاں'' اور ''الواح'' کی اشاعت کے بعد بھی شعر و شاعری کی سلسلہ جاری رکھا لیکن وہ کلام ابھی تک غیر مطبوعہ ہے اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ اِس کلام میں سے کچھ حصے کا کتابی نام انہوں نے ''ڈھلتی عمر کے نوحے'' تجویز کیا ہے۔ فکرِ شعر کے اعتبار سے یہ کلام بڑا پُر تاثیر اور بھرپور ہے۔ اِن کا شعری مزاج بلوغت کے ادوار طے کر چکا ہے۔ حسبِ سابق دوہوں اور نظموں پر اِن کی توجہ زیادہ ہے اور غزلیات حمد، نعت جیسی اصناف بھی موجود ہیں۔ اِس مجموعے میں بھی اصناف کی رنگارنگی اور متنوع دیکھنے میں آتا ہے۔ منظومات کی فہرست میں ہر طرح کے موضوعات پائے جاتے ہیں۔ اظہار کے سانچے بڑے روایتی لیکن دلکش ہیں۔ یہاں سرزمینِ حجاز کی زیارت کی سعادت بھی انہیں حاصل ہوتی ہے تو وہ ربّ کعبہ کی عظمت و ہیبت کے اعتراف میں سجدہ کناں ہو جاتے ہیں اور اِس عظیم تجربے میں قارئین کو بھی شریک کرتے ہیں۔

رَبِّ کعبہ کی عظمت ہے دلوں پر طاری
ہیبت کا ایک دریا ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔
اِنسانوں کے سروں کی لہریں گھوم رہی ہیں
حجرِ اسود چوم رہی ہیں
سجدوں کی اِک موجِ رواں
اور ہر دل سجدہ کناں
کعبہ مرکز صدق و صفا اور محورِ جود و عطا
تیری ہیبت ایک سہانے اور کٹیلے خواب کی صورت
میرے دل میں گھوم رہی ہے
سجدوں کی بارش میں کھڑا اب یہ سوچ رہا ہوں

زیست کا جو لمحہ گزرا

۔۔۔بے کار گیا

یہ دل میرا ہیبت کے اس لمحے میں

ایک اداسی، اِک حیرانی

اندر کی ویرانی

باہر ایک سمندر گھوم رہا ہے

کعبے کا در چوم رہا ہے

(صفحہ ۹ تا ۲۱)

نبی پاک کو ہدیۂ عقیدت پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب کا انداز و اسلوب بڑا والہانہ اور دلگداز ہو جاتا ہے۔

جذبۂ حب رسولؐ

جادہ پیمائے قبول

ہاتھ پابندِ رسوم

دل دعا میں مشغول

لب خاموش پہ ہے

ہدیۂ نعتِ رسولؐ

تیرا ہر لفظ حدیث

تیرا ہر فعل اصول

ارضِ طیبہ کے مکیں

حرفِ عاجز ہو قبول (زیارتِ روضہ، صفحہ ۳۷، ۳۸)

''ڈھلتی عمر کے نوحے'' میں غزلیات اپنے بہترین پیرائے میں ہمارے سامنے آتی ہیں۔

؎ خاک اڑتی ہے سرِ کوئے محبت لیکن
دل بیتاب کا جینے کا قرینہ اپنا

؎ تمام عمر کی بیتابیاں اب آ کے مٹیں
سکونِ قلب کے غارِ حرا میں رہتا ہوں
جہاں حرص و ہوا سے نہ واسطہ نہ غرض
دیارِ شوق و درِ کبریا میں رہتا ہوں

(صفحہ ۱۵)

ڈاکٹر صاحب مادی دُنیا سے روحانی دُنیا کے سفر کو اپنی زندگی کے بہترین دور میں شمار کرتے ہیں۔ ان کے ہاں سادگئ بیان مطالب کی گیرائی اور گہرائی میں شکن نہیں ڈالتی۔ اِن کی قادر الکلامی ہر جگہ اپنی چھب دکھاتی ہے۔

؎ سدا دل کا نگر آباد رکھنا
مرے مولا مجھے ناشاد رکھنا

اپنے گزشتہ روایتی اسلوب یعنی مکالمہ نگاری کی فضا کو ڈاکٹر صاحب نے یہاں بھی روا رکھا ہے اور غزل جیسی سنجیدہ صنفِ سخن میں بھی مزاح کی رنگینی و رعنائی پیدا کر دی ہے۔

؎ اے دل ناصبور کیا لینا
بھائی عبدالشکور کیا لینا

جب ہوئے دل سے دور کیا لینا
اب پری ہو کہ حور کیا لینا!

(صفحہ۸۴)

اسلامی عظمت کے گہوارے عرب سے اپنی وابستگی کو یوں بیان کرتے ہیں لیکن یہ انداز ان کی ایک نظم میں نمایاں ہوا ہے۔

سارے نقشِ کہن
ایک ایک کر کے مٹنے لگے
یا مٹائے گئے
نہ بدر و حنین نہ خندق رہی
میرے اجداد کی ساری قبریں مٹیں
سارے آثار آنکھوں سے اوجھل ہوئے
میں نے آسائشوں کے لیے
اور نمود زر و مال و دولت کی خاطر
نئی طرزِ بود و عمل کے لیے
اپنے اجداد کی ہر پرانی روش کو مٹا کر
دورِ حاضر کے سارے تقاضے پورے کیے

(جادۂ اماں، صفحہ ۴۵)

مزاح کے حوالے سے ان کے ہاں تحریف نگاری کے نمونے بھی اس کلام میں موجود ہیں۔ ایک

مثال ملاحظہ ہو۔

وقت کے تقاضوں کو اس طرح بھی سمجھا کر
کچھ نہ کچھ تو نکلے گا تو یہ پہاڑ کھودا کر
تیرے ہر روییے میں بدگمانیاں کیوں ہیں
دیکھ او بھلے مانس اعتبار خوبجہ کر

(صفحہ ۸۱)

اِس مجموعے میں ہر موضوع پر دوہے بھی تخلیق کئے گئے ہیں خواہ ان کا تعلق روزمرہ موضوعات سے ہو یا داخلی واردات سے۔ معاشرتی اور سماجی موضوعات بھی ڈاکٹر صاحب کے دلپسند موضوع ہیں۔ اِن کے کلام کے بنیادی خصائص مثلاً سادگی، روانی، خلوص اور واقفیت ان دوہوں کی جان ہیں۔

مثالیں ملاحظہ ہوں۔

ے بگڑی امت آپ کی، بگڑا کل سماج
پھر بھی ہم کو بخش دے، رکھ لے نام کی لاج

ے اندر کی تنہائیاں، کر گئیں اپنا کام
باتیں کرنے لگ گئی ہم سے گہری شام

ے ہم تھے اپنے آپ میں جب تک ڈور تھی ہاتھ
اب تو کٹی پتنگ ہیں موجِ ہوا کے ساتھ

ے سونی پڑی ہیں بستیاں، سونے ہیں کھلوار

اپنی بازی کھیل کر چلے گئے سب یار

ــ دو قوموں کی بات ہے، تیرا خیال خام
ہندو مسلم ایک ہیں، یہ ہے نرا الزام

ــ گنگ ہیں ساری وادیاں، بام و درخاموش
اپنا آپ سنبھال لے کیسے ہے اتنا ہوش

ڈاکٹر وحید قریشی کے یہ دوہے زمانے کے عام واقعات سے متاثر ہو کر لکھے گئے ہیں۔ اِس صنف کے علاوہ غزلیں اور نظمیں بھی ان کے غیر مطبوعہ کلام میں شامل ہیں۔ وہ نہ صرف اپنے ملک، عالمِ اسلام اور ایشیا کے مسائل سے متاثر نظر آتے ہیں بلکہ ساری دُنیا کے غم اور مسائل ان کے اپنے ہیں۔ ایک نظم ''دعا'' میں ایشیا کی تقسیم کے ضمن میں متاسف انداز میں فرماتے ہیں۔

ــ ہمیں یقیں ہے تباہی کا پیش خیمہ ہے
یہ روڈ میپ کے قصے، یہ تاجروں کے مفاد
کبھی یہود و نصاریٰ کی تردماغی سے
بنے ہیں تیل کے کنوئیں، مقامِ حرب و فساد
کریں جو کابل و قندھار پر گرفت کڑی
اِسی سے ہو گا نئی طاقتوں کا استرداد
عرب ہو یا کہ عجم، اپنے اختلاف میں گم
شکارگاہِ حریفانِ غرب فتنہ نہاد
عراق ہو کہ فلسطیں کہ غزنوی کا وطن

یہی دعا ہے یہ خطے رہیں نہ یوں برباد

''فلسطین'' کے عنوان سے لکھی گئی نظم میں فرماتے ہیں۔

چلے کہ شوق سے دیکھیں گے سر زمینِ جہاد
پلٹ کے آئے تو دل تھا گرفتہ و ناشاد
حماس ارضِ فلسطیں کے سپوت سہی
نہیں تھا اِن میں درخشندہ شعلۂ فریاد
وہ صرف اپنی بقا کی لڑائی لڑتے تھے
نہ کوئی حیلہ شرعی، نہ کوئی عزم جہاد
یہ سو برس کے تسلسل کی سعی بے حاصل
کہ سوز و ساز سے خالی نگارخانہ راد

مختصر یہ کہ ڈاکٹر وحید قریشی نے بحیثیت شاعر رنگارنگ تجربوں کی ایک دُنیا بسائی ہے۔ اِن کا کلام معیار اور مقدار کے حوالے سے ایک نئی فضا کا پتہ دیتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے ہر موضوع پر مختصر مگر جامع اندازِ فکر و نظر سے قلم اٹھایا اور کامیابی حاصل کی۔

☆☆☆

حوالہ جات (باب ہشتم)

۱ وزیر آغا ڈاکٹر، دیباچہ نقدِ جان از ڈاکٹر وحید قریشی، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، مارچ ۱۹۶۸ء، صفحہ ۱۰۔

۲ عارف عبدالمتین، فلیپ مجموعہ ''الواح'' از ڈاکٹر وحید قریشی، طور پرنٹنگ پریس، فیصل آباد۔۱۹۸۴ء۔

۳ انور سدید۔ اختتامیہ فلیپ۔ الواح۔ صفحہ ۷۵ تا ۷۶۔

۴ مشمولہ ''محفل'' (ماہنامہ) ڈاکٹر وحید قریشی نمبر جلد ۳۶ (شمارہ ۲) لاہور فروری ۱۹۹۰ء، صفحہ ۱۰۸۔

۵ عارف عبدالمتین، فلیپ ''الواح''

۶ مشمولہ ''محفل'' ماہنامہ ڈاکٹر وحید قریشی نمبر، جلد ۳۶ (شمارہ ۲) لاہور فروری ۱۹۹۰ء (صفحہ ۱۰۸)۔

☆☆☆

باب نہم

مجموعی جائزہ

تحقیق سے مراد تلاشِ حقیقت، انکشافِ حقیقت اور نا معلوم کی جستجو کرنا کے ہیں۔ تحقیق صداقت کی تلاش کا عمل ہے۔ جس کے لیے محققانہ مزاج کی ضرورت ہوتی ہے۔ تحقیق کے مقاصد میں نظریے کی نشوونما اور حقائق کی چھان بین شامل ہیں۔ اُردو میں تحقیق کی روایت قدیم تو نہیں لیکن اس میں وسعت اور سنجیدگی ضرور پائی جاتی ہے۔ اُردو ادب میں تحقیقی روایت کا آغاز تذکروں سے ہوا۔ تذکروں کے علاوہ لغات میں بھی محققانہ شعور کی تگ و دو نظر آتی ہے۔ اُردو تحقیق کے پسِ منظر میں جھانکا جائے تو مختلف الخیال محققین کے گروہ اور کارنامے نظر آتے ہیں۔ اُردو تحقیق کے اہم دبستانوں میں دبستانِ دکن، دبستانِ اعظم گڑھ، دبستانِ پٹنہ، دبستانِ رام پور اور دبستانِ لاہور شامل ہیں۔ دبستانِ دکن سے وابستہ محققین اختلافِ نسخ میں قلمی نسخوں کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ تاریخی مآخذ سے حاصل ہونے والی معلومات کو ادبی مواد سے پوری طرح ہم آہنگ نہیں کرتے۔ ان کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ اُردو زبان کو فلالوجی کی حدود سے نکال کر صوتیات کی منزل تک لے آئے ہیں۔ دبستانِ دکن کے نمایاں محققین میں محی الدین قادری زور اور نورالحسن ہاشمی شامل ہیں۔ دبستانِ اعظم گڑھ کے محققین نے اُردو زبان کو صرف زبان کی حیثیت سے نہیں مسلمانوں کی علمی زبان کی حیثیت سے قبول کیا ہے۔ دبستانِ اعظم گڑھ کے محققین میں شبلی نعمانی، سیّد سلمان ندوی اور مولانا عبدالسلام ندوی کے نام خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ دبستانِ پٹنہ کے قافلہ سالار قاضی عبدالودود ہیں اِن کے علاوہ ڈاکٹر مختارالدین اور ڈاکٹر اختر اورینوی بھی اسی گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ محققین ثانوی مآخذ کو صرفِ نظر کر کے صرف بنیادی مآخذ پر توجہ دیتے ہیں۔ ان کے ہاں حوالے میں احتیاط کا عنصر خاص اہمیت رکھتا ہے۔ دبستانِ رام پور کی پہچان مولانا امتیاز علی عرشی اور ان کے ہم خیال ہیں۔ اس دبستان نے تصحیحِ متن کے اہم کام انجام دیئے۔ ڈاکٹر وحید قریشی دبستانِ لاہور سے تعلق رکھتے ہیں اس دبستانِ کی بنیاد حافظ محمود شیرانی کے ہاتھوں پڑی۔ اس دبستان میں علوم کے مطالعے کو زبانوں کے مطالعے کے لئے ضروری قرار دیا گیا ہے۔ تاریخ کو اس نظامِ تحقیق میں بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ متن سے

حاصل کردہ واقعات اور سنین کو تاریخ کی کسوٹی پر پرکھا جاتا ہے۔ اس دبستان نے اُردو تحقیق کی روایت میں احتیاط کا اعلیٰ معیار قائم کیا۔

جن بزرگ اور اکابر محققین نے دبستانِ لاہور کی تربیت و آبیاری کی ان میں محمد حسین آزاد، حافظ محمود خاں شیرانی، مولوی محمد شفیع، پروفیسر ڈاکٹر محمد اقبال، برج موہن دتا تریہ کیفی، قاضی فضل حق، ڈاکٹر سید عبد اللہ، مشفق خواجہ، ڈاکٹر جمیل جالبی، قاضی احمد میاں اختر جونا گڑھی، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں، ڈاکٹر نجم الاسلام وغیرہ شامل ہیں۔ ان بزرگ محققین کی تربیت یافتہ نسل آج بھی دبستانِ لاہور کے مقاصد کے فروغ میں پیش پیش ہے۔ ان محققین میں ڈاکٹر گوہر نوشاہی، ڈاکٹر تبسم کاشمیری، محمد اکرام چغتائی، ڈاکٹر اے بی اشرف، ڈاکٹر صدیق جاوید، خواجہ محمد زکریا اور ڈاکٹر تحسین فراقی قابلِ ذکر ہیں۔ ڈاکٹر وحید قریشی کا نام اس دبستان میں ایک مثال کی حیثیت رکھتا ہے۔ انہوں نے اپنے اساتذہ کی روایات کو اپناتے ہوئے اپنے لئے ایک جداگانہ راہ متعین کی۔

''ڈاکٹر وحید قریشی کی تحقیقی و علمی خدمات'' میں اس امر کو ملحوظ خاطر رکھا گیا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی علمی و ادبی تمام جہتوں کا احاطہ کیا جائے اور کوئی پہلو صرفِ نظر نہ ہونے پائے۔ ان کی تنقیدی بصیرت کے ساتھ ساتھ تحقیقی و علمی شان کو بھی بغیر کسی مبالغے کے حقیقی انداز میں بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس مقالے کا دائرہ کار ڈاکٹر صاحب پر لکھے گئے دیگر مقالوں سے اس لیے بھی وسیع ہے کہ ان کی تمام تر علمی و تحقیقی حیثیات کو اس میں اجاگر کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی شخصیت، جائے پیدائش اور ابتدائی زندگی کو ایک دلچسپ کہانی کی طرح پیش کیا گیا ہے۔ ان کا تنقیدی و تحقیقی سفر کس پس منظر میں شروع ہوا۔ کن محرکات نے ان کے لیے مہمیز کا کام کیا۔ ان کا ماحول ان کے ادبی نظریات کی نشوونما میں کیسے معاون ثابت ہوا۔ ڈاکٹر صاحب کے والد محترم، ڈاکٹر صاحب کے اتالیق اور ان کے معاصرین نے ڈاکٹر صاحب کو کس طرح غیر شعوری طور پر متاثر کیا، یہ سب ابتدائی ابواب میں بیان کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر وحید قریشی ایک ایسے خاندان کے فرد ہیں جو کہ روحانیت کے ساتھ ساتھ علمیت میں بھی بے مثال ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی بنیادی ادبی تربیت میں ان کا ماحول شامل رہا ہے۔ بچپن ہی سے

ادبی ذوق و شوق کی بدولت ڈاکٹر صاحب نے علم کی منازل بڑی کامرانی اور تیزی سے طے کیں۔ ذاتی کتب خانہ بنانے کا خیال اس امر کا بین ثبوت ہے کہ آغاز ہی سے ڈاکٹر صاحب کی نظر فارسی و اُردو ادب پر بڑی گہری تھی۔ ڈاکٹر وحید قریشی پنجاب یونیورسٹی، اورینٹل کالج لاہور میں پروفیسر، صدر شعبہ اور پرنسپل ہونے کے علاوہ اقبال اکیڈمی کے اعزازی ڈائریکٹر اور مقتدرہ قومی زبان کے کل وقتی صدر نشین بھی رہے۔

'مخزن' کے ایڈیٹر ہونے کے ساتھ ساتھ مجلّہ ''علمی'' لاہور ریسرچ سوسائٹی آف پاکستان اور ''صحیفہ'' لاہور مجلس ترقی ادب، مجلّہ تحقیق، لاہور جامعہ پنجاب، اورینٹل کالج میگزین لاہور، اقبال ریویو، اُردو انگریزی، فارسی لاہور، اخبار اُردو اسلام آباد مقتدرہ قومی زبان، لاہور بزم اقبال، مخزن لاہور قائد اعظم لائبریری کے مدیر رہے۔

ڈاکٹر وحید قریشی نے اُردو اور فارسی زبانوں میں وسیع پیمانے پر تحقیق و تدوین، تالیف و تصنیف اور تنقید کے کارنامے سرانجام دیے۔ وہ کئی عظیم اشاعتی اور تحقیقی اداروں کے سربراہ رہے۔ ان کے سامنے زمانے کے کئی نشیب و فراز گزرے۔ قیام پاکستان، مشرقی پاکستان کی علیحدگی، بنگلہ دیش کا قیام اور دو جنگیں، ڈاکٹر صاحب ان واقعات کے حساس ناظر اور مبصر رہے۔ ۱۹۹۳ء میں ڈاکٹر صاحب کو حکومتِ پاکستان کی جانب سے صدارتی تمغۂ حسن کارکردگی دیا گیا۔ ۲۰۰۳ میں اقبال شناسی کے حوالے سے حکومتِ پاکستان نے انہیں اقبال ایوارڈ دیا۔

ڈاکٹر وحید قریشی کی تصانیف میں ان کی جدت پسندی کا رجحان نمایاں ہے وہ منفرد اسلوب رکھنے والے انفرادیت پسند ادیب بھی ہیں اور بے مثال زبان داں اور ہمہ جہت محقق بھی۔ ڈاکٹر صاحب کی تنقید امتزاجی تنقید ہے۔ وہ فرائڈ کے نقطۂ نظر سے متاثر ہیں۔ ان کے مزاج میں طنز و مزاح کی چاشنی بھی موجود ہے۔ جس کا اظہار ''میر جملہ لاہوری'' کے نام سے روزنامہ جنگ میں چھپنے والے مزاحیہ کالموں سے ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی بنیادی حیثیت ایک محقق کی ہے۔ انہوں نے تحقیق کے میدان میں نئی جہتوں کا سراغ لگایا۔ انہوں نے عباس ابن محمد علی شوستری اور ڈاکٹر سید عبد اللہ جیسے اساتذہ سے استفادہ کیا اور اورینٹل کالج میں ریسرچ کا ایک خاص معیار قائم کیا۔ پاکستان میں تحقیقی کاوشوں کے دوران جو مشکلات پیش آتی ہیں ان کا سامنا ڈاکٹر وحید قریشی کو بھی کرنا پڑا لیکن ان کی مختلف علمی و ادبی حیثیات نے ان کی راہنمائی کی۔ وہ بیک وقت استاد، نقاد، محقق، مؤرخ، شاعر، ماہر ثقافت، فارسی و عربی زبانوں کے سکالر، ماہر تعلیم اور علم و

ادب کے متعدد شعبوں سے تعلق رکھتے ہیں۔

تحقیق کے میدان میں انہوں نے کئی اہم تصانیف پیش کی ہیں جن میں ''شبلی کی حیاتِ معاشقہ'' ''باغ و بہار۔ ایک تجزیہ''، ''میر حسن اور ان کا زمانہ''، ''مقالات تحقیق'' اور ''کلاسیکی ادب کا تحقیقی جائزہ'' شامل ہیں۔

ڈاکٹر وحید قریشی نے غالب شناسی کی ایک نئی روایت قائم کی ہے۔ اس روایت میں انفرادیت بھی ہے اور ندرت بھی۔ ڈاکٹر صاحب کے متعدد مقالات اور ان کی ایک مستقل تصنیف ''نذرِ غالب'' میں مرزا غالب کو ایک انوکھے زاویے سے ہمارے سامنے پیش کرتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب تنقید اور تحقیق کو جدا خیال نہیں کرتے اور یہی رویہ ان کی تنقید میں تحقیقی عظمت پیدا کرتا ہے۔

انہوں نے حیاتِ غالب کو نفسیاتی زاویے سے پرکھا۔ اور کلامِ غالب کے سیاسی اور سماجی پسِ منظر کو نئے رخ سے سمجھایا۔ جس میں اس بات پر زور دیا گیا کہ غالب کی ذہنی زندگی اور حقیقی زندگی میں بہت فاصلہ اور بُعد پایا جاتا ہے۔ انہی فاصلوں کے باعث غالب اپنے عصری معاملات اور واقعات سے خوفزدہ رہے۔ اس خوف کا عکس ان کی انانیت، تشکیک اور استفہامیہ انداز میں ظاہر ہوتا ہے۔ یقیناً یہ فکرِ غالب کی نئی اور انوکھی تعبیر کا نقطۂ آغاز ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے اسی منفرد انداز کو برقرار رکھتے ہوئے غالب کی شخصیت اور فن کا تجزیہ حقیقت پسندی کے ساتھ کیا۔ انہوں نے 'دیوانِ غالب' کے مختلف نسخوں کو سامنے رکھتے ہوئے تدوینی اغلاط کی نشاندہی بھی کی ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی کی دعوت پر ۱۹۹۱ء میں غالب بین الاقوامی سیمینار میں بھی شریک ہوئے۔ جہاں ڈاکٹر صاحب نے ''خوفزدہ غالب اور عصری صورتحال'' کے عنوان سے مقالہ پڑھا۔

ڈاکٹر صاحب نے غالب سے زیادہ کلامِ غالب کا جائزہ لیا ہے اور ان اسباب و عوامل کا کھوج لگانے کی کوشش کی ہے جو غالب کے کلام میں شاعرانہ عمل بن کر نمودار ہوئے۔ غمِ روزگار کے ساتھ ساتھ اپنی شخصیت کی پرستش جو ڈاکٹر وحید قریشی کے خیال میں نرگسیت بن کر کلامِ غالب میں نمودار ہوتی ہے دراصل اس محرومی کا نتیجہ ہے جو غالب کے قلب و ذہن کو اپنی گرفت میں لیے ہوئے تھی۔ وہ جس قدردانی کے مستحق تھے ان کے دور میں نہ ہو سکی۔

میں نے اپنے مقالے میں ڈاکٹر وحید قریشی کی غالب شناسی کے ان پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے جنہیں انہوں نے اپنی تحقیق کے طریقۂ کار کی بنیاد بنایا مثلاً دیوانِ غالب کے مختلف نسخوں کو سامنے رکھتے ہوئے درست ترین نسخے کا انتخاب اور ان سنِ اشاعت کا تعین وغیرہ۔ ڈاکٹر صاحب نے نقاد کے ساتھ ساتھ محقق بن کر غالب کے ان اشعار کا نیا تاریخی پس منظر بتایا جن کو آج تک محققین اور نقاد جنگِ آزادی کے پسِ منظر میں کہا جانے والا کلام سمجھتے رہے۔

ڈاکٹر وحید قریشی کی تنقید کو ان کا نفسیاتی نقطۂ نظر اور محققانہ شعور وسعت بخشتا ہے۔ ان کے اندر کا نقاد محض ایک زاویے سے کسی ادیب کے فکر وفن کا تجزیہ نہیں کرتا۔ بلکہ ان کی نگاہ موضوع کے ہر پہلو کی طرف جاتی ہے۔

ڈاکٹر وحید قریشی کے ہاں تاریخ اور نفسیات تنقید کی بنیادوں کو استحکام بخشتے ہیں۔ ان کا فلسفیانہ انداز ان کی تحقیق کو متوازن رخ عطا کر کے ایک منفرد ادب پارہ بنا دیتا ہے۔ اسی سے ان کی تحریر میں اثر انگیزی کی وہ کیفیت پیدا ہوگئی ہے جسے خونِ جگر کا نام دیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

ڈاکٹر وحید قریشی نے اپنی تحقیق کی بنیاد اس اصول پر رکھی کہ داخلی اور خارجی دونوں شہادتوں کو سامنے رکھ کر مسلمہ حقائق کے ساتھ نتائج فکر کو پیش کیا جائے۔

اس مقالے میں ڈاکٹر وحید قریشی کو ایک محقق کے طور پر الگ جب کہ ایک نقاد کی حیثیت سے الگ دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اگرچہ انہوں نے ان دونوں شعبوں کے مابین فرق و امتیاز روا نہیں رکھا۔

ڈاکٹر وحید قریشی کو ایک نفسیاتی نقاد بھی کہا گیا لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ نفسیات، ان کے اندازِ تنقید کا محض ایک پہلو ہے۔ وہ حقائق کو سماجی، تہذیبی، تاریخی، معاشی تمام پہلوؤں سے دیکھتے ہیں

اس طرح جب ان کے نظام تنقید میں تاریخ، تحقیق، نفسیات، عمرانیات اور تنقید یکجا ہو جاتے ہیں۔ تو ان کی تنقید بذاتِ خود ایک فن پارہ بن جاتی ہے۔ ان کی زبان دانی میں بھی تنوع پایا جاتا ہے۔ فارسی، اُردو، انگریزی اور پنجابی زبانوں میں لکھنے والے محقق اور نقاد کی نظر میں بے شمار موضوعات سما گئے ہیں۔ تعلیم، تحریک پاکستان، اُردو ادب کا ارتقاٗ، فارسی ادب کے مختلف گوشے، شاعری اور تحقیق یہ سب موضوعات

ڈاکٹر وحید قریشی کی تحقیق اور تنقید کے محور ہیں۔ انہوں نے اُردو تحقیق و تنقید میں جرأت پسندی کی بنیاد رکھی۔ وہ اکثر شعراً کے کلام کا جائزہ ان کے ذاتی حالات اور مٹتی ہوئی تہذیب کے تناظر میں لیتے ہیں۔

ڈاکٹر وحید قریشی تاثراتی تنقید کے علمبردار بھی ہیں۔ مثال کے طور پر کلام اقبال کے تجزیے میں جذباتی سطح پر اظہار، تشبیہات، استعارات، علامتیں، نئی تلمیحات، اور زبان و بیاں کے نئے نئے انداز ان سب کا تاثرات کی روشنی میں جائزہ لیتے ہیں۔ اسی طرح حالی کے اندازِ فکر و نظر کو متعین کرنے میں جن سیاسی و سماجی اور نفسیاتی عوامل نے حصہ لیا ان کا ذکر ڈاکٹر صاحب اپنے تنقیدی مباحث میں ضرور کرتے ہیں۔ ڈاکٹر وحید قریشی معانی اور الفاظ کو الگ الگ کرنے کے قائل نہیں۔ انہوں نے نئے تنقیدی مباحث کی بنیاد رکھی۔ مثلاً غالب کا عصری صورتحال سے خوفزدہ ہونا، شبلی کا اپنی ذات سے فرار حاصل کرنے کے لیے نئے نئے نصب العین متعین کرنا، حالی کی اخلاق پسندی کو ان کی نفسیاتی الجھن قرار دینا۔ کلامِ میر حسن کو ان کے عہد کی نا تمام خواہشات کا ردِعمل قرار دینا وغیرہ۔ انہوں نے اپنے تنقیدی مضامین میں بھی اس اندازِ نظر کا ثبوت دیا ہے۔ انہوں نے تحقیق کے دوران واقعات کی صحت، چھان بین، اور ترتیب تدوین کے تقاضوں کو بڑی عرق ریزی سے نبھایا ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے اقبالیات کے موضوع پر بیش بہا کام کیا ان کی تصنیف اسیاسیاتِ اقبال قومی صدارتی ایوارڈ یافتہ کتاب ہے جو تحقیق و تنقید کا نقطۂ اتصال ہے۔ اِس میں اقبال کے فکر و فن پر مختلف تنقیدی اور تحقیقی مقالات شامل ہیں۔

ڈاکٹر وحید قریشی نے اُردو تحقیق، تنقید اور تدریس کے ساتھ ساتھ گزشتہ برسوں میں قومی نوعیت کے مسائل پر بھی بھرپور توجہ دی ہے۔ انہوں نے متعدد ایسے مقالات لکھے ہیں جن میں ہمارے قومی مسائل نظریاتی بنیادوں، تاریخی عوامل اور سیاسی عناصر کا گہرائی سے جائزہ لیا گیا ہے۔ انہوں نے اپنی تصانیف میں اقبال اور قائد اعظم جیسے اکابر رہنماؤں کے سیاسی نظریات اور قومیت کے تصورات کو بنیاد بنا کر ہمارے ملی احیاء کا روشن باب رقم کر دیا ہے۔ انہوں نے علامہ اقبال کے سیاسی افکار اور پاکستان کے اساسی اور ترکیبی عناصر پر روشنی ڈالی ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے نظریۂ پاکستان کے خلاف ہونے والے پروپیگنڈے کا جواب مدلل انداز سے دیا ہے۔ جس سے مخالفین کی ساری قوت دم توڑ جاتی ہے۔ تحریکِ پاکستان کے حوالے سے ان کی کتابیں پاکستان کی نظریاتی بنیادوں کو اُجاگر کرتی ہیں۔ تحریکِ پاکستان اور قائداعظم کے سفر کی داستان

سناتی ہیں۔ پاکستان کی نظریاتی بنیادوں کا جائزہ لیتے ہوئے وہ پاکستان کی قومی زبان اور رَسم الخط کو نہایت اہم عنصر کے طور پر پیش کرتے ہیں۔

اِس کے علاوہ ان کے خیال میں ہمارا فکر وعمل، طرزِ تعلیم، مذہب ایسے عوامل وعناصر ہیں جن کی بدولت پاکستان قومیت کی تشکیل تو ممکن ہے۔

ڈاکٹر وحید قریشی کا تصورفن مختلف کتابوں کے لکھے ہوئے پیش لفظ سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔ جہاں وہ مختلف اصناف سخن پر طبع آزمائی کرتے رہے۔ وہاں وہ نہایت اعلیٰ درجے کے شاعر بھی ہیں۔ مخطوطہ شناسی یا تاریخ نگاری کا میدان ہو یا کالم نگاری اور مزاح نویسی کی راہیں ہوں۔ تدوینِ کتب ہو یا ابلاغیات کا شعبہ ڈاکٹر صاحب کی فکری چابکدستی یکساں طور سے نئے اسالیب کا اظہار کرتی نظر آتی ہے۔ شاعری میں 'نقدِ جاں'، 'الواح' اور ڈھلتی عمر کے نوحے، ان کے شعری مجموعے ہیں۔ انہوں نے انتہائی بلاغت سے ظلمتِ شب کے چہرے سے نقاب اٹھائی ہے۔ ان کے غم میں تخلیقی قوت ہے۔ عصر حاضر سے گہری وابستگی ان کے ملی شعور کی غماز ہے۔ انہوں نے عصرِ حاضر کے تمام المیوں کو استعارے دے کر عظیم بنا دیا ہے۔ انہوں نے حالی واقبال اور فیض کی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے سیاسی موضوعات کو غزل کے کینوس پر منتقل کیا ہے۔ تہذیبی انحطاط کا ذکر ان کے کلام کا خاص موضوع ہے۔

میں نے اس مقالے میں ڈاکٹر وحید قریشی کی علمی وتحقیقی زندگی کے ان تمام پہلوؤں کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے جو اہم اور دلچسپ ہیں اور انہیں مختلف ابواب میں تقسیم کر دیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی زندگی کے ابتدائی واقعات، تعلیم وتربیت اور ماحول نے ان کی نفسیات پر کیا اثرات مرتب کیے اور ان کے علمی ماحول نے انہیں کس طرح اُردو ادب کے حوالے سے بڑے بڑے اداروں کی سربراہی کے لئے ذمہ دار اور فرض شناس افسر بنایا یہ کہانی ربع صدی کے مطالعے کی رہینِ منت ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے بطور مدرس، بطور اتالیق، بطور محقق، شاعر، نقاد اور مؤرخ اُردو ادب کو کیا دیا ہے۔ ان امور کا تذکرہ میرے مقالے کے مختلف ابواب میں موجود ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی شخصیت دبستانِ لاہور کی نمائندہ تو ہے ہی لیکن اس کے ساتھ ساتھ اپنے انفرادی خصائص کے سبب اس دبستان کی روایات کے ارتقاء کی علامت بھی ہے۔ میں نے اپنے مقالے میں حافظ محمود شیرانی، ڈاکٹر مولوی محمد شفیع اور ڈاکٹر سید عبداللہ جیسے اساتذہ کا تذکرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر وحید قریشی

کی محققانہ انفرادیت کو پیش کیا ہے اور ان کی تخلیقات کی نئی جہتوں کو بھی سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔

ڈاکٹر وحید قریشی اس روایت کے سرخیل ہیں جس کی بنیاد بزرگ اساتذہ نے رکھی۔ انہوں نے ان عظیم اساتذہ سے تحقیق کے رموز، تذکروں کے عمیق مطالعے اور تاریخی ذوق کا ورثہ حاصل کیا۔ فارسی زبان و ادب اور شعر کے ذوق کی بدولت ڈاکٹر صاحب نے ہندوستان میں فارسی ادب کی روایت پر تحقیقی کام کا عظیم منصوبہ مکمل کیا۔ ڈاکٹر وحید قریشی کی تحقیق و تنقید کا مطالعہ کرتے ہوئے میں اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ تجزیہ و تحلیل کے سلسلے میں ان کے ذہن میں کوئی ابہام نہیں۔

میں نے اس مقالے میں ڈاکٹر صاحب کی زبان دانی کے اصولوں کو بھی موضوعِ بحث بنایا ہے۔ مثال کے طور پر ڈاکٹر وحید قریشی نے میر حسن کی مثنوی سحر البیان کے بارے میں تنقیدی رائے دیتے ہوئے زبان دانی کے اصولوں کو سامنے رکھا ہے اور ان کی تذکیر و تانیث پر بحث کی ہے۔ بعد ازاں تذکیر و تانیث کے عہد بہ عہد ارتقاء کو بھی بیان کر دیا ہے۔

ڈاکٹر وحید قریشی نے میر حسن کی سحر البیان کے علاوہ ان کے تمام کلام کا جائزہ تین حیثیت سے لیا ہے۔

۱۔ مطبوعہ کلام کی تعداد

۲۔ قلمی نسخوں کا جائزہ

۳۔ کلام کی سنہ وار تعین و ترتیب

ڈاکٹر وحید قریشی کی تنقید اور تحقیق کسی خاص خانے تک محدود نہیں بلکہ وہ کسی بھی عہد اور ماحول کا تاریخی و سماجی مطالعہ کرنے کے بعد نفسیاتی تجزیہ بھی کرتے ہیں۔ وہ کسی ادیب کے ہاں رنگوں، تاریکی اور روشنی کے تاثر کی وضاحت پیش کرتے ہیں اور وہ خود بھی ان حسیات کا ادراک رکھتے ہیں۔

ان کی تحقیق میں شبے اور انکار کی طرز کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ وہ حقائق کو من و عن قبول نہیں کرتے بلکہ سماجی، عصری صورتحال اور شہادتوں کی مدد حاصل کر کے سچائی کو منصۂ شہود پر لاتے ہیں۔ مثال کے طور پر میر حسن کے لکھنؤ میں قیام اور سالار جنگ کے متوسلین میں شامل ہونے کو دیباچہ افسوس اور گلزار ابراہیم کی مدد سے ثابت کرتے ہیں۔ ورنہ عام شہادتیں مذکورہ بالا حقائق کی تصدیق نہیں کرتیں۔

ڈاکٹر وحید قریشی نے کس طرح ''سحر البیان کا ایک نادر قلمی'' نسخہ دریافت کیا اور کن کن مراحل سے گزرے۔ یہ احوال آنے والے محققین کے لئے روشنی و راہنمائی کا وسیلہ بن سکتا ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے اپنے مقالات میں مشرقی علوم و لسانیات کو دوبارہ زندہ کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے اور واقعات کو زمانی ترتیب سے پیش کیا ہے انہوں نے بنیادی اور ثانوی دونوں ماخذوں سے استفادہ کیا ہے۔ لیکن ان کا طریقِ تحقیق پائیدار بنیادوں پر استوار ہے۔ ان کے پیشِ نظر قلمی نسخے اور مخطوطات رہے ہیں۔

ڈاکٹر وحید قریشی کی محققانہ بصیرت بحثیت ایک سیاسی تجزیہ نگار بھی ان کی مدد کرتی ہے اور وہ مسلمانوں کے ملی تشخص اور نظریہ قومیت کو اپنی ان تصنیفات میں واضح کرتے ہیں۔ مغربی اقوام کی سازشیں اور مسلمانوں اقوام کی کمزوریوں کو بیان کرتے ہوئے ان کا نقطۂ نظر بے حد ہمدردانہ نظر آتا ہے۔

اس مقالے کے ایک باب ''ڈاکٹر وحید قریشی اور نظریہ پاکستان'' میں ڈاکٹر صاحب کے ان نظریات کو مفصل انداز سے پیش کیا گیا ہے جو ان کی تصنیفات میں بار بار آئے ہیں۔ انہوں نے ان ثقافتی خطوط کا ذکر کیا ہے جن پر گامزن ہوکر ہم ایک باوقار پاکستانی بن سکیں اور بین الاقوامی طور پر اپنے تشخص کو اجاگر کرسکیں۔ ان کے خیال میں مذہب کے علاوہ اپنی روایات اور ثقافت کے جن بنیادی عناصر کے لئے تشکیلِ پاکستان کا مطالبہ کیا گیا وہ اسلام، اُردو زبان، ارکانِ مذہب، اسلامی نظریۂ حیات، اسلامی نظامِ تعلیم، اسلامی قانون اور آزادیٔ رائے سب شامل ہیں۔ ہمیں یہ حقیقت تسلیم کر لینی چاہیے کہ ہر طبقہ کو اپنی مخصوص ثقافتی روایات کے مطابق آزادانہ نشوونما کا حق حاصل ہے نئی لسانی تشکیلات اور پاکستانی قومیت میں رشتہ استوار کرنے کے لئے اُردو زبان کو رائج کرنے پر زور دیتے ہیں کیونکہ یہ دلوں اور ذہنوں میں رابطے کا وسیلہ ہے۔

اُردو زبان اپنے اندر عربی و فارسی کی مہک سموئے ہوئے ہے اور ان زبانوں کی روایات کو ساتھ لیے چل رہی ہے۔ اس کے ذریعے صوبے باہمی اشتراک اور ہم آہنگی پاسکتے ہیں۔ اُس کے ساتھ ساتھ انہوں نے ہمارے نظامِ تعلیم کو بھی موضوع بحث بنایا ہے۔ پاکستان ایک نظریاتی ریاست ہے۔ یہاں ایک ایسا نظامِ تعلیم رائج کرنے کی ضرورت ہے جو ہماری روایات واقدار اور مذہب و ثقافت کی قدروں سے ہم آہنگ ہو۔

ڈاکٹر وحید قریشی خود ایک ماہر تعلیم ہیں اور پاکستانی قومیت کے مسئلے میں تعلیم کے مسائل کو سلجھانا بے حد ضروری سمجھتے ہیں ان کے خیال میں مغرب سے درآمد کردہ نظامِ تعلیم ہمارے ملک کی روایات اور اس

کے مخصوص حالات کے منافی ہے۔ ہمارے لیے وہ نظام بہتر ہے جو ہمارے مسائل حل کر سکے۔

ڈاکٹر صاحب تعلیمی جائزے میں پاکستانی قومیت کی نئی تشکیل میں تعلیم اور نصاب کو خاص اہمیت دیتے ہیں۔ مشرقی علوم کے نئے نصاب کی ضرورت ہر درجے پر ہے ایف اے اور بی اے کے نصاب میں مواد پر زیادہ زور ہونا چاہیے۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے اپنے مقالات میں جو سوالات اٹھائے ان کا تجزیہ اس مقالے میں موجود ہے۔ ان سوالات کا تعلق نہ صرف ہماری تہذیبی، ثقافتی اور مذہبی زندگی سے ہے بلکہ مستقبل قریب میں پیش آنے والے ذہنی، اخلاقی اور اجتماعی بحرانوں سے بھی ہے مثلاً علوم کی درجہ بندی کیسے کی جائے۔ دینی علوم کو دیگر علوم کے مقابلے میں کیا اہمیت دی جائے۔ ذریعہ تعلیم کون سی زبان ہو۔ ان کے خیال میں حصول پاکستان کے بعد تعمیر پاکستان کی ضرورت تھی جبکہ ہم نازک اور بنیادی سوالوں میں الجھے رہے اور جواب حاصل کر نہ پائے۔ اس سطح پر ڈاکٹر وحید قریشی نے کئی بنیادی مسائل اٹھائے ہیں مثلاً پاکستان کی قومیت کی تشکیل کن خطوط پر ہو؟ پاکستانی قومیت کے عناصر ترکیبی کیا ہیں؟ ہمارا نظامِ فکر کس طرح دوسرے ممالک اور ریاستوں سے مختلف ہے۔ ہماری روحانی اور مادی قدریں کون سی حدود کی حامل ہیں۔ ان سوالوں کے جواب کے لئے ڈاکٹر وحید قریشی نے تحریکِ پاکستان کا مطالعہ بڑی گہرائی سے کیا۔ ہے ان کی تحریروں میں علمیت، تاریخی شعور، پاکستان کی ملی اور اخلاقی قدروں کا گہرا تجزیہ موجود ہے۔ ان کی تحریر میں ایک مؤرخ کا سپاٹ انداز موجود نہیں بلکہ ادبی شان یہاں بھی برقرار رہتی ہے۔

تاریخی حقائق کے بیان کے لئے ڈاکٹر وحید قریشی کا قلم ایک ادیب کا قلم بن جاتا ہے جو ادبی شان سے حقائق کی بازیافت اور ان کے ہر بیان کا فریضہ ادا کرتا چلا جاتا ہے۔ انہوں نے وطنِ عزیز کی نظریاتی بنیادوں کا تجزیہ بڑے حقیقی انداز میں کیا ہے۔انہوں نے اقبال اور قائد کے فکری دھاروں کے تاریخی سفر کا برملا اظہار کیا ہے۔

ڈاکٹر وحید قریشی نے اپنے احساسات کو شاعری کے پیرائے میں بھی بیان کیا ان کے شاعرانہ مجموعے ان کے قلب و روح پر گزری وارداتوں کے منظوم بیان ہیں۔ وہ اپنی ذات میں گم ہو کر شعر کہتے ہیں ان کا اندازِ بیاں سادہ مگر رواں ہے۔

انہوں نے اپنے فن کی بدولت داخلی تجربات کو بیرونی دنیا کی واردات بنا دیا ہے۔ وہ فن برائے

زندگی کے قائل ہیں۔ ان کا اندازِ فکر ترقی پسند شعرا کے قریب تر ہے۔ وہ ایک ایسے معاشرے کی تشکیل چاہتے ہیں جہاں فرد اور قوم کو بے اطمینانی نہ ہو سب کو اپنے حقوق حاصل ہوں۔ وہ فن کو زندگی کا تابع سمجھتے ہیں۔ وہ معاشرتی ناہمواریوں اور طبقاتی امتیازات کو برداشت نہیں کر پاتے۔ انہوں نے عصری صورتحال کے سیاسی، سماجی پہلوؤں کو اپنی نظموں کا عنوان بنایا ہے۔

وہ علامہ اقبال کو اپنا فکری راہبر بناتے ہیں۔ انہوں نے اپنی نظموں میں بے شمار کامیاب تجربات کئے۔ ان موضوعات میں وطن سے محبت، تصنع سے بیزاری، فطرت سے گہرا لگاؤ اور انصاف کی قدروں سے فطری انسیت پائی جاتی ہے۔

ڈاکٹر وحید قریشی نے اپنی تنقیدوں میں جن اصولوں کو برتا وہی ان کا تصورِ فن بن کر انکی اپنی تصنیفات میں ظاہر ہوتے ہیں مثلاً اگر وہ تنوع اور بلند پرداری کی خصوصیات کے قائل ہیں تو یہ اوصاف ان کے اپنے کلام میں بھی ملیں گے ان کی تنقید اور تحقیق میں وہ عناصر نمایاں ہیں جو وہ دیگر لکھنے والوں میں دیکھنا چاہتے ہیں۔

اِس مقالے میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ ڈاکٹر وحید قریشی کے فکر وفن کی وسعت کو سمیٹا اوران کے کام کی ہر جہت کو نمایاں کیا جاسکے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ مقالہ آنے والی نسلوں میں تحقیق کے شوق کو ابھارنے کے لئے مہمیز کا کام دے گا۔ علاوہ ازیں ڈاکٹر وحید قریشی کی تحقیق وتالیف اور فکر وکلام کے مختلف گوشوں کو اجاگر کرے گا۔

☆☆☆

ڈاکٹر وحید قریشی کے ساتھ ایک نشست

ڈاکٹر وحید قریشی کا انٹرویو درحقیقت عصری اَدب کی تاریخ اور تنقید ہوتا ہے۔ میں نے ۱۰ اگست ۲۰۰۶ء کو ڈاکٹر صاحب کے ساتھ نشست کے لئے وقت لیا۔ ڈاکٹر صاحب نے کمال شفقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے مجھے نہ صرف انٹرویو کے لئے وقت دیا بلکہ اپنے کتب خانے سے مستفید ہونے کی اجازت بھی مرحمت فرمائی جو کہ میرے لئے بے حد خوشی اور خوش قسمتی کی بات ہے۔ مجھے ڈاکٹر صاحب جیسی بلند شخصیت کے حالات و خیالات جاننے کا موقعہ ملا۔ ان کی شخصیت کے کئی دِلچسپ اور ادبی پہلوؤں کو میں ان سے ملاقات کے بعد ہی جان سکتی تھی۔ ڈاکٹر صاحب سے جو گفتگو ہوئی وہ کچھ اس طرح ہے:

ڈاکٹر وحید قریشی سے انٹرویو لیتے ہوئے ایک تصویر

س: آپ کا نظریۂ اَدب کیا ہے؟

ج: فنکار کا تجربہ خارجی زندگی سے بھی تعلق رکھتا ہے اور داخلی عمل سے بھی۔ داخلی عمل میں قوت متخیلہ کا جو حصہ ہے وہ نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ فرد ایک مرکب معاشرے کا حصہ ہے جس پر مختلف عوامل اثرانداز ہوتے رہتے ہیں۔ اِس کی ذہنی زندگی میں ماضی، حال اور مستقبل سب کی اہمیت ہے۔

ڈاکٹر وحید قریشی سے انٹرویو لیتے ہوئے دوسری تصویر

س: آپ نے کب لکھنا شروع کیا؟

ج: میری سب سے پہلی نظم ۱۹۴۳ء چھپی۔ اِس سے کچھ عرصہ پیشتر میں نے لکھنا شروع کر دیا تھا۔ پنجابی کی کچھ نظمیں گورنمنٹ کالج کے مجلّہ ''راوی'' میں چھپ گئی تھیں۔

س: تنقید میں آپ کس سے متاثر ہوئے؟

ج: آئی۔ اے رچرڈز کا مطالعہ کرتا رہا۔ ونسن ٹائٹ اور مس ماؤلوڈین کو بھی پڑھا۔ ایک زمانے میں اُردو

کے رومانی نقاد فراق، نیاز فتح پوری میرے پسندیدہ نقاد تھے۔ کلیم الدین احمد کا انداز بڑا متاثر کن لگتا تھا لیکن بعد ازاں مطالعے نے یہ ثابت کیا کہ کلیم الدین احمد Theory of Criticism کو سمجھتے تو ہیں لیکن عملی طور پر نہیں برت پاتے۔ میں تنقید میں عابد علی عابد سے متاثر ہوا۔ فارسی میں غلام مصطفیٰ تبسم سے، تحقیق میں پروفیسر اقبال اور ڈاکٹر سیّد عبداللہ، پروفیسر شوستری سے میں اس طرح متاثر ہوا کہ پہلوی زبان جانتے تھے۔ جاپانی زبان جانتے تھے۔ پہلوی کا شوق مجھے بھی ہوا۔ چھ ماہ میں میں نے سبقاً پہلوی سیکھی۔ جرمن اور فرانسیسی زبانیں بھی سیکھیں۔ میں مغربی تنقید کے موجودہ انداز اور استعمال کو غلط سمجھتا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ مغرب میں تنقید مشرق کے مقابلے میں کہیں آگے نکل چکی ہے۔ ہمیں مغربی تنقید کے ان اصولوں کو اپنا لینا چاہیے، جو ہمارے ملکی تقاضوں سے ہم آہنگ ہوں۔ میں نے مغربی نقادوں کے تنقیدی اصولوں کو اپنے ماحول کے ذریعہ پہچانا اور برتا ہے میں تنقید میں جدید نفسیات سے بھی کام لیتا ہوں۔ فن پارے کو Case History کے طور پر نہیں بلکہ فنکار کے ذہنی سفر کو سمجھنے کے لئے کام میں لاتا ہوں History اور Sociology کے حوالے سے بھی ادب کو پرکھتا ہوں۔

س: آپ تحقیق جیسے غیر معمولی اور محنت طلب موضوع کی طرف کیسے آئے اور یہ بھی بتایئے کہ تحقیق میں آپ کا مسلک اور طریقہ کار کیا ہے؟

ج: میرا پی ایچ ڈی کی طرف آنا ہی مجھے تحقیق کی طرف لے آیا۔ تاریخ اور فارسی ادب نے تحقیق کے میدان میں میری بہت مدد کی۔ میں نے 1948ء میں تحقیق کا آغاز کیا اور اب میری پہچان بطور محقق زیادہ ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ تحقیق بھی ایک تخلیقی عمل ہے۔ پاکستان میں جہاں تک تحقیق کا تعلق ہے، یہاں Research کمزور ہے۔ Universities میں تحقیق کا جو کام ہو رہا ہے اس سے میں مطمئن نہیں۔ موضوع کے بارے میں لوگ بنیادی باتیں نہیں جانتے، حوالہ جات کے بارے میں علم نہیں رکھتے، بنیادی ماخذ اور ثانوی ماخذ کی ترتیب کا خیال نہیں رکھا جاتا۔ Quotations سے نتیجہ نکلنا چاہیے۔ ورنہ بے کار ہے، دلیل اور نتیجہ آپس میں منطقی ربط کے مائل ہونا چاہیے۔ اقبال پر سب سے اچھا مقالہ عشرت

حسن انور کا The Metaphysics of Iqbal ہے جہاں تک میرے طریق تحقیق کا تعلق ہے، میں ہمیشہ بنیادی ماخذوں سے استفادہ کرنے کو ترجیح دیتا رہا ہوں۔ میں نے ہمیشہ تاریخوں سے بھی تحقیق اور ریسرچ کا راستہ اپنایا ہے۔ میں نے تحقیق کی کتابوں میں شروع میں ہی بتا دیا ہے کہ Oriental College میں شیرانی صاحب اور شیرانی صاحب سے اور ان کے مسلک سے تعلق پیدا ہوا۔ شیرانی صاحب فارسی کے آدمی تھے کام اُردو میں کیا۔ ڈاکٹر سیّد عبداللہ بھی عربی و فارسی سکالر تھے لیکن ہیڈ اُردو کے رہے۔ ان بزرگوں کی علمیت اور لسانیات نے اُردو کی تحقیق وتنقید کو بہت فائدہ پہنچایا۔ شیرانی صاحب کا طریق کار یہ تھا کہ دوسروں کے کمزور پہلوؤں کا بڑی سختی سے محاکمہ کرتے۔ ان کا Message یہ تھا کہ مصنف کی کتابوں سے Material باہر نکال لیا جائے۔ مثال کے طور پر معین الدین چشتی کے کلام کے بارے میں ثابت کیا کہ داخلی شہادتیں گواہ ہیں کہ یہ اس دور کا کلام نہیں بلکہ یہ ہرات کے معین الدین عربی کے کلام کا حصہ ہے اسی طرح کی کئی مثالیں ان کے طریق تحقیق کی عکاس ہیں۔

س: آپ کا نظامِ تحقیق کن اصولوں پر استوار ہے؟

ج: تحقیق میں میرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ محقق نامعلوم کی طرف سفر کرتا ہے۔ مثال کے طور پر میں نے اندرونی حوالوں اور داخلی قرینوں سے میر حسن کے لکھنؤ کے سفر کا احوال پیش کیا۔ Later Mughal Period میں بھی میں نے تاریخی حوالوں کو برت کر حقائق کو سچائی کی کسوٹی پر پرکھا۔ میرے کام میں تنقید، تحقیق اور تاریخ یکجا ہیں۔ میں نے اپنی زندگی میں بھی تحریکِ پاکستان کے تاریخی واقعات کو بچشمِ خود دیکھا۔ قرارداد پاکستان میری آنکھوں کے سامنے منظور ہوئی؟

س: اپنے انتظامی تجربات کے بارے میں اظہارِ خیال فرمایئے؟

ج: اقبال اکیڈمی میں پانچ لوگ تھے۔ میں دوبار انچارج رہا۔ اقبال اکیڈمی کو مالی طور پر مستحکم کیا۔ حکومت نے ڈوبتے ہوئے ادارے میرے سپرد کئے۔ جب پاؤں پر کھڑے ہوگئے تو واپس لے لئے۔ انتظامی امور سنبھالنے سے پہلے میں صرف Research Scholar تھا۔ اپنے کیریر

میں میں 23 کمیٹیوں کا رکن اور 13 کا چیئرمین رہا۔ Deputation پر اوقاف کے محکمے میں بھی بھیجا گیا لیکن جب میں نے سٹاک چیکنگ کرائی تو مجھے واپس بھیج دیا گیا۔ صرف ایک سال بعد۔ مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد میں اپریل 1983ء سے ستمبر 1987ء تک رہا۔ مقتدرہ کے بنیادی وظائف میں نفاذِ اُردو سرفہرست ہے۔ قومی زبانی کے استعمال کو عمل میں لانے کے لئے صدر مملکت کی خدمت میں سفارشات پیش کرنا، مقتدرہ کے فرائض میں شامل ہے۔ سرکاری و نیم سرکاری دفاتر، عدالتوں اور دوسرے اداروں میں کام کرنے والے عملے کی ملازمت کے دوارن تربیت کے لئے ڈکشنریاں اور دوسرے موادِ خواندگی کی ترتیب و تدوین کا کام بھی کیا جاتا ہے تاکہ نفاذِ اُردو کو ہر شعبۂ زندگی میں ممکن بنایا جاسکے۔ میرے دور میں مقتدرہ میں دفتری اُردو کے لئے بڑے پیمانے پر تراجم کا کام ہوا ہے۔ اس مقصد کے لئے دارلترجمہ بھی بنایا گیا۔ دفتروں میں استعمال ہونے والی انگریزی اصطلاحات پر بھی خاصا کام کیا گیا ہے ان کوششوں کے اثرات کئی سرکاری محکموں مثلاً اے جی پی آر اور مالیات کے دوسرے شعبوں میں نفاذِ اُردو کی صورت میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ وفاقی محتسب کے سیکرٹریٹ میں بھی قومی زبان میں خط و کتابت ہو چکی ہے۔

دارالترجمہ کے ساتھ ساتھ ہم نے دارالتصنیف بھی قائم کیا ہے۔ جو کشاف اصلاحات، نصابی کتب کی تدوین، کتابیات سازی، لسانی امور اور نفاذِ اردو کے ضمن میں مواد کی تیاری اور اشاعت کا کام کر رہا ہے۔

س: ڈاکٹر صاحب آپ نے نفاذِ اردو کے ساتھ ساتھ نظامِ تعلیم کی بات بھی کی۔ یہ بتایئے کہ آپ کے خیال میں ہمارے نظامِ تعلیم کی منصوبہ بندی کن خطوط پر کی جانی چاہیئے؟

ج: میرا خیال ہے کہ برطانوی دور میں تعلیم کا مقصد محض سرکاری ملازمت کا حصول بن کر رہ گیا تھا۔ جبکہ آج فنی تعلیم، پیشے اور تجارت کے کئی سیکٹر ایسے موجود ہیں جن کی طرف طالبعلموں کو رجوع کرنا چاہیئے۔ اس کے ساتھ ساتھ حکومت اعلیٰ سطح کی تعلیم میں منصوبہ بندی کرے اور یونیورسٹیوں کو بتائے کہ ہر سال خاص خاص سیکٹر میں کتنے کتنے آدمیوں کی ضرورت آسکے گی۔ تاکہ یونیورسٹیوں میں اتنے ہی طلباء کو داخلہ دیا جائے اور بے روزگاری کا مسئلہ پیدا نہ ہو۔

ویسے جمہوریت کا بنیادی تقاضہ تو یہ ہے کہ اساتذہ تعلیمی پالیسیاں وضع کریں۔ لیکن انہیں یہ حق نہیں دیا گیا۔ جبکہ سیاستدان اور جمہوریت کے نام لیوا تعلیمی پالیسیوں کا کوئی فارمولا وضع نہیں کر پائے۔ جمہوریت کے نام پر سیاسی رہنماؤں اور ارکانِ اسمبلی کو یونیورسٹیوں کے اندر لا کر بٹھا دیا جاتا ہے۔ جس سے تعلیم میں اور بھی مسائل پیدا ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر وحید قریشی سے انٹرویو لینے کے بعد آپ کی اہلیہ کے ہمراہ ایک تصویر

س: پاکستانی ادب کے نمایاں عناصر کون سے ہیں؟

ج: پاکستانی ادب کی بالخصوص شناخت یہ ہے کہ اس کا ایک اپنا نقطۂ نظر ہے۔ اردو کی انڈیا سے وابستگی اب ختم ہوئی۔ وہ ماضی کا حصہ تھا۔ اب محاورہ روزمرہ سے الگ ہو چکا ہے۔ انڈین اور پاکستانی اردو میں خاصا بُعد پایا جاتا ہے۔

س: اردو تحقیق کے حوالے سے ایک سوال ہے کہ محقق اور نگران میں کون سے اوصاف ضروری ہیں؟

ج: اُردو تحقیق کے موضوع پر اعلیٰ درجے کی کتابیں میسر نہیں۔ نگران کا جہاں تک سوال ہے اس کے اوصاف میں یہ شامل ہے کہ وہ موضوع کی گہرائی اور عمق میں جائے اور درست معلومات پر اپنے مقالے کی بنیاد رکھے۔ ثانوی ماخذات پر بھروسہ کر کے غلطیاں نہ کرتا رہے۔ اسے پہلے موضوع کی تیاری خود کرنی چاہیے۔ پھر گائیڈ کرنا چاہیے۔

س: فکر اقبال کے ضمن میں کچھ ارشاد فرمایئے؟

ج: آج فکرِ اقبال کی عملی تشریح کی ضرورت ہے۔ فارسی سے نابلد لوگ اقبالیات کے شعبوں میں موجود ہیں جن کی فکر اقبال تک رسائی ہی نہیں۔

☆☆☆

تجاویز اور سفارشات

صدی کی ہر دہائی میں بدلتے ہوئے آفاق زندگی کے ہر شعبے کی طرح ادب میں بھی تازہ مطالعات کا بابِ آگاہی کھولتے ہیں اور نامعلوم کو جاننے کی فطری خواہش ادبی محققین کو بھی مختلف اور متنوع اہداف کی جانب سرگرم سفر رکھتی ہے۔ چنانچہ ادبی رجحانات، تحریکات اور اداروں کی طرح ایسے اہلِ قلم کے انفرادی مطالعے، تحقیق کی ضرورت بنتے ہیں جو اپنے اثرات اور اختراعات سے علمی اور تحقیقی ماحول کو متاثر کرتے ہیں۔

اپنے موضوع سے متاثر ہو کر تحقیقی عمل میں ایک متوازن و معروضی نقطۂ نظر ہر آن میرا نصب العین رہا ہے جس کی بنیاد متنی مطالعے پر استوار ہے۔ اس مطالعے میں تحقیق کی مبادیات اور رہنما اصولوں کو مشعلِ راہ بنایا گیا ہے۔ اس مقالے کا مقصد ایسے رویوں کی کھوج لگانا ہے۔ جن سے مقالے میں ابلاغ اور وسعت پیدا ہو سکے۔

اس مقالے میں ڈاکٹر وحید قریشی کی غیر مدوّن تحریروں کے بارے میں معلومات فراہم کی گئی ہیں اور ان کی تحقیق، تنقید اور شاعری سے متعلق ایسے گوشوں کا حاطہ کرنے کی حتی المقدور کوشش کی گئی ہے جو عام قاری کی نظر سے تاحال اوجھل ہیں۔ مثال کے طور پر ان کی غیر مدون نظمیں، دوہے، غزلیات، نو دریافت سرمایۂ فن کا بیان اس ضمن میں خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔

زیرِ نظر مقالہ لکھنے کے دوران مجھے موضوع مقالہ کی شخصیت کو تفصیل سے جاننے اور سمجھنے کا موقعہ ملا۔ اِس سلسلے میں میری طرف سے چند تجاویز اور سفارشات پیش خدمت ہیں:۔

۱۔ ڈاکٹر صاحب کی شخصیت، احوال و آثار، خاندانی پسِ منظر پر ایک مستقل تصنیف کی ضرورت ہے۔ جس میں ان کی علمی اور فکری جدوجہد کو اجاگر کیا جائے اور آنے والی نسلوں کے لئے ان کے کام کے عملی اور افادی پہلوؤں کو نمایاں کر کے پیش کیا جائے۔

۲۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے اپنے ذاتی کتب خانے کی ہر کتاب کو اپنی اولاد کی طرح عزیز رکھا۔ اِس کتب خانے میں نادر و نایاب کتب کا ایک قیمتی ذخیرہ موجود ہے۔ ان کا نجی کتب خانہ جن اداروں میں محفوظ کیا گیا ہے وہاں ان کی فہرست نگاری ہونی ضروری ہے تاکہ پاکستان کا نوجوان اور آئندہ نسل کا محقق اس سے فیض یاب ہو سکے۔

۳۔ ڈاکٹر صاحب کے قومی افکار ونظریات کو تحریکِ پاکستان اور تصورِ پاکستان کے تناظر میں سمجھنے اور سمجھانے کی ضرورت ہے۔ اس حوالے سے بھی ایک مستقل علمی کام کا آغاز ہونا چاہئے۔

۴۔ ڈاکٹر وحید قریشی کی تعلیمی خدمات ابھی تک موضوع مطالعہ نہیں ہوئیں جبکہ ڈاکٹر صاحب کے تعلیمی نظریات نظریۂ پاکستان کی عملی تفسیر ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ڈاکٹر وحید قریشی کو بحیثیت ماہر تعلیم کے متعارف کرایا جائے۔ تجویز کیا جاتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے اس پہلو پر ایک اچھا علمی کام سامنے لایا جائے۔

۵۔ پاکستانی ثقافت اور تاریخِ پاکستان پر ڈاکٹر وحید قریشی کی کاوشوں کو نمایاں کرنے کے لئے اس موضوع پر ایم فل اور پی ایچ ڈی کی سطح کے مقالات لکھوائے جائیں۔

۶۔ قومی زبان کے فروغ کے سلسلے میں ڈاکٹر وحید قریشی کے نظریات سے قومی اور سرکاری سطح پر استفادے کی صورتیں نکالی جائیں۔

☆☆☆

کتابیات

ا۔ ڈاکٹر وحید قریشی کی تصانیف و تالیفات

ا۔ اساسیاتِ اقبال، اقبال اکادمی، لاہور، ۱۹۹۶ء۔

۲۔ اقبال اور پاکستان قومیت، مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۷۷ء۔

۳۔ الواح، قرطاس، فیصل آباد، اگست ۱۹۸۴ء۔

۴۔ اُردو ادب کا ارتقاء، ایک جائزہ، القمر بک ڈپو، لاہور، ۲۰۰۶ء۔

۵۔ اُردو بحیثیت قومی زبان (پمفلٹ) مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۷ء۔

۶۔ اُردو نثر کے میلانات، مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۸۶ء۔

۷۔ باغ و بہار ایک تجزیہ، لاہور سنگِ میل پبلی کیشنز، طبع اول، ۱۹۶۸ء۔

۸۔ پاکستان کی نظریاتی بنیادیں، ایجوکیشنل ایمپوزیم، لاہور، ۱۹۷۳ء۔

۹۔ پاکستانی قومیت کی تشکیلِ نو اور دوسرے مضامین، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۴ء۔

۱۰۔ تحریکِ پاکستان کے ثقافتی عوامل، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۷ء۔

۱۱۔ تنقیدی مطالعے، مجموعہ مقالات، لاہور، مکتبہ کارواں، ۱۹۶۷ء۔

۱۲۔ جدیدیت کی تلاش میں، مقبول اکیڈمی، لاہور، ۱۹۹۳ء۔

۱۳۔ ڈھلتی عمر کے نوحے، زیرِ طبع۔

۱۴۔ شبلی کی حیاتِ معاشقہ، مکتبہ جدید، طبع اول ۱۹۵۰ء، لاہور، ٹی اینڈ ٹی پبلشرز، طبع دوم (۲۰۰۲ء)۔

۱۵۔ قائداعظم اور تحریک پاکستان، مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۷۷ء۔

۱۶۔ قرآنِ حکیم کی روشنی میں تعلیم (پمفلٹ) آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، لاہور، ۱۹۷۵ء۔

۱۷۔ قومی زبان اور ہمارا قومی تشخص، (پمفلٹ ۳۰) مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۶ء۔

۱۸۔ مثنوی سحر البیان، رسالہ اُردو، کراچی، اکتوبر ۱۹۵۱ء۔

۱۹۔ مطالعہ ادبیات فارسی، لاہور یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور، ۱۹۹۶ء۔

۲۰۔ مطالعہ حالی، (مجموعہ مقالات)، اُردو بک سٹال، لاہور، طبع اول ۱۹۶۱ء، لاہور، دارلادب (طبع دوم بہ ترمیم و اضافہ) ۱۹۶۶ء۔

۲۱۔ مقالاتِ تحقیق، مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی لاہور، ۱۹۸۸ء۔

۲۲۔ میر حسن اور ان کا زمانہ (مقالہ برائے ڈی لٹ اُردو) لاہور اردو بک سٹال، ۱۹۵۸ء۔

۲۳۔ نذر غالب سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۷۰ء۔

۲۴۔ نقدِ جاں، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۶۸ء، لاہور۔

۲۵۔ ہمارا نظامِ تعلیم اور قومی زبان، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۷ء۔

۲۔ دیگر کتب

۲۶۔ ابو اللیث صدیقی، ڈاکٹر، لکھنؤ کا دبستانِ شاعری، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ۱۹۴۵ء۔

۲۷۔ اورینٹل کالج میگزین، مذہب غالب، مقالہ سیّد اولاد حسین شاداں بلگرامی۔ جلد ۸، مئی ۱۹۳۲ء۔

۲۸۔ ایم سلطانہ بخش، ڈاکٹر، (مرتب)، اُردو میں اصولِ تحقیق، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۶ء۔

۲۹۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، اُردو ادب کی تاریخ، سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۰۳ء۔

۳۰۔ تحسین فراقی، ارمغانِ علمی۔ ''بپاسِ خدماتِ علمی و ادبی ڈاکٹر وحید قریشی'' القمر انٹر پرائزز، اُردو بازار لاہور، ۱۹۹۸ء۔

۳۱۔ تنویر احمد علوی، ڈاکٹر، اصولِ تحقیق و ترتیب و متن دہلی جمال پرنٹنگ پریس، ۱۹۷۷ء۔

۳۲۔ جاوید اقبال، جسٹس، زندہ رود، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۸۵ء۔

۳۳۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، تاریخِ ادب اُردو، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۸۷ء۔

۳۴۔ حافظ محمود شیرانی، پنجاب میں اُردو، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۹۸ء۔

۳۵۔ حسن اختر، ڈاکٹر، تاریخ ادب اُردو، ابلاغ، لاہور، ۱۹۹۶ء۔

۳۶۔ حسن اختر ملک، اقبال ایک تحقیقی مقالہ، یونیورسل بکس، ۱۹۸۸ء۔

۳۷۔ خاور جمیل، ادب کلچر اور مسائل، رائل بک کمپنی کراچی۔ ۱۹۸۶ء۔

۳۸۔ خلیفہ عبدالحکیم، ڈاکٹر، فکرِ اقبال، المعارف، گنج بخش روڈ، لاہور، ۱۹۸۸ء۔

٣٩۔ ڈار بشیر احمد (مرتب) انوارِ اقبال، اقبال اکادمی کراچی، ۱۹۶۷ء، صفحہ ۳۱۷۔

۴۰۔ ڈار، بشیر احمد Letters and Writings of Iqbal، اقبال اکادمی کراچی، ۱۹۶۷ء۔

۴۱۔ رشید حسن خان، ادبی تحقیق مسائل اور تجزیہ، علی گڑھ ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۱۹۷۸ء۔

۴۲۔ رشید حسن خان، (مرتب)، باغ و بہار، انجمنِ ترقی اُردو، دہلی، ۱۹۹۲ء۔

۴۳۔ سلام سندیلوی، ڈاکٹر، ادب کا تنقیدی مطالعہ، میری لائبریری لاہور، ۱۹۶۴ء۔

۴۴۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، اُردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، سنگِ میل پبلی کیشنز، اُردو بازار لاہور، ۱۹۷۱ء۔

۴۵۔ سیّد ابوالحسن ندوی، مولانا، نقوشِ اقبال، مجلس نشریاتِ اسلام، کراچی۔

۴۶۔ شیروانی، لطیف احمد (مرتب) حرفِ اقبال۔ ایم ثنا اللہ۔ ۱۹۵۵ء۔

۴۷۔ صدیق شبلی ڈاکٹر، اُردو تنقید، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد، ۲۰۰۰ء۔

۴۸۔ عبادت بریلوی، ڈاکٹر، اصولِ تنقید کا ارتقاء، انجمن ترقی اُردو پاکستان کراچی، بارسوم، ۱۹۷۹ء۔

۴۹۔ عبدالرزاق قریشی، مبادیاتِ تحقیق، ادبی پبلشرز، بمبئی، ۱۹۶۸ء۔

۵۰۔ عبدالمجید سالک، ذکرِ اقبال، بزم اقبال، لاہور، ۱۹۵۵ء۔

۵۱۔ علامہ اقبال، ضربِ کلیم، صفحہ ۱۵۴ (کلیاتِ اقبال، اُردو)، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور۔

۵۲۔ فرمان فتحپوری، ڈاکٹر، نیا ادب اور پرانا ادب، الوقار پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۷ء۔

۵۳۔ گوپی چند نارنگ ڈاکٹر، (مقالہ سحرالبیان) تنقیدی ادب، جلد دوم۔ مرتبہ مرزا ادیب، طبع لاہور، ۱۹۴۵ء۔

۵۴۔ گوہر نوشاہی ڈاکٹر، ڈاکٹر وحید قریشی احوال بسلسلہ معمارانِ ادب اُردو، اکادمی ادبیات اسلام آباد، ۲۰۰۶ء۔

۵۵۔ گوہر نوشاہی، ڈاکٹر، ادبی زاویے، مجلسِ ترقی فروغ تحقیق، اسلام آباد، ۱۹۹۳ء۔

۵۶۔ گوہر نوشاہی، ڈاکٹر، تحقیقی زاویے، مجلسِ فروغِ تحقیق، اسلام آباد، ۱۹۹۱ء۔

۵۷۔ گوہر نوشاہی، ڈاکٹر، لاہور کے چشتی خاندان کی اُردو خدمات، مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی لاہور، دسمبر ۱۹۹۳ء۔

۵۸۔ گیان چند، اُردو کی نثری داستانیں، انجمن ترقی اُردو پاکستان، کراچی، ۱۹۵۴ء۔

۵۹۔ گیان چند، اُردو کی نثری داستانیں، اتر پردیش اُردو اکیڈمی لکھنؤ، ۱۹۸۷ء۔

۶۰۔ مالک رام، فسانۂ غالب، مکتبۂ جامعہ دہلی، ۱۹۷۷ء۔

۶۱۔ مثنویات میر حسن، نولکشور پریس، طبع ۱۹۴۴ء۔

۶۲۔ مسعود حسن رضوی، سیّد، متفرقاتِ غالب، ہندوستانی پریس رامپور، ۱۹۷۴ء۔

۶۳۔ معینی، سید عبدالواحد (مرتب) مقالاتِ اقبال، شیخ اشرف، لاہور، ۱۹۶۳ء۔

۶۴۔ مکتوب غالب، خطوط غالب نگار پاکستان، نوادر غالب، نثار احمد فاروقی، نومبر ۱۹۶۴ء۔

۶۵۔ میاں محمد طفیل، Iqbal, Philosophy and Education، بزمِ اقبال، لاہور، ۱۹۶۶ء۔

۶۶۔ نذیر نیازی (مترجم) تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، بزمِ اقبال، لاہور۔

۶۷۔ نور الحسن ہاشمی، ڈاکٹر، دلی کا دبستانِ شاعری شرکت، پرنٹنگ پریس، لاہور، ۱۹۹۱ء۔

۶۸۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، تنقید اور جدید اُردو تنقید، انجمن ترقی اُردو کراچی پاکستان، بار اول، ۱۹۸۹ء۔

☆☆☆